سکھ مت کی تاریخ رقم کرنے والے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی اور کارنامے

رنجیت نامہ

مصنف: ٹی ایس مارٹن

مترجم: محمد مجیب

سکھ مت کی تاریخ رقم کرنے والے حکمران
مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی اور کارنامے

مصنف: ٹی ایس مارٹن

ترجمہ: محمد مجیب

گوہر پبلیکیشنز
سید پلازہ فسٹ فلور A-3، چیٹر جی روڈ، اردو بازار لاہور
فون: 042-37027720 موبائل: 0345-4327063

خیالات کی جنگ میں کتابیں ہتھیار کا کام کرتی ہیں۔
دنیا پر کتابیں ہی حکومت کرتی رہی ہیں۔

Mob: 0345-4327063
Ph : 042-37027720

ناشر:

حفیظ گوہر

نام کتاب	....	رنجیت نامہ
مصنف	....	ٹی ایس مارٹن
ترجمہ	....	محمد مجیب
سرورق	....	محمد احسن گل
کمپوزنگ	....	ہجویری کمپوزرز اینڈ ڈیزائنرز
تعداد	....	1000
قیمت	....	300 روپے

حفیظ گوہر نے بھٹو پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
گوہر پبلی کیشنز اُردو بازار لاہور سے شائع کی۔

فہرست

سکھ مت کی ابتداء

گورونانک:

سکھ مذہب کے بانی گورو نانک 15 اپریل 1429ء تلونڈی (ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ) میں ایک دکاندار کالو کھتری کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام 'ترپتا' بہن کا نام 'نانکی' دادا کا نام 'سیو رام' اور دادی کا نام 'بنپاسی' تھا۔ گورو نانک کے والد گاؤں کے پٹواری بھی تھے۔ اس لیے ان کو گاؤں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی اور سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کی مالی حالت کچھ مستحکم نہ تھی۔ بابا نانک کی پیدائش کے وقت برصغیر پاک و ہند پر بہلول لودھی حکمران تھا۔ نانک ابتدائے عمر ہی سے ہر وقت سوچ بچار میں گم رہتے تھے اور لوگ انہیں ایک اوتار خیال کرنے لگے تھے۔ سات سال کی عمر میں بابا نانک کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے استاد کی خدمت میں پیش کیا گیا لیکن یہ استاد اور اس کے بعد کئی دوسرے استاد بھی بابا نانک کی متجسس طبیعت کا ساتھ نہ دے سکے اور یوں گورو نانک مروّجہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے۔ اگرچہ گورو نانک نے مدرسے میں تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن ایک مسلمان سید حسن سے عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں اور اسلامی کتب کا مطالعہ کیا۔ سید حسن تلونڈی میں بابا نانک کے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر تھے۔

جب بابا نانک نے پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ نہ دی تو ان کے والد نے زمین کی نگرانی اور جانوروں کی دیکھ بھال ان کے سپرد کی، لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ بعد ازاں سلطانپور میں ایک دکان کھول دی۔ گورو نانک نے دکان کی تمام اشیاء ضرورت مندوں اور فقراء میں

تقسیم کر دیں۔ سکھ اس جگہ کو "ہٹ صاحب" کہتے ہیں اور ان ہٹوں کی بے حد تعظیم کرتے ہیں۔ بابا نانک بچپن ہی سے روپیہ کمانے کی بجائے ہمیشہ سچے سودے کی طرف ملتفت رہے۔ چنانچہ بابا نانک کی عمر پندرہ سال کی تھی تو انکے والد نے ان کو امورِ تجارت سے آگاہ کرنے کے لیے اپنے ساتھ تجارت میں شامل کر لیا۔ ایک دن انہوں نے بابا نانک کو کچھ روپے دے کر نمک خریدنے کسی دوسرے مقام پر بھیجا اور نوجوان تاجر کی اعانت کے لیے گھر کے خاص ملازم "بالا" کو بھی ساتھ کر دیا۔ راستے میں ایک جگہ بابا نانک کو کچھ فقیر نظر آئے جو بھوک کی شدت کی وجہ سے جاں بلب تھے۔ گورو نانک نے وہ تمام رقم، جو والد نے تجارت کے لیے دی تھی، ان کے کھانے پینے کے سامان پر صرف کر دی۔ جب ملازم نے روکا تو بابا نے اسے کہا کہ، جو تجارت میں کر رہا ہوں اس کا نفع دوسری دنیا میں ملے گا اور یہی بہتر تجارت ہے۔

گورو نانک نے امورِ دنیا سے تقریباً لاتعلقی اختیار کر لی اور ہر وقت غور و فکر میں مصروف رہتے۔ ان کے والدین نے ان کی توجہ دنیاداری کی طرف مبذول کرانے کے لیے ان کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ صرف سولہ سال کی عمر ہی میں ان کی شادی موضع "لکھوکی"، تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے مولا کھتری کی بیٹی "سلکھنی" سے کر دی گئی لیکن شادی سے بھی متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکے اور یہ شادی بابا نانک کو اس گہری سوچ سے نہ نکال سکی اور نہ ہی انہوں نے غریبوں اور فقیروں کے ساتھ مہربانیوں کا سلسلہ ترک کیا، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔

بابا نانک کی ایک بہن "نانکی" کی شادی ایک ہندو "جے رام" نامی شخص سے ہوئی۔ وہ سلطانپور میں دولت خان لودھی کا ملازم تھا۔ گورو نانک کو بھی ملازمت کی غرض سے سلطان پور بھیجا گیا جہاں جے رام کی وجہ سے گورو نانک کو سرکاری خیرات گھر کے ناظم کی نوکری مل گئی۔ اس حیثیت میں بابا نانک نے چند سال گزارے اور بڑی دیانتداری سے اپنے فرائض منصبانہ کو انجام دیا۔ جبکہ یہاں کے حاسد لوگوں نے حاکم کو ان سے بدظن کرنے کے

لیے ان پر غبن کے الزامات لگائے لیکن جب دولت خان نے خیرات گھر کا معائنہ کیا اور تمام معاملات درست پائے تو اس کے دل میں بابا نانک کی قدر و منزلت بہت بڑھ گئی۔ اس کے بعد ایک بار پھر لوگوں نے اسی قسم کی باتیں حاکم سے کہیں مگر تحقیق کے بعد اس موقع پر بھی بابا نانک کی پاکدامنی ہی ظاہر ہوئی لیکن بابا نانک مخالفین کے اس رویے سے دل برداشتہ تھے، اس لیے ملازمت سے الگ ہو گئے۔ ان کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا درویشانہ زندگی اختیار کر کے حق اور سچ کی تبلیغ کو اپنا شعار بنا لیا۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد بابا نانک کافی عرصے تک سلطان پور ہی میں رہائش پذیر رہے یہیں ان کے ہاں دولڑکے پیدا ہوئے۔ بڑے کا نام "سری چند" اور چھوٹے کا نام "لکھمی داس" رکھا گیا۔ اب انہوں نے دنیا میں گھومنے پھرنے، تبلیغ اور حصولِ علوم کی خاطر وطن کو خیر باد کہنے کا ارادہ کیا۔

گورونانک چھتیس سال کی عمر میں سلطان پور سے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ان کے چار بہترین دوست یعنی مروانہ، لہنا، بالا اور بدھا بھی ان کے ساتھ تھے۔ گورو نے برصغیر کے شمالی اور مشرقی علاقوں کا تفصیلی دورہ کیا۔ تمام مذاہب کے مقدس مقامات دیکھے۔ ان کے رسم و رواج سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ان کی مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کیا۔ وہ خود توحید پرست تھے اور وحدانیت کا پرچار کرتے تھے۔ شمالی اور مشرقی علاقوں کا یہ دورہ تقریباً آٹھ سال میں ختم ہوا تھا اور اس عرصہ کے دوران بابا نانک ہردوار، بنارس اور آسا وغیرہ کے علاوہ کئی دوسرے مقامات پر بھی گئے۔

گورونانک نے ایک بار پھر رختِ سفر باندھا۔ ان کا دوسرا دورہ بھی ہندوستان تک ہی محدود تھا۔ اس سفر میں بابا نانک نے برصغیر کے جنوبی علاقوں یعنی گجرات، کاٹھیاواڑ اور دکن کی ریاستوں کی سیر کی۔ انہوں نے سومنات کے مندر کے علاوہ اور بھی کئی مشہور مندر دیکھے۔

تیسرے سفر میں گورونانک کشمیر، افغانستان، ایران، عراق وغیرہ ہوتے ہوئے مدینہ اور مکہ معظمہ بھی گئے۔ بابا نانک کے سفرِ مکہ کے بارے میں سکھوں میں ایک اعتقادی حکایت موجود ہے۔ یعنی جب بابا نانک کعبے میں لیٹے ہوئے تھے تو ان کے پاؤں "جوفِ کعبہ" کی

طرف تھے۔ انہیں اس عالم میں دیکھ کر قاضی رکن الدین نے تنبیہ کی کہ اس طرف سے پاؤں ہٹالو۔ گورونانک نے کہا کہ آپ ہی میرے پاؤں اس طرف کر دیں، جس طرف کعبہ نہ ہو۔ چنانچہ جب انہوں نے گورو کے پاؤں اٹھا کر دوسری طرف کیے تو کعبہ بھی اس طرف منتقل ہو گیا۔ اسی طرح جدھر بھی پاؤں کیے جاتے کعبہ بھی ادھر ہی گھوم جاتا۔

الغرض بابا نانک جب اس سفر سے واپس آئے تو ایمن آباد کے ایک بڑھئی بھائی لالو کے گھر میں فروکش ہوئے۔ جب ان کے والدین کو ان کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے انہیں اپنے گھر واپس آنے اور پھر سے سماجی زندگی گزارنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ انہیں کہا گیا کہ اپنے بیوی بچوں پر ہی ترس کرو اور اب کہیں نہ جاؤ۔ لیکن گورو نہ مانے اور کہا کہ میری کسی کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ میری رشتہ داری تو سچ، دیانت، عفوودرگزر اور صبر و تحمل ہی سے ہے۔ اس کے بعد وہ پھر سفر پر روانہ ہو گئے اور سیلون، ترکی وغیرہ میں گھومتے پھرتے رہے۔ ازاں بعد واپس آ کر پھر ایمن آباد کے بڑھئی کے پاس رہنے لگے۔ اب ان کے پیروکاروں کی تعداد بھی کافی بڑھ گئی۔ گورونانک نے آخر عمر میں پنجاب کی سیاحت کی۔ انہوں نے اس سفر کے دوران ملتان کے مسلمان فقراء میں بھی کچھ عرصہ گزارا۔ بعدازاں پاکپتن شریف، لاہور، سیالکوٹ، دیپالپور، قصور، پٹی، پسرور، ڈیرہ وال وغیرہ میں اپنا تبلیغی مشن جاری رکھا۔ اس سفر میں آ کر بابا نانک مستقل طور پر لاہور سے چالیس میل دور دریائے راوی کے کنارے ایک جگہ قیام پذیر ہو گئے۔ جسے آج کل ڈیرہ بابا نانک کہا جاتا ہے۔ اس جگہ بابا نانک نے ایک بہت بڑا لنگر خانہ جاری کیا۔ جہاں روزانہ ہزاروں نادار لوگ کھانا کھاتے تھے۔ بہت سوں کے لیے رہائش کا انتظام بھی کیا۔ بابا نانک نے ضلع جالندھر میں بھی ایک قصبہ آباد کیا۔ جس کا نام کرتار پور رکھا۔ سکھوں کے نزدیک یہ جگہ بہت تقدس کی حامل ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ بابا نانک کے دو لڑکے تھے۔ بڑا لڑکا سری چند اللہ لوک تھا۔ اس نے بھی درویشانہ زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ لیکن چھوٹا لڑکا لکھمی داس چند ایک دنیادار

انسان تھا۔ ان کی اولاد پنجاب وغیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ انہیں ''نانا کپوترا'' یا 'صاجبزادہ' کہا جاتا ہے۔

22 ستمبر 1539ء کو ایک نہایت پاکیزہ زندگی گزارنے کے بعد بابا نانک نے اکہتر سال کی عمر میں کرتار پور میں انتقال کیا۔ ان کی یاد میں ایک سمادھ (مقبرہ) تعمیر کیا گیا جہاں ہر سال سکھ بہت بڑی تعداد میں جاتے ہیں اور اپنی مخصوص مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں۔

بھگت کبیر اور گورو نانک کی تعلیمات:

ہندوستان کے عوام زمانہ قبل تاریخ سے برہمنی سامراج کے ظالمانہ نظام میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کمتر ذاتوں کے ہندو ہمیشہ ہی سے برہمنوں کی نام نہاد نسلی برتری کے استحصال کا شکار رہے ہیں۔ برہمنوں کا یہ استحصالی شکنجہ اس قدر سخت تھا کہ اس میں پھنسی ہوئی انسانیت ایک طویل عرصے تک سسکیاں بھی نہ لے سکتی تھی۔ لوگ انہیں بدترین حالات میں زندگی بسر کرتے رہے۔ شودر طبقہ اسی غیر فطری معاشرتی تقسیم کے عذاب میں مبتلا تھا کہ مسلمان انسانی مساوات کے فطری اصول کے علمبردار اور انسانی اقدار کے محافظ بن کر ہندوستان میں وارد ہوئے۔ انہوں نے آ کر یہ تصور پیش کیا کہ رنگ و نسل کی بنیاد پر سماجی تفرق کا نظریہ انسانیت کی صریح توہین ہے۔ سب انسان برابر ہیں۔ اعلیٰ و ادنیٰ معیار کی بنیاد انسان کے اپنے اعمال پر ہے۔ پیدائشی طور پر کوئی ادنیٰ نہیں اور نہ ہی کوئی اعلیٰ ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ بننے کی صلاحیت خود انسان میں موجود ہے۔

مسلمانوں کے ان نظریات کے عام ہوتے ہی اچھوت قوم کے صدیوں سے دبے ہوئے احساسات اور جذبات میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے والہانہ انداز میں ان نظریات کو خوش آمدید کہا اور آہستہ آہستہ بہت سے لوگ اپنے پرانے مذہب سے علیحدگی اختیار کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اسلام کی اس ترقی کو روکنے اور شودروں کی اس مذہبی بیداری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کئی کوششیں کی گئیں۔ لیکن سبھی ناکام ہوئیں۔ کچھ

کامیابی بھگتی کے مفکرین کی کوششوں کو ضرور حاصل ہوئیں۔ان مصلحین نے ہندو دھرم کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے ذات پات کے تصور کی مخالفت کو اپنی تعلیمات کی بنیاد بنایا اور وحدانیت کا پرچار کیا۔ برہمنوں کے استحصال کے شکار وہ لوگ جو اب تک اسلام کو اپنے دکھوں کا مداوا سمجھتے تھے، ان کے لیے اس تحریک میں بڑی جاذبیت تھی۔ کیونکہ اپنا مذہب چھوڑنے اور اسلام میں داخل ہونے کے بعد وہ جن سماجی فوائد سے بہرہ مند ہو سکتے تھے وہ اب انہیں مذہب کی تبدیلی کے بغیر ہی میسر آ گئے۔ ویسے بھی مذہب کی تبدیلی کو کسی زمانے میں بھی مستحسن نظروں سے نہیں دیکھا گیا اور مذہب تبدیل کرنے والوں کو ہمیشہ ہی عزیزوں، رشتہ داروں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور بعض اوقات تو بات سماجی مقاطعہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ برصغیر کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم طبقے نے بھگتی تحریک کا زبردست خیر مقدم کیا۔

بھگتی تحریک کی نشرو اشاعت میں کئی مفکرین نے حصہ لیا۔لیکن ان میں سب سے مشہور ایک تو بھگت کبیر ہیں جن کے نام سے یہ تحریک موسوم ہے اور دوسرے بابا نانک، جنہوں نے بھگتی نظریات کو اس پہلو سے پیش کیا کہ ان کے پیروکار ایک علیحدہ حیثیت اور ایک منفرد مقام کے مالک بن گئے۔ جب کہ ان سے قبل کے مبلغین کی تبلیغ کا انداز یہ تھا کہ لوگ ہندو دائرے میں رہتے ہوئے بھی نئے نظریات اپنا سکتے تھے۔

بابا نانک چونکہ بھگتی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کی تعلیمات میں خدا کی وحدانیت اور معاشرتی مساوات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔توحید کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ خدا صرف ایک ہے جسے لوگ رب، اللہ، خدا، ایشور، بھگوان، دزگار، رام، شیو اور گنیش وغیرہ کے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ان تمام الفاظ سے مراد ایک ہی ہے۔ یعنی خدا جو قادر مطلق، خالق کل، مالک الملوک، حی و قیوم، لاشریک اور حاضر و ناظر ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نیک اعمال ہونے کے باوجود نجات اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ حقیقی خدا کی معرفت حاصل نہ ہو اور خدا کی معرفت سچے گورو کی پیروی

کیے بغیر ممکن نہیں۔ خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ گورو کی اتباع میں مضمر ہے۔ کوئی کسی کو نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ خدا صرف ایک ہے۔ اس کا مثیل و نظیر کوئی نہیں۔ اسے کسی مادی جسمانیت کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی بتوں کی پرستش سے حقیقی خدا کی رضا حاصل ہو سکتی ہے۔ مذہب چند رسوم و قیود کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اصلی مذہب معاشرتی مساوات ہے۔ یعنی ہر شخص عزت و احترام کا مستحق ہے۔ نسلی امتیازات اور گروہی تعصبات کی بابا نانک نے سختی کے ساتھ مذمت کی اور آپس میں بھائی چارے اور رواداری کا درس دیا۔ ان کا مذہب بنی نوع انسان سے محبت کرنا ہے۔ الغرض وہ اپنے وقت کے ایک عظیم مصلح تھے۔ انہوں نے معاشرے کی اصلی خرابیوں کو شدت سے محسوس کیا اور ان کو دور کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور بڑی تعداد میں مظلوم انسان برہمنی استعمار کے ظالمانہ گرداب سے نکل کر ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

اب تک بابا نانک کے جو مذہبی اعتقادات بیان کیے گئے ہیں ان میں وہ اسلام سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ عقائد جن میں وہ ہندو دھرم سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، ان میں سب سے مشہور ''آواگون'' کا مسئلہ ہے یعنی بابا نانک عمل تناسخ کے قائل تھے۔ وہ خواتین کے پردے کے بھی خلاف تھے۔

ان کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ معاشرے کی اصلاح کے لیے ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ غصہ، حرص و طمع، تکبر اور بدگوئی وغیرہ انسان کے دشمن ہیں۔ ان کی وجہ سے معاشرے کا امن تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اس لیے لوگوں کو ان سے بچنا چاہیے۔ انہوں نے قناعت اور توکل اختیار کرنے کی تلقین کی۔ بابا نانک رہبانیت، یعنی ترکِ دنیا کے بھی خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کو معاشرے میں رہ کر معاشرے کی برائیوں کا مقابلہ کرنا چاہیے نہ کہ ہمت ہار کر ویرانوں میں جا چھپے۔ انہوں نے اسی لیے اپنے بڑے لڑکے سری چند کو اپنا جانشین نہیں بنایا جو اگرچہ درویش تو تھا مگر تارکِ دنیا تھا۔ اس کے پیروکار ''اداسی'' کہلاتے

ہیں۔ یعنی دنیا اور سماج سے اداس۔ بابا نانک نے بڑی حد تک ایک سماجی زندگی گزاری اور شادی وغیرہ بھی کی۔

گورو انگد (1539ء تا 1552ء):

گورو انگد 1504ء میں سکندر لودھی کے عہد میں ضلع فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ 1530ء میں گورو نانک سے ان کا تعارف ہوا اور یہ ان کی شخصیت اور خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ بابا نانک بھی انہیں بہت عزیز جانتے تھے۔ چنانچہ گورو نانک کی وفات کے بعد گورو انگد ہی گدی نشین ہوئے۔ گورو نے بابا نانک کی تحریک کو کما حقہ فروغ دیا۔ ان کے زمانے میں پیروکاروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ اس گورو کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مختلف زبانوں کی آمیزش سے ایک نئی زبان ایجاد کی۔ پھر اسے دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی رسم ڈالی، جسے گورمکھی کہا جاتا ہے۔ گورو انگد نے بابا نانک کی سوانح اور تعلیمات کو محفوظ کیا۔ گورو انگد کی کوشش سے بابا نانک کی تعلیمات ایک منفرد حیثیت سے محفوظ ہوگئیں۔ بابا نانک سے پہلے بھگتی تحریک کے مبلغین کی اصلاحی کوشش ہندو دھرم میں مدغم ہو کر اپنی انفرادیت کھو چکی تھی۔ اگر گورو انگد ایک علیحدہ زبان میں ایک نئے مسلک کے بانی کی حیثیت سے گورو نانک کی تعلیمات کو محفوظ نہ کرتے تو یہ تحریک آج اس قدر ترقی یافتہ شکل میں دنیا کے سامنے نہ ہوتی۔ گورو انگد نے 1539ء سے 1552ء تک مذہبی رہنما کی حیثیت سے اپنے فرائض کو احسن طریق پر انجام دیا تھا۔ گورو انگد نے بابا نانک کی موت کے بعد چند اصول و قواعد مرتب کئے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ سکھ اپنے مسلک پر سختی سے کاربند ہو گئے اور اس کی بنیادیں روز بروز گہری ہوتی گئیں۔ انگد نے اپنی تمام زندگی بابا نانک کے نقشِ قدم کی پیروی میں گزاری اور اپنے گورو کے مشن کو کامیابی سے چلایا۔ انہوں نے بھی ایک سماجی زندگی بسر کی اور وہ منج کا بان بٹ کر اپنی روزی کماتے تھے۔ وہ جوالا مکھی دیوی (ضلع

کانگڑہ) کے مندر پر ہر سال پیدل جایا کرتے تھے اور وہاں منت بھی دیا کرتے تھے۔ ہمایوں نے اپنی جلاوطنی کے وقت پنجاب سے گزرتے ہوئے گوروانگد سے اپنی کامیابی کے لیے دعا کی گزارش کی تو گورو نے اسے یہ نوید دی تھی کہ تم بہت جلد دوبارہ ہندوستان کے بادشاہ بنو گے۔

تقریباً تیرہ سال تک گوریائی کرنے کے بعد 1552ء میں گوروانگد کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے ہی بسائے ہوئے قصبے میں دفن ہوئے۔

گوروامرداس(1552ءتا1574ء):

گوروامرداس ''واسارکی'' ضلع امرتسر میں 1479ء میں تیج بھان بھلے کھتری کے گھر پیدا ہوئے۔ سکھ مت اختیار کرنے سے پیشتر امرداس کے مذہبی خیالات عام ہندوؤں جیسے تھے۔ وہ ایک مفلوک الحال شخص تھے۔ ان کی کل کائنات ایک ٹٹو تھا جس پر وہ تیل اور نمک لاد کر گاؤں گاؤں بیچتے تھے اور یہی ان کے نان ونفقہ کا سہارا تھا۔ ''کھادر'' کے علاقہ میں گوروانگد سے ان کی ملاقات ہوئی۔ امرداس گوروانگد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یہ فوراً ہی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ وہ اپنے گورو کے نہانے کے لیے گوبندوال کے قریب ایک دریا سے روزانہ پانی لایا کرتے تھے۔ یہ دریا ان کی جائے اقامت سے تقریباً پانچ میل دور تھا۔ امرداس نے کبھی گورو کی طرف پشت نہیں کی تھی۔ چنانچہ جب وہ پانی لینے کے لیے نصف شب کے وقت دریا پر جاتے تب بھی ان کا منہ گورو کے گھر کی جانب ہی رہتا۔ اس طرح انہیں کئی دقتیں بھی پیش آتیں لیکن ان کے اس معمول میں ذرا فرق نہ آیا۔ جہاں سے وہ پانی لیا کرتے تھے وہاں بعد میں ایک باؤلی تعمیر کی گئی جو اب سکھوں کی ایک اہم زیارت گاہ ہے اور یہاں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ ایک دفعہ رات کے وقت پانی لاتے ہوئے امرداس گہرے کھڈ میں گر پڑے اور پانی کا برتن ٹوٹ گیا۔ وہ ایک نیا برتن لے کر دوبارہ دریا پر گئے اور گورو کے لیے پانی لائے اور واپس آ کر گورو نے اپنے

گرنے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ دوسرے دن گورو انگد کو یہ واقعہ معلوم ہوا کہ وہ امرداس کے اس پرخلوص جذبۂ خدمت سے متاثر ہوئے اور بعدازاں انہیں اپنا جانشین بھی نامزد کیا جس پر شروع میں خاصا اختلاف رونما ہوا۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ امرداس ہر لحاظ سے جلیل القدر مذہبی منصب کے اہل تھے۔

امرداس نے گرنتھ صاحب میں چند اقوال کا اضافہ کیا۔ انہوں نے ہندو معاشرہ کی سب سے زیادہ دل سوز رسم ''ستی'' کے خلاف زبردست اور منظم تحریک کا آغاز کیا اور کہا کہ مردہ خاوند کے ہمراہ ایک زندہ عورت کا جل مرنا پیار و محبت کی علامت ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ بے بس عورتوں پر بدترین نوعیت کا ظلم ہے۔ دکھ اور مصائب برداشت کرنا اور مرحوم کی یاد کو زندہ رکھنا ہی سب سے بڑی ''ستی'' ہے۔ گورو امرداس نے سکھ قوم کی تنظیمی اصلاح کی طرف بھی خاص توجہ دی اور ان کے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے قصبہ گوبندوال میں ایک مرکزی عبادت گاہ تعمیر کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہاں ایک باؤلی بھی بنوائی جس کی چوراسی سیڑھیاں تھیں۔ انہوں نے اپنے بابا نانک کے پیروؤں کو اداسیوں سے الگ کیا اور اداسی مسلک کے عقائد کی تردید کی۔ انہوں نے سکھوں کے مذہبی اور سیاسی افکار میں یگانگت پیدا کرنے کے لیے مختلف مقامات پر اپنے بائیس چیلوں کو تبلیغ کے لیے مقرر کیا۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے اپنی روحانی سلطنت کو بائیس صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر حصہ کو ''منجی'' کہتے ہیں۔ سکھوں کو ہندوؤں سے ممتاز کرنے کے لیے انہوں نے مخصوص آخری رسومات رائج کیں اور انہیں لازمی قرار دیا۔ جو ہندوانہ رسوم سے قطعی طور پر مختلف تھیں۔ انہوں نے گورو نانک کے جاری کردہ لنگر کے انتظامات کو بہتر اور وسیع کیا اور اسے مذہبی و سیاسی نقطہ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم قرار دیا۔ گورو نے اپنے پیروؤں کے لیے شراب نوشی کو ممنوع قرار دیا۔ انہوں نے عورتوں کے لیے پردے کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے ختم کر دیا۔ الغرض گورو امرداس کے عہد میں سکھ فرقہ کی انفرادی حیثیت مسلم ہو گئی۔ گورو امرداس کے ان اقدامات کی وجہ سے سکھ بحیثیت ایک گروہ کے بہت ترقی کرنے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ ان

میں مذہبی عصبیت اور انتہا پسندانہ قومی جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ جس نے انہیں بعد میں ایک صلح جو مذہبی گروہ سے ایک خونخوار خالصہ دل میں تبدیل کر دیا۔ لیکن اپنے ہم مسلک لوگوں کے ساتھ ان کا جذبہ تعاون و ہمدردی مثالی تھا۔

بعض کینہ پرور اور بد اندیش لوگوں نے گورو کے خلاف اکبر بادشاہ کے کان بھرے اور الزام یہ لگایا کہ گورو عوام میں حکومت کے متعلق بے اطمینانی پھیلا رہے ہیں۔ چنانچہ اکبر نے گورو کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے طلب کیا۔ اکبر اس زمانے میں لاہور میں تھا۔ گورو خود تو نہ آئے بلکہ اپنے داماد "بھائی جیٹھا" کو بھیج دیا۔ بھائی جیٹھا، اکبر کو باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ یہ سب کچھ حاسدوں کی کارستانی ہے۔ اس میں ذرہ بھر بھی حقیقت نہیں ہے۔ اس پر اکبر بادشاہ، گورو کے بارے میں مطمئن ہو گیا۔ بعد میں ایک دفعہ اکبر خود بھی گورو کے پاس حاضر ہوا اور ان کے لنگر میں کھانا بھی کھایا اور گورو سے مختلف موضوعات پر باتیں بھی کیں۔ اس کے بعد اکبر اور گورو امرداس کے درمیان ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے۔

گورو امرداس گورو کی حیثیت سے بائیس سال مذہبی خدمات انجام دینے کے بعد 14 مئی 1574ء کو گوبندوال کے مقام پر فوت ہو گئے۔ امرداس کی سمادھ مذکورہ گاؤں میں دریائے راوی کے کنارے تعمیر کی گئی۔ جو بعد ازاں دریا کے بہاؤ کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ گورو امرداس نے اپنے داماد جیٹھا بھائی کو اپنا جانشین نامزد کیا جو بعد ازاں گورو امرداس کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے اس اقدام کی وجہ سے "گورریائی" اب خانہ زاد ہو کر رہ گئی اور بعد میں گورو امرداس نے اس تصور کو مزید تقویت دی اور اپنے بعد اپنے بیٹے "ارجن مل" کو نامزد کیا اور یوں گورریائی ایک ہی خاندان کا حصہ بن کر رہ گئی۔ حقیقی استحقاق یعنی دھرم کی خدمت کے مخلصانہ ولولے اور علم و اہلیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔

گورو رامداس (1574ء تا 1581ء):

گورو رامداس، گورو امرداس کے داماد تھے، اور ان کی وفات کے بعد چالیس سال کی

عمر میں سکھوں کے مذہبی رہنما کی حیثیت سے گدی نشین ہوئے۔رام داس کے آباؤ اجداد لاہور کے سوڈھی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔وہ لاہور میں ہرداس سوڈھی کے گھر 1534ء میں پیدا ہوئے۔معاشی حالات کے پیشِ نظر وہ لاہور سے گوبندوال منتقل ہو گئے تھے۔غربت و مفلسی کا یہ عالم تھا کہ رامداس اپنے والدین کی کفالت ابلے ہوئے چنے بیچ کر کیا کرتے تھے۔جس طرح گورو امرداس نے گورو انگد کی سیوا کی تھی اس طرح رامداس نے بھی اپنے گورو کی خدمت کی۔اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے پیشِ نظر گورو نے اپنی لڑکی کی شادی رامداس سے کردی اور اپنی زندگی ہی میں اپنے بعد ان کی جانشینی کا اعلان کردیا تھا۔

انہوں نے پرانے تالاب ''امرتسر'' کو وسعت دی۔اس کے وسط میں ایک مندر بنوایا۔جس کا نام 'ہرمندر' ہے۔تالاب کے گرداگرد حجرے تعمیر کئے جہاں سکھ درویش رہتے تھے۔گورو رامداس بھی اکثر یہاں آتے رہتے تھے۔پہلے اس جگہ کو ''گورو کا چک'' کہا گیا۔ بعدازاں تالاب کی مناسبت سے اس کا نام ''امرتسر'' مشہور ہو گیا۔

لاہور میں شہنشاہ جلال الدین اکبر جب بیمار ہو گیا تھا تو گورو رامداس سے بادشاہ کی صحت یابی کے لیے دعا کروائی گئی تو بادشاہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔بادشاہ نے گورو کو لاہور ملاقات کے لیے بلوایا۔دورانِ گفتگو بادشاہ رامداس کے افکار سے بہتر متاثر ہوا اور اسے پانچ سو بیگھ زمین کا ایک قطعہ بطور انعام مراحمت کیا۔لیکن رامداس نے زمین لینے سے انکار کر دیا اور بادشاہ سے عرض کی کہ اگر آپ مجھے ممنون ہی کرنا چاہتے ہیں تو اس سال پنجاب کے غریب کاشتکاروں سے محصولات وصول نہ کئے جائیں۔کیونکہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے ان کی فصلوں کو بہت نقصان پہنچا ہے۔بادشاہ گورو رامداس کی اس بے نیازی سے بہت متاثر ہوا اور اس سال کا تمام مالیہ وغیرہ معاف کر دیا۔گورو کی اس سفارش کا پنجابی کسانوں پر بھی بہت اچھا اثر پڑا۔رامداس نے کسانوں کے دل جیت لیے اور پنجاب کے بے شمار جاٹوں نے سکھ مذہب اختیار کر لیا۔گورو رامداس سات سال بحیثیت گورو، مذہبی امور سرانجام دینے کے بعد مارچ 1581ء میں فوت ہوئے۔ان کی سمادھ دریائے بیاس کے

کنارے ہے۔ان کے عہد میں سکھ مت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

رامداس کے عہد سے ''گورگدی'' خاندانی وارثت کا حصہ بن گئی تھی۔رامداس کے تین بیٹے تھے۔بڑے کا نام 'مہادیو' تھا جو فقیرانہ زندگی اختیار کر کے جہاں گرد ہو گیا تھا۔دوسرے کا نام 'پرتھی داس' تھا۔وہ دنیا داری کی آلائشوں میں ملوث تھا اور سب سے چھوٹے کا نام 'ارجن مل' تھا۔جسے اپنے والد سے بہت عقیدت تھی اور مذہب سے بھی اسے بہت لگاؤ تھا۔چنانچہ گورو رامداس نے اپنے اسی بیٹے کو مستقبل کے لیے سکھ پنتھ کا پیشوا متعین کیا۔

گورو ارجن مل (1581ء تا 1606ء):

ارجن مل 1563ء میں گوبندوال میں پیدا ہوئے۔ان کی والدہ کا نام 'بہینی' تھا جو گورو رامداس کی بیٹی تھیں۔گورو رامداس کے بعد جتنے بھی گورو یکے بعد دیگرے گدی نشین ہوئے وہ اسی خاتون بہینی ہی کے بیٹے، پوتے تھے۔گورو رامداس کے عہد سے گدی نشینی کا مسئلہ وراثتی بن گیا۔گورو ارجن سکھ، مت کے پہلے گورو تھے جنہوں نے فقیرانہ لباس کو ترک کر کے شاہانہ لباس زیب تن کرنا شروع کر دیا تھا۔ان کے اصطبل میں اعلیٰ عربی نسل کے گھوڑوں کے علاوہ بہترین ہاتھی بھی موجود تھے۔

گورو ارجن کے عہد کا پہلا اہل کام یہ ہے کہ انہوں نے چند عدالتی قوانین وضع کیے تاکہ سکھوں کے مقدمات کا فیصلہ اسی مذہبی قانون سے ہو۔اس اقدام کی وجہ سے سکھ عام ہندو اور مسلم رعایا سے ملّی طور پر منفرد حیثیت کے حامل ہو گئے اور اب اسی حیثیت سے انہوں نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں۔گورو ارجن نے کہا:

''گورو نانک کا مشن اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ جماعت سیاسی طور پر طاقتور ہو۔اگر جماعت کمزور ہو تو اسے کسی بھی وقت ختم کیا جا سکتا ہے یا وہ خود بخود ختم ہو سکتی ہے''۔

گورو ارجن کا دوسرا اہم کارنامہ ''ادی گرنتھ'' کی ترتیب و تدوین ہے۔اس میں

گورونانک کی سوانح حیات اوران کے اقوال کے علاوہ دوسرے سکھ گوروؤں کے اقوال بھی شامل ہیں۔ مشہور ہندو بھگتیوں اور بعض مسلمان صوفیاء کے اقوال بھی اس مجموعے میں درج کئے گئے ہیں۔ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ پاکپتن کے شلوک بھی اس میں شامل ہیں۔ اسی طرح اس کتاب کی صورت ایک طویل نظم کی سی ہوگئی ہے۔ اس کتاب کی تدوین 1604ء میں مکمل ہوئی۔ گوروارجن نے حکم دیا کہ تمام سکھ اس کتاب کا باقاعدگی کے ساتھ اور بنظرِ غائر مطالعہ کیا کریں۔ اس سے انہیں ہر قسم کی ہدایت اور رہنمائی حاصل ہوگی۔ گوروارجن نے کہا کہ "اب قرآن یا پران پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ گرنتھ میں موجود ہے"۔

گوروارجن کا تیسرا اہم اقدام اقتصادی شعبے میں اصلاحات ہے۔ انہوں نے تمام سکھوں پر ایک محصول عائد کیا۔ یعنی ہر سکھ کو چاہیے کہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ گورو کی خدمت میں پیش کرے۔ اس ٹیکس اور نذرانوں وغیرہ کو جمع کرنے کے لیے گوروارجن نے اپنے آدمی مقرر کئے یہ لوگ تمام وصول شدہ رقم اپنے لیے کچھ رکھے بغیر فوراً گورو کی خدمت میں روانہ کردیتے۔ اس طرح گوروارجن کے پاس ہر سال معقول رقم جمع ہوتی گئی جس سے انہوں نے کئی عالیشان تالاب اور کچھ شاندار عمارتیں تعمیر کرنے کے علاوہ تھوڑی سی فوج بھی منظم کی اور درباری لوازمات بھی مہیا کئے اور ایک قابلِ رشک زندگی گزارنی شروع کی۔ اس طرح سکھوں کے گروہ کی نوعیت میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ پرامن فرقہ ایک سیاسی اور جنگی گروہ میں تبدیل ہوگیا۔

چوتھا قدم گوروارجن نے تجارت سے متعلق اٹھایا۔ گورو نے تجارتی پالیسی ٹھوس بنیادوں پر منضبط کی۔ اپنے پیروؤں کو تجارت کرنے کی ترغیب دی۔ متعدد تجارتی وفود بیرونی ممالک روانہ کئے تاکہ وہاں کے تجارتی مال کا جائزہ لے کر منظم طریقے سے لین دین شروع کیا جائے۔ گھوڑوں کی خریداری کے لیے گورو نے اپنا وفد ترکی بھیجا۔

پانچواں اہم کام تعمیرات سے متعلق ہے۔ گوروارجن نے امرتسر میں بڑے تالاب کی تعمیر کو مکمل کروایا اور علاوہ ازیں ایک اور تالاب امرتسر ہی میں تعمیر کروایا، جس کا نام "کلسار"

رکھا گیا۔ گورو ارجن نے ایک تالاب ترن تارن ضلع امرتسر میں اور ایک تالاب لاہور میں بھی بنوایا۔

گورو ارجن مل، شہنشاہ اکبر کے ہم عصر تھے۔ ان کے درمیان کئی بار ملاقات ہوئی اور ان کے دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تک اکبر کے ساتھ گورو کے بہت اچھے مراسم رہے۔ نہ گورو نے کبھی شاہی اقتدار کے خلاف ورزی کی اور نہ ہی کبھی اکبر نے اس اصلاحی تحریک کو روکنے کی کوشش کی۔ اس وقت تک بادشاہانِ دہلی اور سکھ گورو صاحبان کے تعلقات انتہائی خوشگوار رہے۔ حتیٰ کہ 1605ء میں اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا۔ جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی اس کے بڑے لڑکے شہزادہ خسرو نے باپ کے خلاف بغاوت کر دی اور اپنے فوجی دستے کے ساتھ لاہور آ گیا۔ راستے میں اس کی ملاقات گورو ارجن سے ہوئی۔ انہوں نے شہزادے کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور اسے اخلاقی و مالی امداد کی یقین دہانی کرائی۔ تلک لگایا اور کامیابی کے لیے دعا دی۔ ادھر جہانگیر فوراً خسرو کے تعاقب میں لاہور آیا اور اسے گرفتار کر کے ساتھ لے گیا۔ اس نے ان لوگوں کو بھی پکڑنا شروع کر دیا جنہوں نے کسی صورت میں بھی خسرو کی مدد کی تھی۔ جب ان لوگوں کے بارے میں تفتیش شروع ہوئی تو پنجاب کے وزیرِ مالیات چندو شاہ نے بادشاہ کو گورو ارجن مل کے طرزِ عمل سے آگاہ کیا۔ اس ضمن میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ چندو شاہ اپنی لڑکی کی شادی گورو ارجن کے بیٹے ہرگوبند سے کرنا چاہتا تھا مگر گورو ارجن اس کے لیے راضی نہ ہوئے۔ چندو شاہ نے کئی بار پیغام بھجوایا لیکن گورو نے ہر بار انکار کیا اور کہا کہ اگر تم ساری دنیا کی دولت بھی جہیز میں دو تو بھی یہ رشتہ نہیں ہوگا۔ چندو شاہ اپنی اس توہین پر برافروختہ ہو گیا اور دل میں انتقام لینے کا تہیہ کر لیا۔ اکبر کے عہد میں بھی اس نے کئی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوا۔ لیکن جہانگیر کے عہد کی ابتداء ہی میں اس کو موقع مل گیا اور اس نے جہانگیر کو گورو ارجن کے خلاف کارروائی کرنے پر آمادہ کر لیا۔

چنانچہ جہانگیر کے حکم سے گورو ارجن کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں دو لاکھ روپے کا جرمانہ

ادا کرنے کو کہا گیا بصورتِ دیگر موت کی سزا سنائی گئی۔ گورو نے جواب دیا کہ ہم درویش لوگوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں ہمارے پاس تو جو کچھ ہے وہ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کے لیے ہے لہٰذا میں موت قبول کرتا ہوں۔ جہانگیر نے گورو کو قتل کرنے کے لیے چندو شاہ کے حوالے کیا۔ جس نے ان کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب چندو شاہ نے گورو کو قتل کرنا چاہا تو گورو نے آخری خواہش کے طور پر دریائے راوی میں نہانے کی اجازت چاہی جو دے دی گئی اور زبردست پہرے میں گورو کو راوی پر لایا گیا۔ گورو نے نہانے کے لیے دریا میں ڈبکی لگائی اور پھر نہ ابھرے۔

گورو ارجن مل چوبیس سال گورو گدی پر متمکن رہے۔ ان کے عہد میں سکھ مت نے بہت ترقی کی۔ ان کی سمادھ شاہی قلعہ لاہور کے مقابل مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ کے قریب ہے۔

گورو ارجن مل کی موت کا واقعہ سکھ مت کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ گورو ارجن نے موت سے قبل اپنے بیٹے ہرگوبند کے نام ایک وصیت چھوڑی، جس میں اسے کہا گیا تھا کہ میری موت پر کسی قسم کا افسوس نہ کرنا۔ اب تم گورو گدی پر مسلح ہو کر بیٹھا کرو، اپنی فوج بڑھاؤ اور خدا کی تعریف میں گیت گایا کرو۔ اس پیغام نے سکھوں کے نظامِ فکر کو یکسر بھلا دیا۔ انہوں نے امن و آشتی کے فلسفے کو بالائے طاق رکھ کر امن کے خرمن کو خاکستر بنانے کے لیے اپنے دامن کو مذہبی تعصب اور جارحانہ عزائم کی چنگاریوں سے بھر لیا۔ اب انہوں نے اس مقصد کے لیے اپنی طاقت بڑھانی شروع کی۔ تاکہ برصغیر سے "مسلمان حکومت" کو ختم کر دیا جائے۔ ان کی اس تحریک کو کچلنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں وہ سب بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ لیکن سکھ روز بروز اپنے مقصد سے قریب تر ہوتے گئے اور ان کے دل میں مسلم کش رجحانات پختہ ہونے لگے۔ جن کی وجہ سے مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان نفرت کی خلیج اس قدر وسیع ہو گئی کہ جس کا پاٹنا کسی صورت ممکن نہ رہا۔

سردار تیج سنگھ رقمطراز ہے کہ گورو ارجن کو بے گناہ اور بغیر کسی جواز کے موت کی سزا دی

گئی لیکن سکھوں کے حق میں اس کے بہت خوش آئند نتائج برآمد ہوئے گورو ارجن مل کی قربانی ہرگز رائیگاں نہیں گئی۔اس واقعہ سے سکھوں پر یہ امر واضح ہو گیا کہ اگر وہ دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں فوجی اور اقتصادی طور پر اپنے آپ کو مستحکم کر کے پنتھ کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنی ہوں گی۔

گورو ہر گوبند (1606ء تا 1645ء):

گورو ارجن مل کی موت کے بعد ان کے بیٹے گورو ہر گوبند سنگھ گدی نشین ہوئے۔وہ 1595ء میں پیدا ہوئے۔گدی نشینی کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ہر گوبند کے چچا ''پرتھی چند'' نے ان کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر گدی حاصل کرنے کے لیے اپنی راہ ہموار کرنا چاہی لیکن سکھوں نے اسے دیوان چندو شاہ کا ساتھی گردانتے ہوئے مسترد کر دیا۔

گورو ہر گوبند فطری طور پر ان صفات سے متصف تھے جو کسی بھی اعلیٰ درجے کے مذہبی اور سیاسی قائد کے لیے ضروری ہیں۔وہ ایک صحت مند جسم و دماغ کے مالک تھے۔ان کے والد گورو ارجن مل نے محض امیرانہ زندگی ہی اختیار کی تھی لیکن ہر گوبند نے اس کے ساتھ ساتھ ایک مکمل فوجی زندگی بھی اپنائی۔اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے پیروؤں کو ہدایت کی کہ گورو کے دسویں حصہ میں اب دو روپے اور اناج کی بجائے تلواریں اور گھوڑے ادا کیا کریں۔اس طرح رضا کارانہ بنیادوں پر ایک بہت بڑی فوج کی ضروریات مہیا ہو گئیں تمام بڑے بڑے پہلوان گورو کے دربار میں جمع ہو گئے۔جنگی مشقیں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔اس طرح ایک نہایت مستحکم فوجی تنظیم قائم ہو گئی۔

اس فوج میں شامل افراد تنخواہ وغیرہ کے لالچ سے آزاد صرف مذہب کی خدمت کے جذبے کے تحت اپنے آپ کو معرضِ خطر میں ڈالنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ تھے۔گورو ہر بند نے ان لوگوں کو ہر وقت مسلح رہنے کی ہدایت کی۔خود گورو بھی تلواریں زیب کمر کرتے تھے۔جو ان کے روحانی اور دنیاوی اقتدار کا مظہر تھیں۔اس مفہوم کو گورو نے پیری اور مریدی کے

الفاظ میں واضح کیا۔ فوج منظم کرنے کے ساتھ ساتھ گورو نے دفاعی نقطہ نظر سے بعض مقامات پر قلعے بھی تعمیر کرائے۔ سب سے پہلے امرتسر کے گرد فصیل بنوائی جس کی وجہ سے یہ جگہ سکھوں کا فوجی مستقر بن گئی۔ اسے سکھ لوہ گڑھ کہتے تھے۔ شہر میں دربار کرنے کے لیے بھی ایک عالی شان مقام تعمیر ہوا جس کو واکال بنگال کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دریائے بیاس کے کنارے گوبند پور میں ایک اور قلعہ اس مقصد کے لیے بنایا گیا تاکہ اسے شکست کی صورت میں ایک متبادل اور محفوظ پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جا سکے اور ہزیمت خوردہ لشکر یہاں اپنی تنظیمِ نو کر سکے۔ جب گورو ہرگوبند کی ان جنگی تیاریوں کی اطلاع جہانگیر کو ہوئی تو وہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہوا کہ کہیں یہ لوگ مذہبی لبادے میں ملک میں بغاوت، بدامنی اور انتشار کا باعث نہ بن جائیں۔ جس سے ملکی سالمیت متاثر ہو۔ چنانچہ شہنشاہ نے گورو ہرگوبند سے ان اقدامات کی وضاحت طلب کی۔ اگرچہ حقیقت میں گورو کا دل اپنے والد پر مظالم کی وجہ سے جہانگیر کے خلاف نفرت سے لبریز تھا لیکن وقت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں اپنی اور پنتھ کی وفاداری کا اسے یقین دلایا اور خود کو مغلیہ فوج میں شامل ہو کر خدمات انجام دینے کے لیے پیش کیا۔ انہیں دنوں جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے پنجاب سے گزرا تو گورو مغلیہ فوج میں بھرتی ہو گئے اور بادشاہ کے ساتھ کشمیر بھی گئے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ گورو پہلے سے طے شدہ ایک منصوبہ کے تحت فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ جب بھی موقع ملے جس قدر ساز و سامان اور گھوڑے ہاتھ لگیں لے کر بھاگ جائیں۔ کہتے ہیں کہ گورو کو ایک کثیر رقم سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے لیے دی گئی تھی جو گورو نے خرد برد کر لی۔ ابھی وہ اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوئے تھے کہ چند مسلمان سپاہیوں نے اس راز کو فاش کر دیا اور گورو کو بروقت گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں بارہ سال کے لیے قید کر دیا گیا۔ بعض مؤرخین اس گرفتاری کا ایک دوسرا سبب بیان کرتے ہیں۔ اس دوسرے سبب کا مرکزی کردار، گورو گھر، کا پرانا مخالف چندو شاہ تھا۔ جس نے گورو ہربند کو ترقی کرتے دیکھا تو جلنے لگا اور اس گورو کو

بھی کسی جال میں پھنسانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ اس مقصد کے لیے اس نے جہانگیر کے سامنے گورو ہرگوبند کے خلاف باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اس نے جہانگیر کو کہا کہ اس گروہ کا طاقت پکڑنا حکومت کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو ابتداء ہی میں کچل دینا چاہیے۔ بالآخر جہانگیر نے گورو کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کر لیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ دو لاکھ روپیہ فوراً ادا کیا جائے، جو گورو ارجن نے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ہرگوبند نے بھی یہ ادائیگی کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس بات کو بہانہ بنا کر جہانگیر نے گورو کو قید کر دیا۔

چند سال قید میں رہنے کے بعد حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ اور وزیر خان کی سفارش اور خود گورو ہرگوبند کی یقین دہانیوں پر جہانگیر نے انہیں آزاد کر دیا۔ اس قید کے دوران سکھوں کے تمام امور گورو کے پہلے سے جاری شدہ احکامات کے مطابق انجام پاتے رہے اور ان میں کسی قسم کا تعطل واقع نہ ہوا۔ گوالیار کا قلعہ جہاں گورو ہرگوبند مقید تھے سکھوں کی زیارت گاہ بن گیا۔ سکھ وہاں جاتے، قلعے کی دیواروں کو عقیدت کے بوسے دیتے اور ان کے سائے میں کچھ دن گزار کر واپس آ جاتے۔ ان کے ان عقیدت مندانہ مظاہروں سے عامۃ الناس بہت متاثر ہوتے۔

رہائی کے بعد گورو کے طرزِ عمل کی وجہ سے گورو کے بارے میں جہانگیر کے دل سے تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور اس نے پھر پہلے کی طرح ان پر لطف و عنایات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی سپاہیانہ صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر ان کو سات توپیں عنایات کیں اور ایک ہزار سپاہ اور پانچ سو سوار فوج رکھنے کی اجازت بھی دی۔ یہ تعلقات روز بروز مستحکم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب باتوں باتوں میں گورو نے ان مظالم کا ذکر کیا جو چندو شاہ نے گورو ارجن پر ڈھائے تھے اور دشمنی کی حقیقی وجہ کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے گورو ارجن سے ایک نہایت قیمتی ہیرا بھی چھین لیا تھا تو بادشاہ بہت متاسف ہوا اور چندو شاہ کو گورو ہرگوبند کے حوالے کر دیا اور اسے انتقام لینے کی اجازت دے دی۔ گورو ہرگوبند

چندو شاہ کو اپنے ساتھ امرتسر لے گئے اور وہاں اسے خوفناک اذیتیں دینے کے بعد ہلاک کر دیا۔ اس طرح گورو ہر گوبند نے اپنی مصلحت کوشی اور دور اندیشی کو بروئے کار لا کر اپنے بدترین اور طاقتور دشمن سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

جہانگیر کی بقیہ زندگی میں گورو اور بادشاہ کے مابین تعلقات خوش گوار رہے۔ 1627ء میں جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ اس کے ابتدائی دور میں گورو ہر گوبند نے پھر عدم تعاون شروع کر دیا۔ جس سے عملی طور پر بغاوت کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ شاہجہاں نے داراشکوہ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شہزادہ فقیروں اور درویشوں سے غایت درجہ محبت رکھتا تھا اور ہمیشہ ایسے لوگوں سے ملاقات کا خواہش مند رہتا تھا۔ جب داراشکوہ بحیثیت گورنر پنجاب لاہور میں مقیم تھا تو شہزادہ داراشکوہ اور گورو ہر گوبند میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ان میں مخلصانہ دوستی قائم ہو گئی اور 1638ء میں گورو کو کیرت پور میں جاگیر عطا ہوئی لیکن پھر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ یہ دوستی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ گورو ہر گوبند کے لیے کسی بیرونی ملک سے ایک بہت خوبصورت گھوڑا لایا گیا۔ جب وہ گھوڑا لاہور کے قریب سے گزرا تو سرکار کے آدمیوں نے چھین کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بادشاہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ یہ گھوڑا شاہی اصطبل میں داخل کیا جائے اور مالک کو قیمت ادا کر دی جائے۔ جب یہ خبر امرتسر میں گورو ہر گوبند کو ملی تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے، لیکن خاموش رہے۔ کچھ دن کے بعد اس گھوڑے کی ایک ٹانگ خراب ہو گئی تو بادشاہ نے قاضی شہر کو حکم دیا کہ اسے فروخت کر دیا جائے۔ گورو ہر گوبند نے دس ہزار روپے میں گھوڑا خرید لیا۔ لیکن رقم ادا کیے بغیر گھوڑا لے کر دوسرے دن امرتسر چلے گئے۔ گورو کی اس حرکت پر بادشاہ بہت ناراض ہوا اور اس نے گورو کو سزا دینے کا عزم کر لیا۔ اسی دوران میں ایک سکھ نے شاہی باز پکڑ لیا اور باوجود طلب کرنے کے بادشاہ کو نہ دیا۔ قاضی شہر کی ایک خواص بھی سکھوں نے اغواء کر لی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے بادشاہ اور سکھوں میں ٹھن گئی۔ بادشاہ نے اس ابھرتی ہوئی طاقت کو کچلنے کا تہیہ کر لیا۔

چنانچہ سات ہزار مغلیہ فوج کا ایک لشکر امرتسر روانہ کیا گیا جس کا سپہ سالار مخلص خان تھا۔ یہ جنگ سکھوں اور مسلمانوں میں پہلی باقاعدہ جنگ تھی جس میں مغلوں کو شکست ہوئی اور مخلص خاں کے علاوہ ایک اور سرکردہ مغل افسر غلام رسول بھی مارا گیا۔ بقیہ فوج بڑی شکستہ حالت میں لاہور واپس آئی۔ گورو ہرگوبند نے اندازہ لگا لیا کہ اب فوراً ہی ایک دوسرا اور نسبتاً بڑا لشکر امرتسر پر حملہ آور ہوگا جس کے مقابلے کے لیے فی الحال ان میں ہمت نہ تھی۔ اس لیے مصلحت کے پیشِ نظر انہوں نے امرتسر چھوڑ کر بھٹنڈہ کے جنگلوں کی طرف فرار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ان واقعات کی اطلاع جب شہنشاہ شاہجہاں کو ملی تو وہ پنجاب آیا اس نے لاہور میں سکھوں کی باؤلی کو مسمار کروا دیا۔ بعدازاں ایک فوج کمار بیگ اور لال بیگ کے زیرِ کمان لاہور سے گورو کے تعاقب میں روانہ کی۔ جب مغلیہ فوج ستلج کے کنارے پہنچ تو اسے چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ابھی ان دشواریوں پر قابو نہ پا سکتی تھی کہ سکھوں نے بڑا شدید حملہ کر دیا، جس کی بناء پر مغلوں کو دوبارہ شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت کم سپاہی جان بچا کر واپس لاہور آئے۔ یکے بعد دیگرے ان دو معرکوں میں فتح نے سکھوں میں زبردست خود اعتمادی پیدا کر دی اور ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے اور ان میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی لگن تیز تر ہو گئی۔ انہوں نے پہلے سے زیادہ اپنے آپ کو دھرم کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ ان چند جھڑپوں کے بعد شاہجہاں نے گورو ہرگوبند کے ساتھ مزید الجھنا پسند نہ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد دونوں فریق ان واقعات کو بھول کر تعاون کے نئے دور میں داخل ہو گئے۔

گورو ہرگوبند اکیس سال گوریائی کرنے کے بعد 1645ء میں کرتار پور کے مقام پر فوت ہو گئے۔ ہرگوبند کی تین رانیاں اور پانچ لڑکے تھے۔

گورو ہرگوبند نے سکھوں کو خوب منظم کیا اور ان میں مذہبی جوش و جذبہ پیدا کر کے انہیں مغلوں کے خلاف جنگ کے لیے ذہنی طور پر تیار کر دیا۔ بعض مورخین نے گورو ہرگوبند کی اس حکمتِ عملی پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ گورو نے اپنے پیروؤں کو دنیاوی

امور یعنی حب جاہ مال اور منصب میں الجھا کر انہیں مذہب سے بہت دور کر دیا۔ لیکن دوسرے مؤرخین اس کے حق میں یہ کہتے ہیں کہ گورو نے یہ حکمتِ عملی اختیار کر کے اعلیٰ درجے کی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اس نقطہ نظر سے سکھوں کو فوجی زندگی کی طرف مائل کیا کہ جس وقت مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو تو کم از کم پنجاب کی حد تک سکھ ہی قیادت کے اس خلاء کو پُر کریں۔ چنانچہ تاریخ اس بات کی تائید کرتی ہے کہ گورو کی سوچ صحیح تھی اور انہوں نے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ٹھوس بنیادوں پر کام کیا اور پنجاب میں انہی بنیادوں پر ''خالصہ راج'' کا عالیشان محل تعمیر ہوا۔ گورو نے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھا۔ اس کے علاوہ گورو کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے سکھوں میں پنتھ کی خدمت کرنے کا بے لوث جذبہ پیدا کیا۔ یہ اسی ابتدائی تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج بھی سکھ مذہب کے احکام کی اندھا دھند تقلید کرنے میں خاصے معروف ہیں اور مذہب کے ناموس کے تحفظ کے لیے کسی قسم کی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

گورو ہر رائے (1645ء تا 1661ء):

گورو ہر گوبند کے بعد ان کا پوتا ہر رائے گورو گدی پر فائز ہوا۔ یہ بہت ہی امن پسند اور صلح جو انسان تھے اور اس وجہ سے مغل دربار سے ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ دارا شکوہ سے ان کی بہت گہری دوستی تھی۔ جب شاہ جہاں کے بعد اس کے بیٹوں میں جنگ تخت نشینی ہوئی اور دارا شکوہ شکست کھا کر پنجاب چلا آیا تو گورو ہر رائے نے شہزادے کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ گورو نے شہزادے کو اخلاقی امداد کے علاوہ فوجی امداد بھی مہیا کی تھی اور سکھوں کے ایک دستے نے دارا کی جانب سے اورنگ زیب کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کے بعد گرنتھ صاحب میں اسلامی عقائد کے خلاف بعض اندراجات کی تشریح اور وضاحت کے لیے گورو ہر رائے کو دہلی میں طلب کیا لیکن انہوں نے خود جانے کی بجائے اپنے بیٹے رائے

رام کو بھیج دیا۔ بادشاہ نے اس ملاقات کے دوران میں رائے رام کو قائل کر لیا کہ واقعی گرنتھ صاحب میں مسلمانوں کے مسلمہ عقائد کے خلاف مواد موجود ہے۔ چونکہ رائے رام گرنتھ کے متعلقہ حصے حذف کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس لیے گورو ہررائے نے اسے اپنی وراثت سے عاق کر کے اپنے کمسن لڑکے ہرکشن کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ گورو ہررائے سولہ سال تک سکھ مت کی رہنمائی کے فرائض انجام دینے کے بعد موضع کرتار پور میں 16 اکتوبر 1661ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

گورو ہرکشن (1661ء تا 1664ء):

گورو ہررائے کے بعد ان کا بیٹا ہرکشن صرف پانچ سال تین ماہ کی عمر میں گورو گدی پر جلوہ گر ہوا۔ جونہی یہ خبر دہلی پہنچی تو گورو ہررائے کے بڑے لڑکے رام، جسے اس کا باپ عاق کر چکا تھا، نے بادشاہ سے فریاد کی کہ میرا حق غصب کر لیا گیا ہے۔ اس کمسن بچے کے گدی نشین ہو جانے سے گورو کے منصب کی حقیقی اہمیت ختم ہو جائے گی اور وہ چند آوارہ چیلوں کے ہاتھوں محض کھلونا بن کر رہ جائے گا جو گورو گھر کی آمدنی بری طرح لوٹیں گے۔ اس پر اورنگ زیب نے حالات کے دوسرے رخ کا جائزہ لینے کے لیے گورو ہرکشن کو دربار میں بلوایا۔ جب ہرکشن دہلی پہنچے تو دربار میں موجود برہمنوں نے ان کی علمی استعداد کا اندازہ کرنے کے لیے کچھ سوالات پوچھے جن کے گورو نے بالکل درست جوابات دیے۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ 'گیتا' کے کیا معنی ہیں۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے اسے شاہی حرم میں روانہ کیا تا کہ وہ شاہی حرم میں بہت سے خواتین میں میں سے صرف ملکہ کی طرف اشارہ کرے، کہتے ہیں کہ سینکڑوں عورتوں میں سے گورو ہرکشن نے فوراً ملکہ کی نشان دہی کر دی۔ اس ذہانت سے اورنگ زیب بہت خوش ہوا۔ بادشاہ نے گورو کو اس منصب کے لیے اہل قرار دیا۔ لیکن شومئی قسمت سے وہ گورو بننے کے تین سال بعد 14 مارچ 1664ء کو چیچک کے مرض سے انتقال کر گئے۔ دہلی میں جس جگہ گورو ہرکشن نے قیام کیا تھا وہاں بعد میں ایک گوردوارہ بنایا گیا جس کا نام 'گوردوارہ بنگلہ صاحب' ہے۔

گورو تیغ بہادر (1664ء تا 1675ء):

1664ء میں گورو ہر گوبند کا پانچویں لڑکا تیغ بہادر سکھوں کا نواں گورو مقرر ہوا۔ گورو ہر کشن نے ان کے آخری لمحات میں ان کے چیلوں کے استفسار کیا کہ آپ کے بعد ہمارا کون رہنما ہوگا؟ گورو نے سر جھکا دیا اور ناریل کے پانچ دانوں کو گنا اور جواب دیا کہ جاؤ تمہارا گورو دریائے بیاس کے کنارے گوندوال سے متصل موضع 'بکالا' میں اپنی والدہ کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ جب گورو ہر کشن کی وفات کے بعد سکھوں نے گورو کی بتائی ہوئی نشانیوں کی حامل شخصیت کی تلاش شروع کی تو وہ گورو ہر گوبند کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تیغ بہادر تھے۔ جو ان دنوں بکالا میں رہائش پذیر تھے۔ چنانچہ تیغ بہادر کو گورو تسلیم کر لیا گیا۔ تیغ بہادر نے گدی نشینی کے بعد کرتار پور میں ایک مضبوط اور وسیع قلعہ تعمیر کرایا اور شان و شوکت کی زندگی اختیار کی۔ تقریباً ایک ہزار سواروں پر مشتمل دستہ ہر وقت گورو کے جلو میں رہتا تھا۔ اس گورو سے متاثر ہو کر بہت سے مسلمان بھی سکھ مذہب میں داخل ہو گئے اور اس گروہ کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ گورو کے پیرو انہیں سچا بادشاہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ گورو ہر رائے کے بیٹے رام رائے نے جب یہ ٹاٹھ دیکھے تو حسد کرنے لگا اور اس نے بادشاہ اورنگ زیب سے شکایت کی کہ گورو گدی پر اس کا حق فائق ہے، جو اس سے زبردستی چھینا گیا ہے۔ اس لیے اس کی حق رسی کی جائے اس پر اورنگ زیب نے گورو تیغ بہادر کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا، لیکن بعض دوسرے مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ چونکہ گورو نے کشمیر میں برہمنوں کی بغاوت کے دوران ان کی مالی، اخلاقی اور فوجی امداد کی تھی۔ علاوہ ازیں پنجاب میں بھی ان کے پیروؤں نے لاقانونیت پھیلا رکھی تھی اور مسلمان رعایا ان کی متشددانہ کارروائیوں کا خاص طور پر نشانہ بنی تھی۔ اس لیے بادشاہ نے گورو کو سرزنش کے لیے دہلی بلایا بہر حال! گورو دہلی گئے لیکن جے پور کے مہاراجہ رام سنگھ نے سفارش کی اور گورو نے خود بھی آئندہ قانونی حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا وعدہ کیا

اور مستقبل میں بہتر طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضمانت دی تب کہیں اورنگ زیب نے ان کی جان بخشی کی اور انہیں ان کی ماضی کی معاندانہ سرگرمیوں پر معاف کردیا۔

اس واقعہ کے بعد گورو تیغ بہادر چند ماہ مہاراجہ رام سنگھ کے ہمراہ دہلی میں رہے۔ بعدازاں وہ 1666ء میں پٹنہ چلے گئے۔ گورو نے پٹنہ میں سکھ مت کی تعلیمات کے فروغ کے لیے ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی اور مسلسل چھ برس تک پٹنہ ہی میں مقیم رہے۔ یہیں ان کی بیوی 'گجری' کے بطن سے ایک فرزند پیدا ہوا۔ جس کا نام گوبند رکھا گیا اور یہ بعد میں سکھوں کے دسویں گورو ہوئے۔ گورو تیغ بہادر 1668ء میں راجا رام سنگھ کے ساتھ آسام اور بنگال گئے۔ بعدازاں جنوبی برصغیر کے تمام مقدس مقامات کی یاترا بھی کی اور 1668ء کے آخری دنوں میں پنجاب واپس آ گئے۔

گورو تیغ بہادر نے واپس پنجاب آ کر موضع انند پور میں رہائش اختیار کرلی۔ گورو نے راجا مادھو دیووالی کاہلر سے مبلغ پانچ صد روپیہ میں ایک قطعہ زمین حاصل کرکے ''سکھووال'' نامی گاؤں کی بنیاد رکھی۔ جو کرتار پور کے قریب دریائے ستلج کے کنارے واقعہ ہے۔ انند پور میں آباد ہونے کے بعد گورو تیغ بہادر دوبارہ مغل حکومت کے خلاف سرگرمِ عمل ہو گئے۔ جرائم پیشہ افراد اور مغلیہ افواج کے بھگوڑے فوجیوں کی بڑی تعداد نے تیغ بہادر کو اپنی پناہ گاہ خیال کرتے ہوئے ان کے گروہ میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔

گورو کی ان معاندانہ سرگرمیوں کی وجہ سے پنجاب میں قانون کی حکمرانی مفلوج اور امن وامان معدوم ہوگیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اس سرکشی اور باغیانہ رویہ سے تنگ آ کر دوبارہ تیغ بہادر کی گرفتاری کے احکامات صادر کردیے اور مغلیہ فوج کا ایک دستہ ان کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا اور خونریز معرکے کے بعد تیغ بہادر کو گرفتار کرلیا گیا۔ بعدازاں دہلی لے جا کر بادشاہ کے حضور پیش کردیا گیا۔ گورو نے دہلی روانہ ہونے سے قبل اپنے بیٹے گوبند سنگھ کو بتا دیا تاکہ اس دفعہ انہیں دہلی سے زندہ واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔ انہوں نے روانگی سے قبل اپنے اکلوتے بیٹے گوبند کو جانشین بھی مقرر کیا۔

گورو تیغ بہادر کی گرفتاری کے ضمن میں تواریخ میں ایک اور روایت بھی موجود ہے۔ یعنی اورنگ زیب نے کشمیر کے گورنر کو لکھا کہ غیر مسلموں کو بالجبر مذہب اسلام میں داخل کیا جائے۔ کشمیر کے گورنر نے اس حکم کی تعمیل میں سعی کی جس سے کشمیر کی غیر مسلم رعایا میں خوف وہراس پھیل گیا۔ چنانچہ کشمیری ہندوؤں کے رہنما بعض پنڈت گورو تیغ بہادر کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اورنگ زیب ہمارے دھرم کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس زمانے میں صرف آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے جو اس کی اس زیادتی کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کر سکتی ہے۔ لہٰذا گورو نے ان لوگوں کی ہر ممکن مدد کا تہیہ کر لیا اور اس غرض سے انہوں نے دہلی جا کر اورنگ زیب کو یہ احکام واپس لینے پر آمادہ کرنے کا ارادہ کیا۔ دہلی گئے، اورنگ زیب سے ملاقات کی اور اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس پر اورنگ زیب نے گورو کو بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جسے انہوں نے فوراً ہی مسترد کر دیا اور بجائے دلیل کے ساتھ بات کرنے کے اسلام کے خلاف اہانت آمیز کلمے استعمال کیے۔ اس پر اورنگ زیب نے انہیں کہا کہ اگر آپ سچے گورو ہیں تو اپنا کوئی معجزہ دکھائیں۔ لیکن گورو نے جواب دیا کہ ان کے پاس سوائے یادِ خدا اور صداقت کے کوئی معجزہ نہیں ہے۔ اس پر اورنگ زیب نے ان کو قید کر دینے کا حکم دیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد گورو نے خود ہی بادشاہ کو پیغام بھجوا دیا کہ میں اپنا معجزہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر نے ایک خاص تقریب کا اہتمام کیا۔ تمام عمائدینِ سلطنت اس تقریب میں بالالتزام حاضر ہوئے۔ گورو نے آ کر کہا کہ میں ایک ایسا منتر جانتا ہوں کہ اس کو کسی کاغذ پر لکھ کر گردن میں باندھ لیا جائے تو تلوار گردن کو زک نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ گورو نے وہ الفاظ کاغذ پر لکھ کر گردن میں تعویذ کی طرح باندھ لیا اور بادشاہ سے کہا کہ وہ جلاد کو تلوار آزمانے کا حکم دے تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو سکے۔ ان الفاظ نے تمام دربار کو متحرک کر دیا، لیکن جب جلاد نے تلوار کا وار کیا تو گورو تیغ بہادر کا سر تن سے جدا ہو کر دور فرش پر جا گرا۔ اس پر تمام اہلِ دربار مبہوت ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ بھی اس ناگہانی واقعہ سے پریشان ہو گیا۔ جب اس کاغذ کے پرزے کو کھول کر پڑھا گیا تو اس پر لکھا تھا:

"سر دیا پر سر نہ دیا"۔

تیغ بہادر کے قتل کے واقعہ نے سکھوں کے مرکزی تعلقات کو بہت زیادہ خراب کر دیا۔ پنجاب میں اس واقعے کا شدید ردِ عمل ہوا۔ ہندوؤں نے بھی گورو تیغ بہادر کے قتل کو اپنے مذہب کے خلاف اقدام قرار دیا اور سکھوں کے دوش بدوش اس احتجاج میں شامل ہو گئے۔ پنجاب میں غم وغصہ اور انتقام کی ایک آگ بھڑک اٹھی۔

گورو تیغ بہادر نے ساڑھے تیرہ برس سکھ پنتھ کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ دہلی میں ان کے قتل کا واقعہ 1675ء میں پیش آیا۔ جہاں ان کا سر کٹ کر گرا وہاں بعد میں سکھوں نے ایک عظیم الشان گوردوارہ تعمیر کیا جس کا نام سیس گنج ہے۔

گورو تیغ بہادر کے قتل کے سلسلے میں بعض تنگ نظر سکھ اور ہندو مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس قتل کا واحد سبب اورنگ زیب کی متشددانہ اور متعصبانہ مذہبی پالیسی تھی۔ حالانکہ اورنگ زیب جیسے نیک دل اور رعایا پرور بادشاہ پر یہ سراسر تہمت ہے۔ جہاں تک اس قتل کا تعلق ہے اس کا سب سے اہم اور بنیادی سبب خود گورو تیغ بہادر کی غیر دانش مندانہ پالیسی اور ان کے پنتھ کے شوریدہ سر عناصر کی سماج دشمن اور قانون شکن کارروائیاں ہیں۔ گورو نے خود ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس میں حکومت کے لیے اس انتہائی کارروائی کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ گورو کے چیلوں نے ایسی حرکتیں کیں جنہیں کوئی آئینی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ اورنگ زیب کی فراخدلی کا ایک ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ اس نے پہلی بار گورو کو محض تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اگر اورنگ زیب واقعی گورو کو قتل کرنے کے درپے تھا تو پہلی بار بھی اس کے پاس اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے ٹھوس جواز موجود تھا۔ اس قتل سے اورنگ زیب کی بربریت ثابت کرنے میں کوئی گنجائش نہیں۔

گورو گوبند سنگھ (1675ء تا 1708ء):

گورو گوبند سنگھ، گورو تیغ بہادر کے فرزند تھے۔ 1667ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔

مذہبی تعلیم وہاں کے ممتاز پنڈتوں سے حاصل کی۔ مختلف علوم وفنون کے علاوہ فنِ حرب میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ باپ کے بعد صرف نو سال کی عمر میں 1776ء میں گورو گدی پر رونق افروز ہوئے۔ اگر چہ ان کی عمر ابھی بہت کم تھی۔ لیکن ان کی دماغی صلاحیتیں اس بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے قابل تھیں۔ ان کی گدی نشینی کے وقت سکھ پنتھ اندرونی اور بیرونی طور پر بحران کا شکار تھا۔ اندرونی طور پر سکھ دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ جس سے ان کی طاقت منقسم ہوگئی اور وہ کمزور ہوگئے۔ بیرونی طور پر وہ اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کی وجہ سے مغل حکومت کے عتاب کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ان گوناگوں مشکلات کے عالم میں گورو گوبند نے ماضی کے تجربات اور حال کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر نہایت دانشمندی سے مستقبل کے لیے اپنی حکمتِ عملی وضع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے سکھ قوم میں اتحاد قائم کیا، جس سے سکھوں میں فکری ہم آہنگی پیدا ہوگئی اور مشترکہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ان میں زبردست جذبہ پیدا ہوگیا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ فی الحال وہ مغلوں کی منظم حکومت کا جو ایک برتر فوجی طاقت بھی رکھتی تھی، مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لیے میدان سے وقتی طور پسپائی پر ہی آئندہ نسلوں کی بقاء کا دارومدار ہے۔ گورو گوبند کا یہ فیصلہ سکھوں کی ملی جدوجہد میں سنگِ میل کی اہمیت رکھتا ہے اور مستقبل میں سکھوں نے اسی ترکیب پر زیادہ عمل کیا اور ان کی یہ دفاعی ترکیب ہر بار کامیاب رہی۔ اپنے اس دفاعی منصوبے پر عمل کرتے ہوئے گورو گوبند سنگھ نے انبالہ کے قریب سرمور کے پہاڑی سلسلے میں پناہ لی اور وقتی طور پر مغل حکومت کی دسترس سے باہر ہوگئے۔ وہ مسلسل بیس برس تک انہی پہاڑیوں میں حکومت کی مداخلت سے آزاد رہ کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خفیہ طور پر تیاریاں کرتے رہے۔ اپنے پیروؤں کو سخت کوش اور کٹھن زندگی کا عادی بنایا۔ انہیں فوجی تربیت حاصل کرنے کی تاکید کی اور ان میں عصبیت کا شدید جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ بیس سال کے عرصے میں گورو گوبند نے سکھ پنتھ کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ اب وہ کسی بھی طاقت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ ان کے لڑاکا جوانوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہوگئی، جو

انتہائی قسم کے مذہبی تعصب میں مبتلا تھے۔ اس تعصب نے ان کے جنگی جنون اور وحشت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا اور وہ اس عظیم مقصد کے لیے کھلی جدوجہد کرنے کے قابل ہو چکے تھے جس کے لیے گورو نے انہیں تیار کیا تھا۔

اسی دوران میں گورو گوبند نے اپنے پنتھ کو ہندوؤں اور مسلمانوں سے ممتاز کرنے کے لیے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ ''سنگھ'' کا اضافہ کرلیں۔ پانچ چیزیں جن کے نام 'ک' سے شروع ہوتے ہیں ہر وقت ہر سکھ کا جزوِ بدن ہونی چاہیں۔ (یعنی کیس، کڑا، کرپان، کنگھا اور کچھا، سکھوں کے ہاں ان پانچ چیزوں کو 'پانچ ککے' کہا جاتا ہے) اور تاکید کردی کہ کوئی سکھ اپنے جسم کے کسی حصے سے نہ تو بالوں کو منڈوائے اور نہ ہی توڑے۔ آپس میں ملاقات کے وقت وہ دعائیہ کلمات جو ہندو اور مسلمان استعمال کرتے تھے انہیں ترک کرنے کی ہدایت کی اور نئے کلمات تعلیم کیے۔ یعنی جب دو سکھ آپس میں ملیں تو ایک کہے، واہ جی گورو کا خالصہ اور دوسرا جواباً کہے کہ واہ گورو کی فتح۔ عبادت کے مخصوص طریقے بتائے۔ ان اقدامات کی وجہ سے یہ گروہ ہندوؤں اور مسلمانوں سے مکمل طور پر جداگانہ حیثیت اختیار کر گیا اور اپنی مخصوص عادات واطوار، رہن سہن اور چال ڈھال کی وجہ سے بالکل علیحدہ طور پر پہچانا جانے لگا۔

سکھوں کے اندرونی اتحاد کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے مساوات کے اصول کو عملی طور پر نافذ کیا۔ ہندو معاشرے کی چھوت چھات والی رسمِ بد کو سرے سے مسترد کر کے اعلان کیا کہ تمام سکھ آپس میں برابر ہیں۔ کوئی اعلیٰ اور کوئی ادنیٰ نہیں۔ بلکہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ سب کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت، ہمدردی اور احترام کے جذبے سے پیش آنا چاہیے۔ گورو کے اس اقدام کی وجہ سے تمام سکھ بالکل متحد ہو گئے۔ جس سے ان کی قوت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ عام معاشرتی اصلاح کے لیے شراب نوشی منع کر دی اور تمباکو نوشی کو بھی ممنوع قرار دیا اور دیگر معاشرتی برائیوں سے باز رہنے کی تاکید کی۔ اس طرح بیس سال کے بعد گورو گوبند سنگھ ایک منفرد اور مضبوط گروہ کے دینی اور دنیاوی پیشوا کی حیثیت سے مغل

حکومت کے مدِ مقابل آ کھڑے ہوئے اور سکھ ان کی بصیرت افروز اور ولولہ انگیز قیادت میں حکومت سے ٹکرانے کی طاقت رکھنے والے بن گئے۔ یوں بیس سال کے عرصہ میں انہوں نے سکھ قوم کی ٹھوس بنیادوں پر تنظیم کا کام مکمل کر لیا۔

اب انہوں نے جا بجا دفاعی قلعے تعمیر کرنے شروع کر دیے۔ سکرت میں ایک قلعہ بنوایا اور اس کے ارد گرد کی پہاڑیوں میں فوجی چوکیاں قائم کر دیں۔ پوٹھہ، جمکور، انند پور اور مکھوال میں قلعے تعمیر ہوئے۔

گورو گوبند سنگھ نے 1699ء میں بیساکھی کے موقع پر امرتسر میں سکھوں کے ایک گروہِ کثیر سے خطاب کیا، جس میں انہوں نے کہا کہ خدا نے مجھے بابا نانک کی روح کا حامل بنایا ہے اور اللہ سے میں نے دعا بھی یہی کی تھی کہ وہ مجھے نانک کے فیوض سے بہرہ مند کرے، تاکہ میں اسی روحانی قوت سے سکھوں کی آزادی کو محفوظ بنا سکوں۔ انہوں نے کہا اللہ نے میری دعا قبول کی اور نانک کے فیوض مجھے اس طرح حاصل ہوئے، جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے سکھ معاشرے میں اتحادِ عمل کے لیے مساوات کا درس دیا اور اس بات پر زور دیا کہ تمام سکھ آپس میں برابر ہیں اونچ نیچ کی موجودگی میں متحد الخیال معاشرہ کبھی بھی وجود میں نہیں آ سکتا اور نہ ہی وہ کسی عظیم مقصد کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ انہوں نے برہمنوں کے رویے کی شدید مذمت کی اور اپنے پیروؤں کو برہمنی سامراج کے خلاف کھلی بغاوت کی تلقین کی اور کہا کہ اس ظالم نظام کی علامت مقدس دھاگے کو توڑ دو۔ اس کے علاوہ انہوں نے کہا کہ قرآن اور پران وغیرہ سے اب استفادے کی ضرورت نہیں رہی۔ تمہاری ہدایت کے لیے ہر قسم کا مواد گرنتھ میں موجود ہے۔ اس موقع پر انہوں نے گورو کی شخصیت کی عظمت بھی بیّن کی اور کہا کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ گورو کی سچے دل سے پیروی ہے۔ گورو کے بغیر کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہوں نے پانچوں ککے اختیار کرنے پر بھی بہت زیادہ زور دیا اور کہا کہ یہی پانچ چیزیں تمہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

گورو گوبند سنگھ نے بعض برہمنوں اور پروہتوں کے اصرار پر درگا دیوی کے مندر حاضر ہونے کا فیصلہ کیا۔ ہندوؤں کا اعتقاد تھا کہ یہاں جو بھی دعا کی جائے وہ ضرور پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گورو گوبند نے وہاں جا کر درگا دیوی سے دعا کی کہ مجھے مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور عزم عطا ہو۔ دیوی نے گورو سے انسانی بھینٹ کا مطالبہ کیا۔ اس پر گورو نے اپنے چار لڑکوں میں سے ایک کو قربان کر دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جب گورو نے اپنی والدہ، ماتا گجری سے اجازت چاہی تو اس نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اب گورو نے اپنے چیلوں سے درگا دیوی کی بھینٹ کے لیے رضا کار مانگے۔ تا کہ سکھ پنتھ مسلمانوں کیخلاف درگا دیوی کی حمایت سے تقویت حاصل کر سکے۔ گورو نے جونہی یہ کہا فوراً پانچ سکھ آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ سکھوں میں پہل کی مذہبی اصطلاح اس واقعے کے بعد وجود میں آئی، جو آج بھی موجود ہے۔ گورو گوبند سنگھ نے اس جذبے سے متاثر ہو کر اپنے پیروؤں کو 'خالصہ' کے نام سے پکارا اور انہیں آئندہ بھی اسی نام سے پکارنے کی تلقین کی۔ جس کے معنی خالص، طاہر اور پاکیزہ کے ہیں۔

اب گورو گوبند سنگھ کے پاس کافی طاقت جمع ہو چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے مغل حکومت سے ٹکرانے کا فیصلہ کیا۔ تا کہ ان کے خیال میں اقلیتوں پر ظلم کرنے والی اس حکومت کو ختم کیا جا سکے۔ اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے انہوں نے 1685ء میں پہاڑی ریاستوں سے بھی تعاون کی درخواست کی۔ ان ریاستوں میں باہن، اندور، نالہ گڑھ اور کانگڑہ قابلِ ذکر ہیں۔ گورو نے ان راجاؤں کو 'دھرم کے تحفظ' کے لیے متحد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان راجوں نے گورو کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ جس پر گورو اور ان راجوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی اور اس کشیدگی کا نتیجہ مسلح تصادم کی صورت میں برآمد ہوا۔ راجوں نے گورو پر حملہ کیا لیکن گورو نے سکھوں کو اپنے اعلیٰ فوجی تدبر سے لڑایا اور فتح پائی۔ اس کے علاوہ گورو نے ذاتی شجاعت کے بھی مثالی جوہر دکھائے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس جنگ میں نالہ گڑھ کے راجا جے سنگھ کو دوبدو مقابلے میں اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ چنانچہ راجوں کا متحدہ لشکر شکست

کھا کر بھاگ گیا۔ اب اس تمام علاقے پر گورو کا تسلط ہو گیا۔ انہوں نے اس علاقے کو دفاعی لحاظ سے مزید مستحکم کرنے کے لیے انند گڑھ، فتح گڑھ میں بھی قلعے تعمیر کرائے۔ اس کے بعد بھی پہاڑی راجوں اور سکھوں کے مابین کئی معرکے ہوئے اور اکثر میں فتح گورو گوبند سنگھ ہی کو حاصل ہوئے۔ ان لڑائیوں میں سادات ساڈھورہ کے ایک بزرگ سید بدھو شاہ نے سکھوں کی بہت مدد کی تھی۔ سید بدھو شاہ سے گورو گوبند سنگھ کے نہایت پر خلوص اور گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ ان جنگوں میں سید بدھو شاہ نے گورو کی بڑھ چڑھ کر اعانت کی اور اس میں ان کے دولڑکے اور ہزاروں معتقد بھی قتل ہوئے چنانچہ آج تک سکھ سادات ساڈھورہ کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔

پہاڑی راجاؤں نے اپنی ان پے در پے شکستوں کے بعد جب اور کوئی چارہ کار نہ دیکھا تو مغل دربار سے کمک مانگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اورنگ زیب دکن میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ چنانچہ ابتداء میں تو وہ اس درخواست پر توجہ نہ دے سکا۔ لیکن بعد میں اس نے پنجاب کے حکام کو سکھوں کی سرگرمیوں کے سدِ باب کا حکم دیا۔ اسی اثناء میں کوہلر کے راجا بھیم چند نے گورو گوبند سنگھ کی حمایت کرتے ہوئے شاہی حکام کو سالانہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی کئی چھوٹے بڑے راجے حکومت کی اطاعت سے منحرف ہو گئے۔ گورو نے اپنے قلعوں کو مزید مضبوط کیا اور ان میں بڑی تعداد میں فوجی اور بھاری مقدار میں اسلحہ اور سامانِ خورد و نوش جمع کر لیا۔

جب اورنگزیب کو پنجاب کے ان حالات کا علم ہوا اور اسے یقین ہو گیا کہ گورو گوبند سنگھ کی خلافِ قانون سرگرمیاں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہیں تو اس نے لاہور کے حاکم زبردست خان اور سرہند کے حاکم شمس الدین خان کو گورو کے خلاف کارروائی کا حکم دیا۔ چنانچہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہوئیں۔ ابتدائی جھڑپوں میں تو سکھوں کو کامیابی ہوئی لیکن 1701ء میں انند پور اور نکھوالی کے معرکوں میں گورو کو شکست ہوئی اور وہ چمکور کے مستحکم قلعے میں محصور ہو گئے۔ مغل لشکر نے تعاقب کیا۔ یہاں بھی 1703ء میں بڑی

خونریز جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں گورو کے دو لڑکے اجیت سنگھ اور جوہر سنگھ بھی بڑی جوانمردی سے لڑتے ہوئے قتل ہوئے۔ خود گورو نے بھیس بدل کر محاصرے سے نکلنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے ساتھ ان کے بہت کم ساتھی جان بچا کر نکل سکے۔ ان کی والدہ ماتا گجری ان کے دو بیٹوں فتح سنگھ اور زور آور سنگھ کو اپنے ساتھ لے کر سرہند کی طرف چلی گئیں۔ جہاں گورو کے لڑکوں کو تو زندہ ہی دیوار میں چنوا دیا گیا، جبکہ ماتا گجری اس صدمے کی وجہ سے فوت ہو گئیں۔

چمکور سے بھاگنے کے بعد گورو گوبند سنگھ نے بہلول پور ضلع لدھیانہ میں اپنے فارسی کے استاد پیر محمد کے پاس پناہ لی۔ کچھ دن یہاں رہ کر وہ بٹھنڈہ کے نواح میں آ گئے۔ یہاں سکھ ان کے پاس پھر سے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس جگہ بھی انہوں نے زیادہ دیر قیام نہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر فیروز پور کے قریب ہی واقع ایک مقام مکتر میں قیام پذیر ہوئے۔ اب پھر ان کے پاس سکھوں کی بڑی تعداد اکٹھی ہو گئی۔ یہ تعداد ایک روایت کے مطابق بارہ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ان میں پیدل اور سوار دونوں قسم کے سپاہی شامل تھے۔ جب سرہند کے مغل گورنر کو گورو گوبند سنگھ کی اس زبردست تیاری کی اطلاع ملی تو اس نے سات ہزار مغل فوج گورو کی قوت کو منتشر کرنے کے لیے بھیجی۔ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مکتر میں ایک شدید جنگ ہوئی جس میں سکھ فتح یاب ہوئے۔ اس جنگ میں دونوں فوجوں کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ گورو گوبند سنگھ نے سکھ مقتولین کی یاد میں ایک وسیع تالاب عین اس جگہ بنوایا جہاں کہ جنگ ہوئی تھی۔ اس تالاب کے بارے میں سکھوں کا عقیدہ ہے کہ جو اس تالاب میں نہائے گا اس کو یقیناً نجات حاصل ہو گی۔ یہاں ہر سال پہلی ماگھ کو ایک عظیم میلہ منعقد ہوتا ہے۔

مکتر میں تھوڑا عرصہ مقیم رہنے کے بعد گورو گوبند سنگھ مالوہ چلے گئے اور وہاں انہوں نے کچھ وقت سیاسی ہنگامہ آرائی سے الگ رہ کر بسر کیا۔ یہ دن ان کی زندگی میں کافی پرسکون گنے جاتے ہیں۔ مالوہ میں انہوں نے اپنے رہنے کے لیے ایک تالاب بنوایا، جسے انہوں

نے دمدمہ کا نام دیا۔ سکھ اس جگہ کا بہت احترام کرتے ہیں۔ یہاں بھی ہر سال ایک بڑا میلہ منایا جاتا ہے۔ مالوہ میں مختصر قیام کے بعد گورو سرہند سے ہوتے ہوئے انند پور واپس آ گئے۔ یہ تمام عرصہ مغل دربار کے ساتھ سکھوں کے تعلقات نسبتاً پرامن رہے۔ یہیں پر شاہی قاصد گورو کے نام اورنگ زیب کا خط لایا۔ گورو نے قاصد کی بڑی تکریم کی انہوں نے بادشاہ کے خط کو بھی بڑی عقیدت سے وصول کیا۔ اس خط کا جواب انہوں نے ایک طویل فارسی نظم کی صورت میں دیا، جس کو ظفر نامہ کہا جاتا ہے۔ اس نظم میں چودہ سو اشعار ہیں۔ اپنے اس خط میں گورو گوبند سنگھ نے اورنگزیب کو یہ باور کرنے کی کوشش کی کہ ماضی میں جتنے ناخوشگوار واقعات ہوئے ان کی محض وجہ مغل حکام کا غیر مدبرانہ رویہ تھا۔ ہم سکھ تو اب بھی مغل اقتدار کے دل سے وفادار ہیں۔ اس خط کے ساتھ ہی گورو نے اپنے ایک معتمد مصاحب، بھائی دیا سنگھ کو روانہ کیا۔ گورو کے اس طرزِ عمل سے اورنگ زیب مطمئن ہو گیا اور اس نے خیر سگالی کے جذبے کے تحت گورو کو دکن بلایا۔ چنانچہ گورو دکن کے لیے روانہ ہو گئے لیکن ان کی بادشاہ کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ گورو گوبند سنگھ کو راستے ہی میں اطلاع ملی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ گورو گوبند سنگھ کو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کی خبر (راجپوتانہ) کے مقام پر ملی تو انہوں نے سفر جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آ گئے۔ واپسی پر جب وہ دہلی کے قریب تھے تو ان کی ملاقات شہزادہ محمد معظم سے ہوئی جو اس وقت شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر چکا تھا۔ اس نے گورو سے درخواست کی کہ وہ تخت کے دوسرے دعویدار کے مقابلے میں اس کی حمایت کریں۔ چنانچہ گورو گوبند شہزادہ اعظم کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے یہ جنگ جون 1707ء میں آگرے کے قریب جاجو کے مقام پر لڑی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادہ اعظم گورو گوبند ہی کے تیر سے گھائل ہوا تھا۔ گورو کے ان کارناموں کی وجہ سے شاہ عالم بہادر شاہ بہت خوش ہوا اور گورو کو باقاعدہ ملازمت میں لے لیا اور انہیں خلعتیں دیں اور قابلِ قدر انعامات اور تحائف سے نوازا۔ اس دوران میں گورو کی بادشاہ کے ساتھ سکھوں کے مسئلے پر اکثر گفتگو ہوتی۔ لیکن

ابھی اس گفتگو کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا تھا کہ بادشاہ کو نومبر 1707ء میں راجپوتانے کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے جانا پڑا اور وہاں سے وہ اپنے سب سے چھوٹے بھائی کام بخش کی گوشمالی کے لیے دکن چلا گیا۔ یہ تمام عرصہ گورو گوبند بھی بادشاہ کے ہمرکاب رہے۔ دکن پہنچ کر جب انہیں بادشاہ کی طرف سے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تو وہ شاہی لشکر سے الگ ہو گئے اور دریائے راوی کے کنارے ایک گاؤں ناندیر میں قیام پذیر ہو گئے۔

گورو گوبند سنگھ نے زندگی کے باقی ایام دکن ہی میں گزارے۔ دکن میں قیام کے دوران میں ایک پٹھان، جس کا باپ کسی وجہ سے گورو کے ہاتھوں قتل ہوا تھا، نے اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے ایک دن موقع پا کر تنہائی میں گورو پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ اس حملے سے اگرچہ گورو فوراً تو ہلاک نہ ہوئے لیکن بالآخر یہی زخمی جان لیوا ثابت ہوا۔

یہ حادثہ ناندیر ہی میں اکتوبر 1708ء میں رونما ہوا۔ مرنے سے پیشتر گورو نے اپنے ایک جانثار چیلے بندہ بیراگی کو اپنے بعد سکھ قوم کی رہنمائی کے لیے نامزد کیا، لیکن یہ کہہ دیا کہ میرے بعد گورو کوئی نہیں ہوگا۔ اب گرنتھ ہی سکھوں کے لیے ایک مستقل ذریعہ ہدایت ہے۔ سکھوں کو چاہیے کہ آئندہ اس سے راہنمائی حاصل کریں۔ اس کے ساتھ ہی گورو نے بندہ بیراگی کو اپنے اس پیغام کے ساتھ پنجاب کی طرف روانہ کیا کہ تمام سکھوں کو اس کے ساتھ مکمل تعاون کرنا چاہیے اور اس کی ہر بات کو میری بات کی طرح قابلِ عمل سمجھنا چاہیے۔

بندہ سنگھ بہادر بیراگی:

بندہ بیراگی کا اصل نام لچھمن دیو تھا۔ اس کے والد کا نام رام دیو، یہ راجوڑی (کشمیر) میں 27 اکتوبر 1670ء کو پیدا ہوا۔ راجپوت نسل کے ایک کاشتکار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لچھمن دیو کو بچپن ہی سے سیر و شکار کا بہت شوق تھا۔ اگرچہ اسے پڑھنے لکھنے کی طرف بھی رغبت تھی مگر وہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ کیونکہ اس زمانے میں پڑھنا لکھنا صرف برہمنوں تک ہی محدود تھا۔ کمتر ذاتوں کے ہندو فطری میلان کے باوجود بھی علم سے محروم

رہتے تھے اور کشمیر میں تو خاص طور پر یہ صورت پوری شدت کے ساتھ کارفرما تھی۔ چنانچہ
لچھمن دیو کا بچپن بھی مدرسے کی بجائے محض کھیل کود ہی میں بسر ہوا۔ اس کا بیشتر وقت کھیتی
باڑی اور شکار میں صرف ہوتا۔ جنگی کھیلوں اسے سب سے زیادہ دلچسپی گھڑسواری اور تیر
اندازی سے تھی۔ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اس کے
لا ابالی خیالات میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی۔ ایک دن اس نے ایک ہرنی پر تیر چلایا۔
تیر نشانے پر لگا اور ہرنی گر گئی۔ جب لچھمن دیو ہرنی کے قریب پہنچا تو ہرنی نے اس کی طرف
عجیب رحم طلب نظروں سے دیکھا، جس سے اس کا دل بہت متاثر ہوا۔ لیکن اس سے بھی
بڑھ کر دردناک منظر وہ تھا، جب اس نے ہرنی کا پیٹ چاک کیا اور دو چھوٹے چھوٹے بچے
برآمد ہوئے۔ یہ منظر دیکھ کر اسے اپنے شکار کے شوق سے نفرت ہوگئی۔ اس نے دنیا ترک
کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لی اور گھربار چھوڑ کر سادھوؤں اور جوگیوں کی صحبت اختیار
کی۔ اس وقت اس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔

انہی دنوں راجوڑی ہی میں اس کی ملاقات ایک بیراگی جانکی پرشاد (Janaki Parshad)
سے ہوئی۔ لچھمن دیو اس کے خیالات اور کمالات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے گروہ میں
شامل ہوگیا۔ جانکی پرشاد نے اس کا نام مادھوداس رکھا۔ اب مادھوداس بیراگیوں کے اس
جتھے کے ساتھ ساتھ گھومتا پھرا۔ 1686ء میں اس نے بیساکھی کے موقعے پر قصور کے قریب
بابا رام تھمن کی سادھ پر منعقد میلے میں شرکت کی۔ یہاں وہ ایک اور بیراگی رام داس کے
حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا اور سادھوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ مل کر سیاحت کے لیے
نکل کھڑا ہوا۔ وہ بہت جگہوں پر گیا۔ ہندوستان کے اکثر مقدس مقامات دیکھے۔ کچھ عرصہ
اسی طرح گھومنے کے بعد وہ ناسک (Nasik) پہنچا اور پنچ بتی (Panch Bati) کے
جنگلات میں مقیم ہوگیا۔ جہاں اس کا قیام کئی سال تک رہا۔ یہ جگہ اپنے پرسکون ماحول اور
خوبصورت مناظر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ یہ جنگل ہندوؤں کی دو اہم ترین
مذہبی شخصیتوں یعنی رام اور سیتا سے بھی منسوب ہے۔ یہیں پر مادھوداس کی ملاقات ایک

بوڑھے جوگی آ گرناتھ سے ہوئی جو یوگا کا بہت ماہر تھا۔ مادھوداس اس کا چیلا بن گیا اور آہستہ آہستہ اسے اس علم کے بیشتر اسرار بتا دیئے تھوڑے ہی عرصے میں مادھوداس ایک معروف یوگی کی حیثیت سے شہرت حاصل کر گیا۔ اسے اس حد تک اپنے استاد کا اعتماد حاصل تھا کہ آ گرناتھ نے اسے ہی ترکے کا وارث قرار دیا۔ یہ ترکہ یوگا سے متعلق نایاب کتابوں پر مشتمل تھا۔ 92-1691ء میں آ گرناتھ کا انتقال ہوا اور مادھوداس ہی اس کا جانشین ہوا۔ بعدازاں وہ پنج بٹی سے ناندیر میں آ گیا، جہاں اس نے اپنی ایک باقاعدہ خانقاہ کا آغاز کیا اور یوگا کے کچھ مافوق الفطرت مظاہرے کر کے وہاں کے سادہ لوح عوام پر اپنی دھاک بٹھا دی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کے معتقدین کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ جب اس کا حلقۂ ارادت بہت وسیع ہو گیا تو اس کے دماغ میں فتور آ گیا۔ اپنے سوا وہ کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ اس کے پاس حاضر ہونے والوں کو اکثر اس کے سخت وست کلمات اور غیر مہذب رویہ کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

جس زمانے میں ناندیر اور اس کے گردونواح میں مادھوداس بیراگی کی دھوم دھام تھی انہی دنوں گورو گوبند سنگھ وہاں پہنچے۔ گورو گوبند سنگھ اس وقت دکن میں شاہ عالم بہادر شاہ کی معیت میں شہزادہ کام بخش کی بغاوت سے فرو کرنے میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے بادشاہ مغل حکومت اور سکھ پنتھ کے آپس میں مستقبل کے تعلقات پر بھی مذاکرات ہو رہے تھے۔ لیکن جب مذاکرات تسلی بخش طور پر کامیاب نہ ہوئے تو گوبند سنگھ شاہی لشکر سے علیحدہ ہو کر اپنے چند ساتھیوں کو لے کر ناندیر میں آ گئے۔ یہاں جب انہوں نے مادھوداس بیراگی کا شہرہ سنا تو اسے ملنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک دن گورو داس سے ملنے کے لیے اس کی جھونپڑی میں گئے لیکن وہ وہاں موجود نہ تھا۔ گورو داس کی جھونپڑی میں رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگے اور گورو کے ہمراہی سکھوں نے کھانے کا بندوبست شروع کر دیا۔ مادھوداس بیراگی کے آدمیوں نے ان دونوں باتوں کا برا منایا۔ انہوں نے گورو کے چارپائی پر بیٹھنے کو اپنے گورو کے مذہبی اختیارات پر حملہ تصور کیا۔ چنانچہ جب مادھوداس

واپس آیا تو ایک اجنبی کو اپنی چارپائی پر بیٹھے دیکھ کر بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے اپنے علم کے زور پر چارپائی کو الٹنے کی کئی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوا۔ اس پر اسے احساس ہوا کہ بغیر اجازت چارپائی پر بیٹھنے والا مجھ سے زیادہ قوتوں کا مالک ہے اور فوراً گورو کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی سیادت کا اعتراف کر کے ان کا چیلا بن گیا۔ اب اس نے اپنے آپ کو گورو گوبند کا بندہ (غلام) کہلانا شروع کر دیا اور اسی لیے وہ بعد میں بندہ بیراگی کے نام سے مشہور ہوا۔ گوگوبند سنگھ بہت بڑے مردم شناس تھے۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ میرے بعد سکھ پنتھ کی قیادت کے لیے بندہ ہی سب سے زیادہ موزوں شخص ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی تربیت اسی نقطہ نظر سے شروع کی۔ گورو نے اسے اپنے خاندان پر مغل حکومت کی طرف سے کیے گئے تمام مظالم تفصیل سے بتائے۔ یعنی گورو ارجن، گورو ہرگوبند اور گورو تیغ بہادر پر حکومت کی زیادتیوں کا اور گورو گوبند سنگھ کے اپنے دو بچوں کے سرہند میں بہیمانہ قتل کے واقعات سنا کر بندہ بیراگی کو مغلوں کے خلاف انتقامی جدوجہد کرنے پر آمادہ کر دیا۔ ان واقعات کو سن کر بندہ بیراگی نے حکومت سے بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے بعد چند دن بعد گورو گوبند سنگھ پر ناندیڑ میں قاتلانہ حملہ ہوا تو انہوں نے بندہ بیراگی کو اپنے پاس بلا کر اسے اپنا جانشین نامزد کیا۔ اپنے ترکش سے پانچ تیر اسے فتح کی علامت کے طور پر دیئے۔ ''بہادر'' کا خطاب عطا فرمایا اور اپنے پانچ معتمد ترین افراد بنود سنگھ، کاہن سنگھ، باج سنگھ، دیا سنگھ اور ارن سنگھ کو اس کی اعانت پر مقرر کیا۔ سکھوں کی تاریخ میں سب سے پہلے ان پانچ افراد کو پنج پیارے کہا گیا اور بعد میں اصطلاح مستقل صورت اختیار کر گئی اور ہر دور میں پانچ افراد ہی پنتھ کے انتظامی اور مذہبی سربراہ رہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد گورو فوت ہو گئے اور بندہ بیراگی پنجاب کی طرف روانہ ہو گا۔

جب بندہ بیراگی دکن سے چلا تو اس کی مالی حالت بہت دگرگوں تھی۔ اس کے پاس اخراجات کے لیے رقم نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن پھر بھی وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے نکل کھڑا ہوا۔ چنانچہ اس کی مالی پریشانی بھی زیادہ دن تک باقی نہ رہی، کیونکہ جب وہ بھرت پور

کے قریب پہنچا تو اتفاقاً اسے ایک سکھ مل گیا جو دسوندھ کی ایک بہت بڑی رقم گورو کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس نے وہ سارا روپیہ بندہ بیراگی کے حوالے کر دیا۔ جس سے بندہ کی مالی حالت بہتر ہوگئی اور بقیہ سفر قدرے اطمینان سے کٹا۔ وہ دہلی کے قریب پہنچا تو اس نے محتاط ہو کر راستہ طے کرنا شروع کر دیا۔ وہ ابتداء ہی میں حکومت کے ساتھ تصادم نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ ابھی اس کی طاقت بہت کم تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ راستے میں ہر جگہ اپنا تعارف گورو گوبند کے نائب کی حیثیت سے کراتا تھا۔ جس سے گورو گوبند سنگھ کے ماننے والے اس کا بہت احترام کرتے اور اکثر اس کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ اس لیے حکومت اس کے بارے میں خبردار ہوگئی تھی اور اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ لہٰذا وہ کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتا تھا جس سے حکومت کو اس کے خلاف کارروائی کا بہانہ مل سکے۔ جوں جوں وہ پنجاب کے قریب پہنچتا گیا۔ اس کے ہمراہیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے پاس روپیہ اور اسلحہ جمع ہونا شروع ہوگیا۔ اب تو اس نے اپنے پاس حاضر ہونے والے ہر شخص کو ایک ایک اشرفی انعام دینا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس کے پنجاب پہنچنے سے پہلے ہی اس کی سخاوت اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہونے کے افسانے پنجاب کے عوام میں عام ہوگئے۔ پنجاب اور دوسرے علاقوں کے سکھ جو حکومت کے مظالم پر ابھی تک قیادت کے فقدان کے باعث خاموش تھے، ان میں بھی اب بندہ بیراگی کی آمد کی وجہ سے حرارت پیدا ہوگئی اور انہوں نے مغل حکام سے بدلہ لینے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا اور خاص طور سے گورو گوبند سنگھ کے بچوں کے قتل نے ان کے غم و غصے میں بہت اضافہ کر دیا تھا، جس کے اظہار کا اب موقع آ چکا تھا۔ جب بندہ سنگھ بیراگی کھر کھانڈا کے پرگنے میں پہنچا تو اس نے سہری اور کھانڈا کے قصبوں کے نزدیک خالصہ افواج کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے تقرر کا باقاعدہ اعلان کیا۔ یہیں سے اس نے مالوہ دوآبہ اور ماجھہ کے علاقوں کے سربرآوردہ سکھوں کو اپنے بارے میں گورو گوبند سنگھ کے لکھے ہوئے خط بھیجے۔ اس کے علاوہ دکن سے اس کے آنے والے پانچ مقتدر ترین سکھوں یعنی پنج پیاروں نے بھی

ہر طرف بے شمار خط لکھے جن میں سکھوں سے بندہ بیراگی کے ساتھ مکمل تعاون کرنے کو کہا گیا تھا تا کہ سرہند کے حاکم وزیر خان اور اس کے ظالم ہندو پیش کار سچا نند سے، گورو زادوں پر ان کے مظالم کا بدلہ لیا جا سکے۔ ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور ہر طرف سے سکھوں کے جتھے اپنے ساتھ ضروری سامان لے کر بندہ کے لشکر میں شمولیت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ جب پنجاب کے طول و عرض میں سکھوں کی نقل و حرکت شروع ہوگئی تو حکومت کو بھی حالات کی نزاکت کا احساس ہوا۔ تمام علاقوں کے حاکموں کو ہدایت کر دی گئی کہ سڑکوں اور دریا کے گھاٹوں کی نگرانی سخت کر دی جائے اور کوئی سکھ بندہ سنگھ تک پہنچنے نہ پائے لیکن ان تمام انتظامات کے باوجود بہت سے سکھ مختلف راستوں سے بچ بچا کر بندہ سنگھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کے آنے کے بعد بندہ سنگھ کے پاس خوراک اور اسلحے کی کمی نہ رہی، کیونکہ وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لائے تھے۔ انہی دنوں میں بندہ بیراگی کو اطلاع ملی کہ ماجھا اور دوآبہ کے سکھوں کی ایک بہت بڑی جماعت دریائے ستلج عبور کرنے کے لیے کیرت پور کی پہاڑیوں میں موجود ہے، لیکن حکومت کی ناکہ بندی کی وجہ سے اب تک دریا عبور نہیں کر سکے۔ یہ اطلاع ملنے پر اس نے ان سکھوں کو پیغام بھیجا کہ وہ فی الحال وہیں رکے رہیں اور آئندہ حکم کا انتظار کریں۔

چند مہینوں میں بندہ سنگھ کے پاس ایک بڑا لشکر اکٹھا ہو گیا۔ اب وہ کھانڈا سے چلا اور معمولی مقابلے کے بعد سونی پت پر قبضہ کر کے وہاں کے فوجدار کو مار بھگایا۔ سونی پت میں اسے معلوم ہوا کہ مغل فوج کا ایک دستہ شاہی خزانہ لیے دہلی جا رہا ہے اور اس وقت کیتھل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ چنانچہ بندہ نے فوراً اس دستے پر حملہ کر کے اس سے خزانہ چھین لیا۔ اس کیتھل کے ہندو عامل نے سکھوں پر جوابی حملہ کیا لیکن ناکام ہوا اور گرفتار کر لیا گیا اسے اس شرط پر رہائی ملی کہ وہ اپنے پاس موجود تمام گھوڑے سکھوں کے حوالے کر دے اور اسے بدستور وہاں عامل رہنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ بشرطیکہ وہ آئندہ سکھوں کو خراج ادا کرے گا۔ بندہ نے ان فتوحات میں حاصل ہونے والا تمام مال غنیمت فوراً اپنے سپاہیوں

میں تقسیم کر کے ان کے دل جیت لیے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش وخروش سے اس کا ساتھ دینے لگے۔

ان ابتدائی کامیابیوں کے بعد سکھوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور اب انہوں نے نسبتاً بڑے مقام یعنی سامانہ پر حملہ کیا۔ اس شہر پر سکھوں کے حملے کی ایک بڑی وجہ اس شہر سے سکھوں کی نفرت بھی تھی۔ کیونکہ گورو تیغ بہادر کا قاتل، سید جلال الدین اور گورو گوبند سنگھ کے لڑکوں کے قاتل اسی شہر میں آباد تھے۔ دوسرے اس شہر میں زیادہ تر تجارت پیشہ مسلمان رہتے تھے جن کے مال و دولت کی فراوانی کا حال سکھ سن چکے تھے۔ یہاں کے مسلمان حاکم کو جب سکھوں کے ان ارادوں کی خبر ملی تو اس نے اس پر حقیقی توجہ نہ دی کیونکہ اسے شہر پناہ کی مضبوطی پر بھروسہ تھا۔ اس کے علاوہ عمائدینِ شہر نے بھی اپنے مکان قلعہ نما بنا رکھے تھے۔ اس لیے سب کو یقین تھا کہ سکھ شہر کو تسخیر نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جب 26 نومبر 1709ء کو سکھوں نے حملہ کیا تو مسلمانوں کی بہادرانہ مدافعت کے باوجود وہ شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور قبضے کے بعد انہوں نے یہاں اپنی غارت گری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا ان کا مال و اسباب لوٹ لیا اور ان کے مکانوں کو آگ لگا دی۔ ایک اندازے کے مطابق دس ہزار انسان قتل ہوئے۔ غرض صرف ایک دن میں سامانہ کے خوبصورت شہر پر موت کا مہیب سناٹا چھا گیا۔ بندہ بیراگی نے اپنے ایک بہت ہی قریبی ساتھی فتح سنگھ کو یہاں کا عامل مقرر کیا اور آس پاس کے نو پرگنے بھی اس کے ماتحت کر دیئے۔ فتح سنگھ اب تک کے تمام معرکوں میں شریک رہا تھا۔ اس نے بہادری کے خصوصی جوہر دکھائے تھے۔ سامانہ کی فتح کو مؤرخین نے حکومت کے خلاف بندہ بیراگی کی پہلی باقاعدہ فتح سے تعبیر کیا ہے۔

اب بندہ بیراگی مزید کسی تاخیر کے بغیر سرہند پر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر اس نے سوچا کہ ابھی اس کے پاس اتنی قوت نہیں کہ سرہند کو فتح کر سکے۔ دوسری طرف سرہند کے حاکم وزیر خان نے بھی دفاعی تدابیر اختیار کر لیں تھیں۔ اس کے پاس بڑی تعداد میں بھاری توپیں

تھیں جو اس نے قلعے کے برجوں پر چڑھا دیں۔ فصیل کی مرمت کرادی اور ایک بڑی فوج جمع کر کے سکھوں کے متوقع حملے کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر بندہ بیراگی اپنی قوت میں اضافہ کرنے کی تدابیر سوچ رہا تھا اور اسے مسئلے کا یہی حال نظر آیا کہ جب تک ماجھہ اور دوآبہ کے سکھ نہیں آ جاتے، سرہند پر کامیابی ناممکن ہے۔ یہ سکھ ستلج کے دوسرے کنارے پر کب سے آئے بیٹھے تھے۔ لیکن شاہی فوج دریا عبور کرنے میں مانع تھی۔ اس کے علاوہ سکھوں کی اعلیٰ انتظامی مجلس کے ارکان جنہیں پنج پیارے کہا جاتا ہے، بھی ماجھہ کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی فطری خواہش تھی کہ ان کے علاقے کے سکھ بھی اس مقدس مذہبی جنگ میں شرکت کریں گے۔ ان باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بندہ سنگھ نے فیصلہ کیا کہ پہلے ان سکھوں کو دریا عبور کرنے میں مدد کرنی چاہیے چنانچہ اس نے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ کچھ راستہ تو سکون سے طے ہوا اور کسی طرف سے کوئی قابلِ ذکر مزاحمت نہ ہوئی۔ اس کے باوجود بندہ بیراگی نے راستے میں آنے والے تمام اہم قصبوں کو خوب لوٹا۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: گورام، مصطفیٰ آباد، کپوری اور ساڈورہ۔ بندہ سنگھ جہاں بھی پہنچا اس نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ اس کی پیش قدمی کی وجہ سے حکومت کی توجہ بٹ گئی اور اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دریائے ستلج کے دوسرے کنارے پر رکے ہوئے شمالی علاقوں کے سکھوں نے موقع پا کر دریا عبور کر لیا اور جنوب کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جب کہ بندہ شمال کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب اسے سکھوں کے دریا عبور کرنے کی خبر ملی تو وہ بہت خوش ہوا۔

ماجھہ اور دوآبہ کے سکھوں نے جونہی دریا عبور کیا، سرہند کے حکمران وزیر خان کے اندیشوں میں اضافہ ہو گیا۔ اب اس نے ساری توجہ اس بات پر مبذول کر دی کہ سکھوں کے دونوں گروہ آپس میں نہ مل سکیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے ملیر کوٹلہ کے حکمران شیر محمد خان کو حکم دیا کہ شمالی علاقوں سے آنے والے سکھوں کو روکے۔ شیر خان نے فوراً اپنے بھائی خضر خان اور اپنے دو چچا زاد بھائیوں نشتر خان اور ولی محمد کو ساتھ لیا اور ایک بڑی فوج کی

معیت میں تیز رفتاری سے روانہ ہوا۔ سرہند سے آیا ہوا ایک دستہ جس کے پاس دو بڑی توپیں بھی تھیں، اس کے ہمراہ تھا۔ روپڑ کے مقام پر ماجھہ اور دوآبہ کے سکھوں اور سرکاری فوج میں جنگ ہوئی۔ سرکاری فوج کو سروسامان کے لحاظ سے خاصی برتری حاصل تھی لیکن باوجود قلتِ تعداد کے سکھ شدید مذہبی جنون کے ساتھ لڑے، مکمل ایک دن تک جنگ ہوئی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن پھر مقابلہ شروع ہوا اور طرفین جم کر لڑے، لڑائی پورے جوش وخروش سے جاری تھی کہ خضر خان کو ایک تیر لگا اور وہ گھوڑے سے گر گیا۔ اس کے گرتے ہی مغل فوج حوصلہ ہار بیٹھی۔ شیر محمد خان نے فوج کو ثابت قدم رکھنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا تمام لشکر میدان سے بھاگ چکا تھا۔ سکھوں نے تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے دشمن کا تعاقب نہ کیا۔ انہوں نے فوراً مسلمانوں کا چھوڑا ہوا تمام اسلحہ، گولہ بارود اور سامانِ خورد ونوش اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس جنگ میں فتح کے بعد سکھوں کی حالت بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ وہ جلد ہی یہاں سے چل دیے۔ اس وقت بندہ بیراگی کھارار اور بنور کے درمیان ایک مقام پر خیمہ زن تھا۔ چنانچہ ماجھہ اور دوآبہ کے سکھ جب اس کے مستقر کے قریب پہنچے تو اس نے کئی میل آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ ان کے آنے پر بہت خوشی منائی گئی اور کڑاہ پرشاد کا زبردست اہتمام کیا گیا۔ ان سکھوں کی آمد سے بندہ بیراگی کی اطاعت میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے فوراً سرہند پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیاریاں مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ سرہند کی طرف پیش قدمی کر دی۔ اس کے لشکر کی تعداد مؤرخین نے چالیس ہزار سے اسی ہزار تک بیان کی ہے۔ ان میں حقیقی سکھ اتنے زیادہ نہیں تھے بلکہ بیشتر تعداد ان لوگوں کی تھی جو محض مالِ غنیمت میں حصہ دار بننے کے لیے بندہ بیراگی کے ہمرکاب ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستان بھر کے تقریباً تمام پیشہ ور ڈاکو اور رہزن بھی اس کی فوج میں لوٹ مار کی غرض سے شریک ہو گئے تھے۔

جب سکھوں کے آنے کی اطلاع سرہند میں نواب وزیر خان کو ملی تو اس نے ممکنہ حد

تک فوج جمع کی اور مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس کی فوج کی زیادہ سے زیادہ تعداد پندرہ ہزار بتائی جاتی ہے۔ سرہند سے کچھ فاصلے پر واقع چاڈر کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ سکھوں نے بڑی شدت سے حملہ کیا جس کا مسلمانوں نے بڑی جرأت سے دفاع کیا۔ گھمسان کے معرکے ہوئے اور سکھ بتدریج اپنی عددی برتری کی وجہ سے غالب آنے لگے۔ اچانک مسلمان فوج کا سالار وزیر خان قتل ہو گیا اور وہ پسپا ہونے لگے۔ اس پر سکھوں نے ایک زوردار حملہ کر کے اپنی کامیابی مکمل کر لی۔ مسلمان سرہند شہر کی طرف بھاگ گئے۔ سکھوں نے ان کا تعاقب کیا اور معمولی مزاحمت کے بعد شہر پر قابض ہو گئے۔ شہر پر قبضہ کرتے ہی سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ان کا تمام مال واسباب لوٹ لیا گیا۔ سرہند میں سکھوں نے مسلمانوں پر ایسے مظالم ڈھائے جن کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ پہلے تو مردوں کو مختلف ظالمانہ اذیتیں دے کر قتل کیا اور ان کے بعد عورتوں کو بھی قتل کر دیا۔ بچوں تک کو نہ بخشا گیا اور وہ بھی ان کے انتقام کا نشانہ بن گئے سکھوں نے حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کیے اور بچے زمین پر پٹخ دیے۔ ان کے بعد انہوں نے عام غارت گری شروع کی۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں سے بندہ بیراگی کو دو کروڑ روپیہ مالِ غنیمت کے طور پر ملا۔ فوجیوں کا حصہ اس کے علاوہ ہے۔

سرہند کی فتح سکھوں کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ جنگ انہوں نے ''گورگھر'' پر حکومت کے مظالم کا بدلہ لینے کے لیے لڑی تھی۔ یہ حکومت کے ساتھ ان کا پہلا اہم تصادم تھا۔ اس میں کامیابی کے بعد سکھوں کی خود اعتمادی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور اب ان کی چیرہ دستیاں بہت بڑھ گئیں۔ اس جنگ میں انہیں بہت بڑی مقدار میں جنس کی صورت میں مالِ غنیمت بھی ملا تھا۔ جس نے ان کی مالی مشکلات کو ختم کر دیا اور وہ اقتصادی لحاظ سے آسودہ ہو گئے۔ قبضے کے بعد سکھوں نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ جو بہیمانہ برتاؤ کیا اس کی وجہ سے آس پاس کے علاقوں پر ہیبت طاری ہو گئی۔ چنانچہ اس فتح کے بعد انہوں نے جدھر کا رخ بھی کیا، ان کی بہت کم مزاحمت کی گئی اور باشندے تو ان کی آمد سے

پہلے ہی نسبتاً محفوظ علاقوں کی طرف بھاگ جاتے۔ بندہ بیراگی نے دکن سے ساتھ آنے والے اپنے ایک مخلص دوست باج سنگھ کو سرہند کا گورنر مقرر کیا اور شیر سنگھ کو اس کا نائب۔ علاوہ ازیں اس نے باج سنگھ کو سامانہ کا حاکم مقرر کر چکا تھا۔ اب اس نے پہلے تو سرہند کو اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بعدازاں اس نے اس خیال کے تحت سرہند کے بجائے مخلص پور کو اپنا مرکز بنایا کہ سرہند میدانی علاقے میں شاہراہ اعظم پر واقع ہونے کی وجہ سے حکومت کی جوابی کارروائی کی صورت میں غیر محفوظ تھا۔ جب کہ مخلص پور ہمالیہ کے دشوار گزار پہاڑی سلسلے میں مواصلاتی نظام سے الگ تھلگ واقع ہونے کے باعث بندہ سنگھ کے مقاصد کے لیے نہایت موزوں تھا۔ یہ جگہ ساڈھورہ اور ناہن کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ مخلص پور کا قلعہ شاہجہاں کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا اور امتدادِ زمانہ سے اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ بندہ بیراگی نے اس کی مرمت کرائی۔ اس نے اس جگہ کا نام 'لوہ گڑھ' رکھا۔ مرمت کا کام مکمل ہونے کے بعد بندہ بیراگی سرہند سے یہاں منتقل ہو گیا اور مختلف معرکوں سے اب تک جس قدر مالِ غنیمت اکٹھا ہوا تھا، وہ بھی اس نے یہاں جمع کر لیا۔ اب لوہ گڑھ کی حیثیت سکھ مقبوضات کے صدر مقام کی ہو گئی۔

اس وقت تک سکھ ایک خاصے بڑے رقبے پر قبضہ کر چکے تھے۔ یعنی ایک طرف ساڈھورہ سے لے کر رائے کوٹ تک اور دوسری طرف ملیر کوٹلہ اور لدھیانہ سے لے کر کرنال تک۔ بندہ سنگھ بیراگی خود تو لوہ گڑھ میں مقیم ہو گیا۔ اس نے اپنے معتمد ساتھیوں کو نائب بنا کر مختلف علاقوں میں تعینات کر کے محض اپنے دبدبے کی بنیاد پر حکومت کرنی شروع کی اور اس پورے علاقے میں کوئی اس کی مزاحمت کرنے والا باقی نہ رہا۔ بندہ بیراگی نے برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے مغلوں کے رائج کردہ زمینداری نظام کو یکسر ختم کر دیا۔ اس قانون کا سب سے زیادہ فائدہ سکھوں کو حاصل ہوا۔ کیونکہ ان کی اکثریت کھیتی باڑی کرتی تھی۔ چنانچہ جو سکھ جس زمین پر ہل چلاتا تھا وہ اس کا مالک بن گیا۔ دوسری طرف اس قانون کا تمام تر منفی اثر مسلمانوں پر پڑا۔ کیونکہ ان کی اکثریت جاگیردارانہ تھی۔ ان

احکامات کے علاوہ بندہ سنگھ بیراگی نے اپنا ایک نیا سکہ بھی جاری کیا جس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔

سکہ زد ہر دو عالم تیغ نانک واہب است
فتح گوبند سنگھ شاہ شاہاں فضل سچا صاحب است

سکے کے دوسری طرف یہ عبارت تھی:

''ضرب بہ امان الدہر مصورت شہر زینت تخت مبارک بخت''

علاوہ ازیں بندہ نے سرکاری فرامین جاری کرنے کے لیے اپنی ایک خاص مہر بھی بنوائی جس پر یہ شعر درج تھا:

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بید رنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بندہ بیراگی نے ہمیشہ اپنے تمام اقدامات میں مذہب اور بزرگانِ مذہب ہی کو اہمیت دی۔ کہیں بھی اپنے آپ کو نمایاں نہیں کیا اور خود کو محض گورو گوبند کا بندہ کہلوانے پر ہی اکتفا کیا۔

اس دوران میں بندہ بیراگی مسلسل اپنی فوجی طاقت کو مضبوط بناتا رہا۔ لوٹ مار کی کئی چھوٹی چھوٹی کارروائیوں کے بعد اس نے سہارنپور پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ سہارنپور کے حکمران علی مہر خان کو جب بندہ بیراگی کی آمد کا علم ہوا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے، کیونکہ وہ اس سے پہلے سرہند کی عبرت خیز تباہی کا حال سن چکا تھا۔ لہٰذا اس نے سکھوں کے مقابلے کے لیے طاقت نہ ہونے کی وجہ سے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اگرچہ معززینِ شہر اور فوج کے افسروں نے اس کی بہت ہمت بندھائی اور اسے سکھوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے آمادہ کیا، لیکن وہ سکھوں سے اس قدر ہراساں ہو چکا تھا کہ رات کے وقت اپنے اہلِ خانہ، اور جس قدر مال و زر ساتھ لے جا سکتا تھا، لے کر دہلی کی جانب بھاگ گیا۔ اس کے چلے جانے سے ہر چند اہلِ شہر کے حوصلے متاثر ہوئے مگر انہوں نے حوصلہ

نہیں ہارا۔ بلکہ دشمن کی مزاحمت کے لیے مقدور بھر تیاری شروع کر دی۔ اس جنگ میں باقاعدہ فوج کے علاوہ عام شہریوں نے بھی بڑی تعداد میں حصہ لیا اور سکھوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ لیکن انجام کار سکھوں نے شہر کو فتح کر لیا اور عوام کو جی بھر کر قتل کیا اور لوٹا۔ مسلمان خواتین بے آبروئی کے ڈر سے کنوؤں میں کود گئیں۔ غرض سکھوں نے یہاں بھی وہ سب کچھ کیا جو اب تک ان کی شہرت کا جزو بن چکا تھا۔ یعنی بے دریغ قتل و غارت گری۔ سہارنپور سے سکھوں کو بڑی مقدار میں زر و جواہر مالِ غنیمت کی صورت میں ملے۔

سہارنپور کو تخت و تاراج کرنے کے بعد بندہ بیراگی نے جلال آباد کے قلعہ دار جلال خان کو اطاعت قبول کرنے کا پیغام بھیجا۔ جلال آباد، سہارنپور سے تیس میل جنوب میں واقع ہے۔ یہ شہر جلال خان نے بسایا تھا۔ یہاں اکثر افغان آباد تھے اور ان کا سردار جلال خان دور دور تک اپنی جرأت و استقلال کی وجہ سے مشہور تھا۔ چنانچہ جب سکھوں کا خط ملا تو اس نے حاکم سہانپور کے برعکس راہِ فرار اختیار نہیں کی بلکہ مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے پیغام لانے والے وفد کو برا بھلا کہہ کر شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔

جب بندہ بیراگی کو جلال آباد میں ان سکھوں کی تذلیل کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت برانگیختہ ہوا اور زیادہ سرعت سے جلال آباد کی طرف بڑھا، تا کہ وہاں کی حکومت اور عوام سے اپنے قاصدوں کی تذلیل کا انتقام لے سکے۔ وہ راستے کی تمام مسلمان آبادیوں کو اجاڑتا ہوا جلال آباد پہنچا اور شہر سے تین میل پر واقع موضع گڑھی کا محاصرہ کر لیا۔ جب جلال خان کو اس واقع اطلاع ملی تو اس نے اپنے بھائی ہزبر خان اور پوتے غلام محمد خان کو گڑھی کے محصورین کی امداد کے لیے بھیجا۔ جب محصورین نے دیکھا کہ کمک آ گئی ہے تو انہوں نے بھی بستی سے باہر نکل کر سکھوں پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں سکھ پسپا ہو گئے۔ مسلمان فوج تو شہر جلال آباد میں واپس چلی گئی۔ لیکن سکھوں نے کچھ دور بھاگنے کے بعد واپس آ کر شہر جلال آباد کا محاصرہ کر لیا۔ جلال خان نے دفاعی پوزیشن اختیار کر کے مقابلہ شروع کر دیا۔ سکھوں نے اگرچہ کئی زوردار حملے کیے لیکن مسلمانوں نے بڑی بہادری سے ان کی مدافعت

کی اور سکھ کئی کوششوں کے باوجود بھی شہر پر قبضہ نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ اس مہم میں انہوں نے لکڑی کے مضبوط رواں مورچے (ارابے) بھی استعمال کئے اور فتح درشن کے نعرے بھی بہت لگائے لیکن جب بیس دن کی سر توڑ کوشش کے بعد بھی مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے تو بالآخر محاصرہ اٹھا کر سلطانپور کی طرف چلے گئے۔ جلال آباد کا معرکہ اگست 1710ء کے لگ بھگ ہوا۔

سرہند کی فتح کے بعد بندہ سنگھ کے ذہن میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جو زبردست خواہش پیدا ہوئی تھی، جلال آباد کی ہزیمت کی وجہ سے اس میں کوئی کمی نہ آئی۔ اب تک اس کی کارروائیاں گنگا جمنا دوآب تک ہی محدود تھیں۔ لیکن اب اس نے جالندھر دوآب اور باری دوآب میں رہنے والے سکھوں کو حکم دیا کہ وہ بھی میدانِ عمل میں آ جائیں۔ اس کے اس پیغام کا سکھوں نے بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا کیونکہ وہ چمکور کی شکست (1704ء) کے بعد سے حکومت کے خلاف اقدام کرنے کے لیے مناسب موقع دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ ماجھ کے سکھوں نے امرتسر میں اکھٹے ہو کر خروج کیا۔ ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی اور انہوں نے معمولی مزاحمت کے بعد بٹالہ اور کلانور پر قبضہ کر لیا۔ ان دونوں شہروں پر قبضے سے سکھوں کو بے اندازہ مالِ غنیمت ملا۔ کیونکہ ان شہروں میں بڑے بڑے مسلمان تاجر اور سرکاری افسر رہتے تھے۔ یہاں سے ملنے والے مالِ غنیمت نے سکھوں کو معاشی لحاظ سے فارغ البال کر دیا۔ کلانور کی تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہیں اکبرِ اعظم کی رسم تاجپوشی ادا ہوئی تھی۔ سکھوں نے فتح کے بعد ان علاقوں سے مغل حکام کو مار بھگایا۔ اس طرح اس علاقے سے مغل اقتدار ختم ہو گیا اور سکھوں نے ہر جگہ اپنے انتظامی افسر مقرر کیے۔ جنہیں وہ تھانے دار کہتے تھے اور جس جگہ تھانیدار بیٹھتا تھا اسے تھانہ کہتے تھے۔

مشرقی پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد سکھوں نے لاہور پر یلغار کی۔ لاہور کا نائب حاکم سید اسلم خان بھی سکھوں کا مقابلہ کرنے سے کترانے لگا۔ اس زمانے میں شاہ عالم بہادر شاہ کا بڑا بیٹا شہزادہ معزالدین لاہور کا حکمران تھا۔ وہ اکثر لاہور سے غیر حاضر ہوتا۔

اس کی عدم موجودگی میں سید اسلم خان اس کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا تھا اگرچہ حکومت کی طرف سے سکھوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں گرمجوشی کا مظاہرہ نہ ہوا تھا۔لیکن لاہور کے عوام نے اپنے طور پر رضا کار تنظیم قائم کی۔علماء نے سکھوں کے خلاف مزاحمت کو جہاد قرار دیا اور شہریوں کو اس میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔اس فوج میں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ان کی قیادت اکبر اعظم کے مشہور وزیر راجا ٹوڈرمل کا پوتا راجا پیرامل کر رہا تھا۔اس طرح چند ہی دنوں میں محض رضا کارانہ بنیادوں پر ایک بڑی فوج اکٹھی ہوگئی۔اس فوج کا نام ''حیدری فوج'' رکھا گیا اور اس کے علم کو ''حیدری علم'' کہا گیا۔یہ علم مرکزی عید گاہ میں نصب کر دیا گیا۔جس کا محل وقوع موجودہ گڑھی شاہو ہے۔لیکن اس فوج میں بعض خامیاں بھی تھیں،جن کی وجہ سے یہ کچھ کامیاب نہ رہی۔یعنی ایک تو یہ لوگ باقاعدہ تربیت یافتہ نہ تھے۔دوسرے شہری باشندے ہونے کی وجہ سے بہت آرام طلب تھے اور سکھوں کی طرح جفاکش اور سخت کوش نہ تھے۔تیسرے اس لشکر کو اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل قیادت میسر نہ تھی۔

دوسری جانب ماجھہ اور دوآبہ سکھوں نے ایک زبردست خالصہ کو منظم کیا اور اسے چار حصوں میں تقسیم کر کے مختلف سمتوں میں روانہ کیا۔پہلا جتھہ ماجھہ یعنی امرتسر اور لاہور کے اضلاع کی طرف،دوسرا ضلع گورداسپور کی جانب،تیسرے کے سپرد خاص شہر لاہور کی فتح کا کام ہوا،جبکہ چوتھا عقب میں ہنگامی ضروریات کے لیے رکھا گیا،تا کہ اگر کسی محاذ پر سکھ ضعف کا شکار ہوں تو اس دستے کو ان کی کمک کے لیے بھیجا جا سکے۔

جس جتھے کو لاہور بھیجا گیا اس نے یہاں آتے ہی لاہور کی تمام مضافاتی بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا اور لوٹ مار کرتا ہوا شالامار باغ تک آ گیا۔اس نے لاہور سے کچھ فاصلے پر واقع قلعے پر قبضہ کر لیا۔اس قلعے کا نام قلعہ بھگونت رائے تھا۔سکھوں نے اس قلعے کو اپنا اڈہ بنا لیا۔وہ مسلمانوں سے چھینا ہوا تمام مال و اسباب یہیں جمع کرتے۔تھک جانے کے بعد یہیں آ کر ستاتے اور دوبارہ تازہ دم ہو کر کسی دوسری آبادی کو لوٹنے چلے جاتے۔چنانچہ

موضع بھیرت میں سکھوں اور حیدری فوج کے رضا کاروں میں ایک جھڑپ ہوئی جس میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ اسی دوران میں اطلاع ملی کہ سکھوں کی بڑی تعداد موضع بیگم کوٹلہ میں جمع ہو رہی ہے۔ حیدری فوج نے مغل افسروں میری عطاء اللہ محب خان کھرل اور راجا پیر امل کی قیادت میں قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ سکھ جم کر لڑتے رہے، محاصرے نے طول کھینچا تو لاہور کے شہری بددل ہو گئے۔ ان کے لشکر میں شکستگی کے آثار دیکھ کر سکھوں نے قلعے سے نکل کر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے مقابلہ کیا لیکن اسی جنگ کے دوران تیز آندھی اور زبردست بارش بھی شروع ہو گئی۔ تو مسلمانوں کو پسپا ہونا پڑا۔

بیگم کوٹلہ سے واپسی پر مسلمانوں نے موضع بھیلووال میں قیام کیا۔ یہاں ایک معمولی قلعہ بھی تھا۔ باقاعدہ فوج تو رات گزارنے کے لیے قلعے کے اندر چلی گئی جب کہ رضا کار بیچارے قلعے کے باہر ہی ادھر ادھر رات گزارنے کے لیے پڑے رہے اور وہ سب سکھوں کی طرف سے بالکل مطمئن تھے، لیکن سکھ مسلسل ان کا تعاقب کر رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے بھیلووال پہنچ گئے۔ سکھوں نے رات تو قبضے کے اردگرد جھاڑیوں میں چھپ کر بسر کی اور علی الصبح بے خبر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان اس حملے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے، لہٰذا ان کا بہت نقصان ہوا۔ ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور بچے کھچے بہ ہزار دقت وخرابی لاہور واپس پہنچے۔ رضا کار فوج کے ذریعے مدافعت کا منصوبہ اگرچہ متوقع طور پر کامیاب نہ رہا۔ لیکن اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ جب بندہ بیراگی اس علاقے میں آیا تو اس نے آس پاس کے علاقوں کو تو لوٹا مگر لاہور شہر پر حملے کی جرأت نہ کر سکا۔ کیونکہ اسے احساس تھا کہ شہر کے تمام باشندے مسلح ہیں اور شہر پر قبضہ کرنا آسان نہیں۔

ادھر جالندھر دوآب کے سکھوں نے بھی منظم ہو کر اپنی خوں آشام سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے جالندھر دوآب کے حاکم شمس الدین خان کو پروانہ بھیجا کہ ہماری خوراک اور گولہ بارود کی ضروریات پوری کرو اور آئندہ بھی باج گزار کی حیثیت میں رہنے کا اعلان کرو۔ اس خط کا جواب شمس الدین خان نے بڑے گول مول انداز میں دیا۔ اس طرح اس

نے وقتی طور پر سکھوں کو ٹال کر دفاعی تیاریوں کے لیے وقت حاصل کر لیا۔ سکھ وفد کے واپس جانے کے بعد اس نے جہاد کا اعلان کر دیا اور تھوڑی مدت میں کافی مسلمان، سکھوں سے جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ جب شمس الدین خان اپنے صدر مقام سلطان پور سے روانہ ہوا اور اس کے ساتھ باقاعدہ فوج کے سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہیوں کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ رضا کار بھی تھے۔ دوسری طرف سے ستر اسی ہزار جنگجو سکھوں کا لشکر بھی آ گیا۔ علاوہ ازیں ان کے پاس سرہند سے حاصل کی گئی بہت سی بھاری توپیں بھی تھیں۔ دونوں فوجوں کی سلطان پور سے سات میل دور راہوں کے مقام پر مڈ بھیڑ ہوئی اس موقع پر سکھوں نے بندہ بیراگی کو جلد پنجاب آنے کا پیغام بھیجا۔ بندہ بیراگی ان دنوں گنگا جمنا دوآب میں تھا۔ سکھوں نے ایک بھٹے کے اردگرد خندقیں کھود لیں اور مضبوط قلعہ بندی کر کے دفاع میں بیٹھ گئے۔ اسی جنگ میں سکھوں نے پہلی بار فائرنگ سے بچاؤ کے لیے ریت کی بوریاں استعمال کی تھیں۔ مسلمانوں نے شمس الدین خان کی قیادت میں 12 اکتوبر 1710ء کو سکھوں پر حملہ کیا۔ دونوں طرف سے شدید گولہ باری ہوئی۔ جب سکھوں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کا حملہ نہیں روک سکتے تو انہوں نے حملہ آوروں کا گھیرا توڑا اور بھاگ کر راہوں کے قلعے میں محصور ہو گئے۔ جسے وہ قبل ازیں فتح کر چکے تھے۔ شمس الدین نے بھی بڑھ کر قلعے کو گھیر لیا۔ یہاں سکھوں نے ایک چال چلی۔ یعنی بظاہر تو وہ اس جگہ سے بھی پسپا ہو گئے لیکن دراصل وہ راہوں سے کچھ فاصلے پر آ کر روپوش ہو گئے۔ شمس الدین خان نے بھی تعاقب کا خطرہ مول نہ لیا اور واپس سلطانپور جانے کی تیاری شروع کر دی اور سکھوں کی طرف سے غافل ہو گیا۔ جونہی شمس الدین نے راہوں خالی کیا سکھ فوراً واپس آ گئے اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بھی سکھوں کے ساتھ اس کی تقریباً بیس لڑائیاں ہوئیں۔ جب شمس الدین خان نے محسوس کیا کہ وہ اب سکھوں کے تند خور یلے کو نہیں روک سکتا تو اس نے شاہ عالم بہادر شاہ کی خدمت میں مدد کے لیے درخواست بھیجی۔ یہ درخواست بادشاہ کو 25 اکتوبر 1710ء کو سونی پت کے مقام پر ملی اور اس نے شمس الدین خان کو جوابی پیغام بھیجا

کہ عنقریب کمک روانہ کی جارہی ہے۔ چونکہ بادشاہ خانہ جنگی اور دکن میں مرہٹوں کی یورش سے عہدہ برآ ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے اب سکھوں کی گوشمالی کا فیصلہ کیا۔

جس زمانے میں مغل بادشاہ بہادر شاہ سے پنجاب آنے کی درخواست کی گئی اس وقت اس صوبے کی عمومی حالت یہ تھی کہ پانی پت سے لے کر لاہور تک کا تمام علاقہ سکھوں کی ظالمانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ صرف لاہور شہر محفوظ تھا۔ اس تمام علاقے میں سکھ عملداری قائم ہو چکی تھی اور مغل اقتدار عملاً ختم ہو چکا تھا۔ سکھوں کی کارروائیاں اب شہر دہلی کے گردونواح میں بھی شروع ہو گئیں جس سے دہلی کے عوام میں خوف و ہراس پھیل گیا اور انہوں نے اپنے خاندانوں کو لے کر مشرقی صوبوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا تا کہ سکھوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکیں۔

سکھوں کے بارے میں بہادر شاہ کو پہلی اطلاع 30 مئی 1710ء کو اجمیر میں ملی اور اس کے بعد اسے متواتر اطلاعات ملتی رہیں۔ علاوہ ازیں سرہند، سامانہ، ساڈھورہ اور دوسرے علاقوں کے ستم زدہ عوام بھی اس کے پاس پہنچے اور سکھوں کی بہیمی کی شکایت کی تو اسے یہ حالت سن کر بہت صدمہ ہوا اس نے بذاتِ خود پنجاب جا کر سکھ قوت کو کچلنے کے فیصلے کا اعلان کیا۔ اس پر وزیر منعم خان نے اختلاف کیا کہ اس مختصر اور غیر اہم عنصر کی سرکوبی کے لیے بذاتِ خود بادشاہ کا جانا شاہی وقار کے منافی ہے۔ بادشاہ کو خود جانے کے بجائے یہ کام اپنے دربار کے کسی امیر کے سپرد کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس مہم کے لیے اس نے اپنے آپ کو پیش کیا اور بادشاہ کو یقین دلایا کہ بندہ بیراگی کو زندہ گرفتار کر کے لائے گا، لیکن بادشاہ نے سکھوں کے خلاف جہاد میں شمولیت کو اپنا فرض جانا اور اس نے دہلی کے نائب حاکم آصف الدولہ اسد خان کو حکم بھیجا کہ سکھوں کی شورش کو فرو کرنے کے لیے فوراً مناسب تعداد میں فوج تیار کرے۔ ساتھ ہی بادشاہ نے اودھ کے صوابیدار خان جہان اور بارہہ کے سید عبداللہ کو بھی اپنی اپنی فوجی طاقت کے ساتھ بلا بھیجا تا کہ وہ بادشاہ کی معیت میں پنجاب روانہ ہو سکیں۔ بادشاہ 27 جون 1710ء کو اجمیر سے روانہ ہوگا۔

بادشاہ بہادر شاہ نے فیروز خان میواتی کو ہراول کا سردار بنا کر روانہ کیا۔ جس کے ساتھ اور بھی کئی نامور امراء تھے۔ اسی اثناء میں مراد آباد سے محمد امین خان اور قمر الدین خان پہنچ گئے، زین الدین احمد خان کو سرہند کا اور گولتاش خان کو سونی پت کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ آہستہ آہستہ سفر کرتا ہوا 22 اکتوبر 1710ء کو سونی پت میں آ کر خیمہ زن ہوا۔ اس سے قبل سید نجم الدین علی خان اور اس کے ہمراہی پٹودی کے مقام پر شاہی لشکر میں شامل ہو چکے تھے۔ سونی پت میں بادشاہ کو راہوں کی لڑائی کی خبر پہنچی۔ 30 اکتوبر 1710ء کو جب بہادر شاہ سرائے کنور پہنچا تو اسے اپنے ہراول سے سکھوں کے تصادم کی اطلاع ملی۔ یہ تصادم امین گڑھ میں 26 اکتوبر کو ہوا تھا اور اس میں شاہی ہراول کامیاب رہا تھا۔ اس کے بعد سکھوں کے ساتھ کئی معمولی نوعیت کی جھڑپیں ہوئیں اور سکھ ہر جگہ سے پسپا ہو کر سرہند میں اکٹھے ہوتے گئے۔

ادھر جالندھر دوآب کے صوبیدار شمس خان نے بھی بادشاہ کی آمد کا سن کر دوبارہ اپنی سرکاری اور غیر سرکاری فوج کو جمع کیا اور سرہند کی طرف بڑھا۔ شاہی ہراول کا ایک اور سردار بایزید خان بھی سرہند کی طرف متوجہ ہوا۔ بایزید خان شمس الدین خان کا چچا تھا۔ اس طرح سرہند پر مغل فوج نے بڑی تعداد میں حملہ کیا۔ بندہ سنگھ کا مقرر کردہ گورنر باج سنگھ ان دنوں شہر میں موجود نہ تھا۔ وہ کسی مہم کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے بھائی سکھا سنگھ اور شام سنگھ نے سکھوں کی قیادت کی۔ سکھوں نے شہر سے باہر یعقوب خان کے باغ میں مسلم افواج کا مقابلہ کیا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی، لیکن جب سکھوں کا قائد سکھا سنگھ ہلاک ہو گیا تو سکھوں کے قدم بھی اکھڑ گئے اور وہ سرہند کے قلعے میں محصور ہو گئے۔ جب یہ اطلاع بادشاہ کو ملی تو اس نے محمد امین خان کو فوج دے کر بھیجا کہ وہ سرہند کا قلعہ فتح کرے۔ لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی شمس خان نے ایک زوردار حملہ کر کے قلعہ فتح کر لیا۔ اس پر محمد امین خان، شمس خان سے حسد کرنے لگا اور اس نے بادشاہ سے کہہ سن کر اسے جالندھر دوآب کی صوبیداری سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ عیسیٰ خان کو مقرر کر دیا۔

سرہند پر سرکاری فوجوں کے قبضے کے بعد سکھ اپنے مرکز لوہ گڑھ میں منتقل ہو گئے، لیکن بندہ بیراگی چند دن پہلے اپنے بیشتر سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے مغربی پنجاب کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ راستے ہی میں جب اسے بہادر شاہ کی پنجاب کی جانب آنے کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً لوہ گڑھ کو واپسی اختیار کی۔ اس دوران بادشاہ ساڈھورہ پہنچ چکا تھا۔ یہاں سے اس نے رستم دل خان اور فیروز خان میواتی کو مرکزی لشکر کے آگے آگے چلنے کا حکم دیا تا کہ وہ لشکر کی منازل کے لیے مناسب مقامات کا جائزہ لے سکیں۔ یہ دستہ ابھی شاہی خیمہ گاہ سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہی تھا کہ سکھوں کے ایک گروہ نے اچانک اس پر شدید حملہ کر دیا۔ جس سے مسلمانوں کا زبردست جانی نقصان ہوا۔ سکھوں کے ساتھ دست بدست جنگ میں بہت سے مسلمان کام آئے اور قریب تھا کہ مسلمان بھاگ کھڑے ہوں کہ اس کے عقب میں آنے والا دستہ پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی سکھوں پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں سادات بارہہ نے امتیازی کردار کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے گھوڑوں سے اتر کر سکھوں پر اس قدر تیز حملہ کیا کہ سکھ معرکے میں ٹھہر نہ سکے اور انہوں نے فرار ہو کر لوہ گڑھ کے قلعے میں پناہ لی۔ جہاں اس دوران میں بندہ بیراگی سمیت اس علاقے کے تمام سکھ جمع ہو چکے تھے۔ مسلمان فوج نے تمام سرکردہ امراء اور شہزادوں کی قیادت میں قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کرنے والی مغل فوج کی تعداد ساٹھ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ جبکہ اس معرکے میں شامل سکھوں کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ تک تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ لوہ گڑھ کا قلعہ ناقابلِ عبور پہاڑی سلسلے میں ایک بلند جگہ پر واقع تھا۔ بندہ نے اس قلعے میں بہت سا سامانِ خوراک اور گولہ بارود جمع کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے دفاع کو مزید تقویت دینے کے لیے قلعے کے اردگرد فوجی نقطۂ نظر سے اہم مقامات پر چوکیاں بھی قائم کر رکھی تھیں تا کہ حملہ آور یکدم ہی قلعے کی دیواروں تک نہ پہنچ جائیں۔

مغل افواج نے قلعے کو ہر طرف سے مکمل طور پر گھیر لیا اور آہستہ آہستہ محاصرہ تنگ ہوتا گیا۔ قلعے کے اردگرد واقع سکھوں کی دفاعی چوکیاں یکے بعد دیگرے فتح ہوتی گئیں اور

شاہی لشکر چاروں طرف سے قلعے کے قریب آ گیا۔ اب سکھوں کے لیے بھاگنے کا بھی کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا، نہ تو باہر سے ضرورت کی کوئی چیز قلعے کے اندر جا سکتی تھی، نہ ہی قلعے سے کوئی سکھ جان بچا کر باہر جا سکتا تھا۔ مسلمان اور سکھ لگاتار ایک دوسرے پر آگ برسا رہے تھے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ چونکہ سکھوں کی رسد و کمک کے تمام ذرائع مسدود ہو چکے تھے اس لیے قلعے میں موجود ان کی خوراک کے ذخائر بتدریج ختم ہونا شروع ہو گئے۔ جب کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو گئیں تو انہوں نے توپیں اور چھکڑے کھینچنے والے بیل بھی کھا لیے اور اس کے بعد اپنی سواری کے گھوڑوں سے اپنی خوراک کو سہارا دیا۔

جب محاصرے نے طول کھینچا تو ایک دن وزیر اعظم منعم خان نے بادشاہ سے عرض کی کہ اسے اپنے دستے قلعے کے مزید قریب لے جانے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے اجازت تو دے دی لیکن یہ کہہ دیا کہ حملے کی ابتداء نہ کرنا۔ چنانچہ جب منعم خان نے اپنی فوج کے ساتھ پیش قدمی کی تو سکھوں نے اس پر اندھا دھند گولہ باری شروع کر دی جس پر اس نے وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر اور بادشاہ کی رسمی اجازت کے بغیر ہی اپنی فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ جب یہ صورتحال باقی لشکر نے دیکھی تو اس خیال سے کہ اکیلے منعم خان پر سکھ آسانی سے غالب آ جائیں گے، انہوں نے تمام محاذوں پر یکبارگی حملہ کر دیا۔ جنگ پوری شدت سے شروع ہو گئی۔ دونوں طرف کا بہت جانی نقصان ہوا لیکن جوں جوں دن ڈھلتا گیا سکھوں کی قوت مزاحمت کمزور ہوتی گئی اور مسلمانوں کی فتح کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ سورج غروب ہو گیا لیکن لڑائی جاری رہی۔ جب مسلمان فوج کا قلعے کے کئی اہم مقامات پر قبضہ ہو گیا تو منعم خان نے فوجوں کو حکم دیا کہ صبح تک جنگ ملتوی کر دیں اور جہاں جہاں تک وہ پہنچ چکے ہیں وہیں رات بسر کریں اور سورج نکلنے پر وہیں سے حملے کا آغاز کریں۔ اس کے بعد وہ ضروری دفاعی انتظامات کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی جسارت کی معافی مانگی اور کہا کہ سکھوں کی مزاحمت دم توڑ چکی ہے اور صبح ہم پہلے ہی ہلے میں اس مقام پر قبضہ کر لیں گے۔ بندہ بیراگی کو گرفتار کر کے شاہی حضور میں پیش کیا جائے گا۔ بادشاہ

نے اس متوقع کامیابی کی وجہ سے منعم خان کی معذرت قبول کر لی۔

ادھر قلعے کے اندر جب سکھوں کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کم ازکم بندہ بیراگی اور سر برآوردہ سکھ سرداروں کو ضرور یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ چنانچہ آدھی رات کے بعد جب مسلمان سپاہی سارے دن کی جنگ سے تھک کر سو چکے تھے تو سکھوں نے تلواریں سونت کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور مختصری جھڑپ کے بعد بیشتر سکھ ایک درے میں سے ہو کر پہاڑی علاقوں میں چلے گئے۔ اگرچہ مسلمانوں نے قلعے کے آنے جانے کے تمام راستے بند کر رکھے تھے لیکن صرف اسی ایک راستے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا تھا۔ چنانچہ یہی راستہ بندہ بیراگی کے کام آیا اور وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے دن جب صبح منعم خان نے حملہ شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد قلعے کے مرکزی مقام پر اس کا قبضہ ہو گیا تو وہاں بندہ سنگھ تو موجود نہیں تھا بلکہ اس کے کپڑے پہنے ایک دوسرا شخص گلاب سنگھ اس کی جگہ بیٹھا تھا۔ اب منعم خان کو معلوم ہوا کہ بندہ تو رات کی تاریکی میں اور مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو چکا ہے تو وہ بہت پریشان ہوا اور قلعے پر قبضے کی صورت میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی تھی اسے وہ شکست سمجھنے لگا کیونکہ اس کا اصل مقصد تو بندہ بیراگی کو گرفتار کرنا تھا۔ جو اسے حاصل نہ ہو سکا تھا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ منعم خان اپنی اس ناکامی پر اس قدر خجل ہوا کہ پھر وہ کبھی بادشاہ کے سامنے نہ گیا۔ اس کا ذہن اس واقعے سے بری طرح متاثر ہوا وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ چند دن بعد بیمار پڑ گیا اور اسی بیماری ہی میں فوت ہو گیا۔

جب بہادر شاہ کو سکھوں کے نکل بھاگنے کا علم ہوا تو وہ بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ بندہ بیراگی کو بہرحال پیش کیا جائے۔ بعض مغل سردار ادھر ادھر دوڑے بھی مگر بے سود۔ کیونکہ بندہ ان کی دسترس سے نکل چکا تھا۔ کچھ مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ پہاڑی ریاست ناہن اور کشمیر کے حکمرانوں نے بھی بندہ بیراگی کے فرار میں مدد کی تھی۔ چنانچہ بہادر شاہ نے ان ریاستوں کو حکم بھیجا کہ اگر بندہ بیراگی ان کی حدود اختیار میں موجود ہے تو اسے

گرفتار کر کے بھیج دیا جائے۔ ریاست ناہن کے راجا نے اس کے جواب میں لکھا کہ بندہ بیراگی کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔

بہادر شاہ چند دن یہاں رہنے کے بعد لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ اسی دوران شدید بارشیں شروع ہو گئیں۔ ضعیف العقیدہ مسلمان ان بے وقت بارشوں کو بندہ بیراگی کے جادو کا کرشمہ سمجھے۔ ان بارشوں کی وجہ سے بادشاہ کو کئی مقامات پر غیر معمولی تاخیر ہوئی اور وہ 11 اگست 1711ء کو لاہور میں وارد ہوا۔

لوہ گڑھ کا معرکہ دس اور گیارہ دسمبر 1710ء کو لڑا گیا۔ اس جنگ میں طرفین کے تقریباً پچاس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ سکھ قیدیوں کی تعداد بھی ایسی قابلِ ذکر نہ تھی۔ گلاب سنگھ سمیت پندرہ سکھ جو شدید زخمی تھے، گرفتار ہوئے تھے۔ محاصرے کے دوران مسلمانوں کو اطلاع ملی تھی کہ بندہ بیراگی نے یہاں بہت سا خزانہ جمع کر رکھا ہے۔ لیکن قلعے کی تلاش پر کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ اس پر مسلمانوں نے قلعے میں مشکوک مقامات پر کھدائی کی تو ایک جگہ سے لاکھوں اشرفیاں ملیں۔

اگرچہ لوہ گڑھ کے معرکے میں سکھوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا، لیکن بندہ سنگھ بیراگی اور اس کے معتقد اس شکست سے قطعاً مایوس نہ ہوئے بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے زیادہ گرمجوشی سے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ بندہ نے سکھوں کو اپنی پوشیدہ قیام گاہ سے مطلع کیا اور جلد از جلد وہاں پہنچنے کی ہدایت کی۔ تھوڑی ہی مدت میں سکھوں کی ایک خاصی تعداد اس کے پاس اکٹھی ہو چکی تھی۔

شاہ عالم بہادر شاہ اگست 1711ء میں لاہور آیا۔ راستے میں اور یہاں آنے کے بعد اس نے سکھوں کے استیصال اور بندہ بیراگی کی گرفتاری کے لیے کئی مہمیں بھیجیں، لیکن ان کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا۔ لاہور میں بہادر شاہ کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور بالآخر فروری 1716ء میں یہیں فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ ہوئی۔ تین شہزادے قتل ہوئے اور چوتھا جہاندار شاہ بادشاہ بنا۔ وہ بھی

صرف دس ماہ حکومت کر پایا تھا کہ فرخ سیر نے سید برادران کے تعاون سے جہاندار کو شکست دے کر تختِ دہلی پر قبضہ کر لیا۔

بہادر شاہ کی وفات کے بعد جنگِ اقتدار کے دوران وہ فوجی دستے جنہیں بندہ بیراگی کے تعاقب پر مامور کیا گیا تھا، بھی اپنے فرض سے غافل ہو گئے اور بندہ کو اپنی طاقت مجتمع اور منظم کرنے کا موقع مل گیا۔ بہادر شاہ کے دور ہی میں وہ دوبارہ کافی مضبوط ہو چکا تھا۔ اس نے پہاڑی راجاؤں کو تعاون کے لیے پیغامات بھیجے، جن راجاؤں نے اسے مثبت جواب دیا ان میں کاہلیر کا راجا بھیم چند، منڈی کا راجا سدھ سائیں، کالو کا راجا مان سنگھ اور چھمب کا راجا اودھے سنگھ شامل ہیں۔ جن راجاؤں نے اس کی حمایت سے انکار کیا ان کے خلاف اس نے مسلح اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اس کا پہلا معرکہ بہادر شاہ کی زندگی ہی میں 4 جون 1711ء کو بہرم پور کے مقام پر جموں کے راجہ سے ہوا۔ اس جھڑپ میں بندہ کا تعاقب کرنے والی شاہی فوج بھی شریک ہوئی اور سرکاری دستے کے دو اعلیٰ افسر شمس خان اور بازید خان اس میں قتل ہوئے۔ اب بندہ بیراگی نے بٹالہ کا رخ کیا۔ سکھ یلغار کی خبر جونہی شہر میں عام ہوئی، شہریوں نے اپنے بال بچوں کو لے کر بھاگنا شروع کر دیا۔ لیکن وہاں کے ایک ممتاز عالمِ دین شیخ الہند شیخ احمد نے بچے کھچے شہریوں کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کیا۔ مگر وہ سکھوں کو نہ روک سکے اور سب کے سب شہید ہو گئے۔ بیراگی نے شہر پر قبضہ کر کے باقی ماندہ شہریوں کو قتل کر دیا اور ان کا مال و منال لوٹ لیا اور مکانوں کو آگ لگا دی۔ اس کے بعد بندہ بیراگی نے لاہور کی جانب پیش قدمی کی۔ لیکن رستم دل خان اور محمد امین خان کے تیز رفتار تعاقب اور اس علاقے میں بادشاہ کی موجودگی کی وجہ سے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا اور دریائے راوی عبور کر کے پسرور ہوتا ہوا جموں کے پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ ادھر رستم دل خان اور محمد امین خان بھی برابر اس کے پیچھے لگے رہے اور اسے کہیں بھی چین نہ لینے دیا۔ لیکن بندہ بھی بڑا چالاک تھا، چنانچہ جب بھی شاہی فوج اس کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتی، وہ اسے جل دے کر کسی دوسری طرف کو نکل جاتا۔ ایک دفعہ بندہ بیراگی ہر

طرف سے گھر گیا اور اس کے لیے کوئی راہِ فرار نہ رہی تو اس نے پلٹ کر رستم دل خان کے دستے پر حملہ کر دیا اور اس کی صفوں کو چیرتا ہوا اپنے آدمیوں کو نکال کر لے گیا۔ بعد ازاں رستم دل خان اور محمد امین خان میں کچھ ذاتی اختلاف پیدا ہو گیا، جس سے سکھوں کے تعاقب کے سلسلے میں ان کی گرمجوشی ختم ہو گئی اور بندہ بیراگی کو اپنی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے وقت مل گیا جس سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

بہادر شاہ کی وفات کے بعد مغل دربار تقریباً ایک سال تک بحران میں مبتلا رہا۔ اگرچہ جہاندار شاہ نے دہلی پہنچنے کے بعد بندہ بیراگی کے خلاف ایک فوج بھیجی تھی لیکن وہ کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی۔ کیونکہ جب جہاندار، فرخ سیر کے خلاف لڑنے کے لیے دہلی سے آگرہ جا رہا تھا تو اس نے اس فوج کو واپس بلا لیا تھا۔ یہ فوج محمد امین خان کی قیادت میں گئی تھی۔ چنانچہ محمد امین خان اپنی کچھ فوج اپنے نائب زین الدین کے سپرد کر کے بادشاہ کے پاس چلا گیا۔ آگرے کے قریب جہاندار اور فرخ سیر کے درمیان جنگ ہوئی جس میں فرخ سیر کامیاب ہوا اور وہ جنوری 1713ء میں تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔ اس نے سکھوں کے مسئلے کی طرف فوراً توجہ دی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ بندہ بیراگی نے مغل دربار کے اس بحرانی دور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوہ گڑھ کے تباہ شدہ قلعے کو مرمت کر کے دوبارہ قابلِ استعمال بنا لیا۔ ساڈھورہ میں بھی اس نے اپنی وسیع ضروریات کے پیشِ نظر ایک بڑا قلعہ تعمیر کیا اور لوہ گڑھ کے قلعے کی حفاظت کے لیے اس کے ارد گرد باون دفاعی چوکیاں اس طرح قائم کیں کہ ہر چوکی کا دفاع دوسری چوکی سے کیا جا سکے۔ بندہ بیراگی خود تو لوہ گڑھ میں رہا اور اپنی فوج کا ایک حصہ ساڈھورہ کے قلعے میں تعینات کر دیا۔

فرخ سیر نے تخت نشین ہونے کے بعد سکھوں کی سرکوبی پر خصوصی توجہ دی۔ اس نے کشمیر کے گورنر عبدالصمد خان دلیر جنگ کو لاہور کا گورنر مقرر کر کے اسے سکھوں کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ لاہور کے گورنر کی حیثیت سے عبدالصمد خان کا تقرر 22 فروری 1713ء کو ہوا تھا۔ اس کے بیٹے زکریا خان کو جموں کا فوجدار بنایا گیا۔ عبدالصمد خان ایک

بڑی فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا اس نے آتے ہی ساڈھورہ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ زین خان کا دستہ بھی پہلے ہی سے موجود تھا۔ جب محصور سکھوں کے پاس خوراک وغیرہ ختم ہو گئی تو انہوں نے بندہ بیراگی کی بھیجی ہوئی فوجوں کے تعاون سے مغل لشکر پر دو طرفہ حملہ کر دیا اور مسلمانوں کی صفوں میں شگاف ڈال کر اپنی تمام فوج نکال کر بندہ بیراگی کے پاس لوہ گڑھ میں چلے گئے۔ ساڈھورہ کا قلعہ کئی ماہ کے محاصرے کے بعد اکتوبر 1716ء میں فتح ہوا تھا۔ عبدالصمد خان نے اس فوج کو بندہ سنگھ کی مرکزی قوت میں شامل ہونے سے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اس نے بندہ بیراگی کا تعاقب کیا، لیکن بندہ بیراگی نے نہ تو کھلے میدان میں اور نہ ہی لوہ گڑھ کے مضبوط قلعے میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کی جرأت کی بلکہ اپنے تمام لشکر کو لے کر تیزی سے پہاڑیوں میں روپوش ہو گیا اور مغل فوج کی دسترس سے باہر نکل گیا۔

لوہ گڑھ سے فرار کے بعد بندہ بیراگی تقریباً پندرہ ماہ تک جموں کے قریب واقع ایک جگہ پر چھپا رہا اور مغل اقتدار کا تختہ الٹنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرتا رہا۔ یہ مقام جہاں بندہ اکتوبر 1713ء سے فروری 1715ء تک مقیم رہا، آج کل ڈیرہ بابا بندہ صاحب کہلاتا ہے۔ یہ جگہ جموں سے اٹھائیس میل شمال مغرب میں ہے۔ بندہ بیراگی نے فروری 1715ء میں ایک بار پھر خروج کیا اور راستے میں آنے والی تمام آبادوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا۔ کلانور اور بٹالہ اس کی وحشیانہ سرگرمیوں کا خاص نشانہ بنے۔ جو لوگ بھاگ گئے وہ بچ گئے۔ باقی لوگ قتل ہوئے اور بری طرح لوٹے گئے۔ اس ایک حملے سے بندہ بیراگی کو بے اندازہ مالِ غنیمت حاصل ہوا۔

بندہ بیراگی کی ان غیر آئینی اور غیر انسانی حرکتوں کی اطلاع دہلی میں بادشاہ فرخ سیر کو ملی تو اس نے لاہور کے گورنر عبدالصمد خان کو فوراً اس کے خلاف کارروائی کا حکم دیا۔ ساتھ ہی دہلی سے کئی امراء کو کمک دے کر بھیجا۔ ان امراء میں کئی غیر مسلم بھی شامل تھے۔ بندہ بیراگی ان دنوں گورداسپور سے چار میل مغرب میں واقع ایک گاؤں گورو داس ننگل میں

تھا۔ جو آج بھی کھنڈرات کی صورت میں موجود ہے اور اسے 'بندے والی تھیہہ' کہا جاتا ہے۔ اس گاؤں میں پہلے سے ایک گوردوارہ موجود تھا۔ بندہ بیراگی نے اس گاؤں کے گرداگرد ایک فصیل بنوائی جس سے یہ گاؤں بیرونی حملے سے محفوظ ہوگیا۔ ایک حویلی اپنے رہنے کے لیے تعمیر کرائی۔ غرض اس گاؤں کو ہر لحاظ سے ایک قلعے میں تبدیل کر دیا گیا۔ برج بنا کران پر توپیں نصب کر دیں اور یہاں اشیائے خوردنی کی وافر مقدار جمع کر لی اور بھاری مقدار میں گولہ بارود بھی اکٹھا کرلیا۔ چند دن بعد عبدالصمد خان بھی اپنے فوج کے ساتھ پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرے کی ابتداء 17 اپریل 1715ء کو ہوئی۔ اسی اثناء میں دہلی سے میر قمرالدین خان کمک لے کر آ گیا۔ عبدالصمد خان نے قلعے کی ایک طرف خود سنبھالی اور دوسری طرف قمرالدین خان، تیسری طرف اپنے بیٹے زکریا خان اور چوتھی طرف دیگر تمام افسروں کو تعینات کیا اور انہیں حکم دیا کہ محاصرے میں مکمل احتیاط سے کام لیا جائے۔ چوکی پہرے کے بندوبست میں کوئی خامی نہیں رہنی چاہیے۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ سکھوں کی رسد و کمک کے ذرائع کاملاً مسدود کر دیے جائیں اور انہیں یہاں سے بھاگنے بھی نہ دیا جائے۔ اس طرح ایک وقت آئے گا جب سکھ فوج خوراک ختم ہو جانے کی وجہ سے خود بخود ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس کا یہ منصوبہ کامیاب ہوا، لیکن کچھ دیر تک، کیونکہ سکھ اس کے اندازے کے علی الرغم کافی سخت جان ثابت ہوئے۔

مسلمان فوج نے اپنے سپہ سالار کے ان احکامات پر سختی سے عمل کیا۔ اس طرح سکھوں کی حالت دن بدن پتلی ہوتی گئی۔ مسلمانوں میں یہ بات بڑی مدت سے مشہور تھی کہ بندہ بیراگی بہت بڑا جادوگر ہے اور وہ جو شکل چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اسے بلی، کتا بننے میں مہارت حاصل ہے۔ چنانچہ مسلمان جب بھی کسی بلی یا کتے کو سکھوں کی طرف سے آتا دیکھتے، فوراً اس پر تیروں اور پتھروں کی بارش کر دیتے۔ حتیٰ کہ وہ مر جاتا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ بندہ بیراگی کہیں کتے، بلی کی صورت بنا کر نکل نہ جائے۔ بندہ بیراگی کے مافوق العادت وقت کا مالک ہونے کے پروپیگنڈے نے مسلمانوں پر بہت اثر

ڈال رکھا تھا۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس خوف کو دور کرنے کے لیے بادشاہ نے دہلی سے بوقتِ رخصت قرآن پاک کی آیات لکھ جھنڈوں کے ساتھ باندھ دیں تھیں اور کہا تھا کہ اب بندہ بیراگی کا جادو کارگر نہیں ہوسکتا۔

اس دوران میں سکھوں نے کئی بار قلعے سے باہر نکل کر فوج پر حملے کیے تاکہ فرار کے لیے راستہ بنا سکیں۔ لیکن مسلمانوں نے ان حملوں کو بڑی بہادری سے روکا اور انہیں فرار نہ ہونے دیا۔ چھوٹے چھوٹے شب خون تو وہ روز ہی مارتے تھے، لیکن ان سب کوششوں کے باوجود نہ تو انہیں باہر سے کھانے پینے کی کوئی چیز مل سکی، نہ ہی وہ محاصرے توڑنے میں کامیاب ہو سکے۔ انہوں نے عبدالصمد خان کو ایک بڑی رقم کی پیشکش کی کہ انہیں یہاں سے نکل جانے دے۔ لیکن اس نے رشوت کی یہ پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی۔ سکھوں کے خوراک کے ذخیرے آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ ان کا گولہ بارود تو کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ جب سکھوں کے پاس غلہ وغیرہ نہ رہا، تو وہ گاؤں کی فصیل پر کھڑے ہو جاتے اور ہاتھوں کے اشاروں سے مسلمانوں سے اناج مانگتے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ تین تین روپے سیر غلہ خریدنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اپنی چادریں نیچے لٹکا دیتے تھے اور مسلمان ان میں غلہ باندھ دیتے۔ سکھ رسیوں کی مدد سے انہیں اوپر کھینچ لیتے۔ پھر مٹھی مٹھی بھر دانے آپس میں تقسیم کر کے بھوک مٹاتے۔ لیکن اس خوراک پر وہ کب تک گزارہ کرتے۔ انہوں نے اپنے بیل گھوڑے اور گدھے بھی کھا لیے۔ جب جانور بھی ختم ہو گئے تو انہوں نے ان جانوروں کی ہڈیوں کو پیس کر آٹے کے طور پر استعمال کیا۔ درختوں کے پتے کھا گئے۔ جب پتے بھی نہ رہے تو درختوں کی چھال سے پیٹ کا جہنم بھرا۔ لیکن جب بھوک نے انہیں واقعی ادھ موا کر دیا اور ان میں مزید مزاحمت کی قطعاً سکت نہ رہی تو انہوں نے اس شرط پر قلعے کے دروازے کھول دیے کہ بادشاہ کے سامنے ان کی جان بخشی کی سفارش کی جائے گی۔ سکھوں کے ہتھیار ڈالنے کا یہ واقعہ 17 دسمبر 1715ء کو پیش آیا۔

جونہی قلعے پر مسلمانوں کو تصرف حاصل ہوا وہ سکھوں پر ٹوٹ پڑے اور بہت سوں کو

قتل کر دیا اور بندہ بیراگی سمیت سات سو چالیس سکھ گرفتار ہوئے۔ ان سب کو کٹرے پھرے میں پہلے لاہور لایا گیا۔ یہاں ان کی نمائش کے بعد یہ سب زکریا خان اور قمر الدین خان کی نگرانی میں دہلی روانہ کیے گئے۔ 25 فروری 1716ء کو یہ لوگ دہلی کے مضافات میں پہنچے۔ بادشاہ فرخ سیر کو اطلاع کی گئی۔ بادشاہ نے اعتماد الدولہ محمد امین خان کو ان قیدیوں کو لانے کو بھیجا۔ محمد امین خان تمام انتظامات کے بعد سکھوں کو جلوس کی شکل میں لے کر 27 فروری کو شہر میں داخل ہوا۔ تمام اہم بازاروں میں سے قیدیوں کا یہ جلوس گزارا گیا۔ اس کے بعد بندہ بیراگی اور اس کے اہم سرداروں کو تو ترپولیہ کے شاہی قید خانے میں بند کر دیا گیا اور دوسرے سکھوں کو کوتوال شہر سربراہ خان کے سپرد کر دیا گیا۔ حکومت نے ان باغیوں پر باقاعدہ مقدمہ چلایا عدالت میں ان پر جرم ثابت کیا گیا، جہاں سے ان سب کو موت کی سزا ملی۔ چنانچہ 5 مارچ کو اس حکم پر عمل درآمد شروع ہوا۔ اس دن ایک سو سکھوں کو بازاروں میں نصب کی گئی پھانسیوں پر لٹکایا گیا۔ اس کے بعد ہر روز ایک سو سکھ موت کے گھاٹ اتارے جاتے۔ ہفتہ بھر میں سارے سکھ ختم ہو گئے۔ اب بندہ بیراگی اور اس کے خاص ساتھیوں کی باری آئی۔ حکومت کو شبہ تھا کہ اس نے اپنی دولت کہیں چھپا رکھی ہے اس سلسلے میں اس سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ لیکن اس نے اس بارے میں کچھ نہ بتایا اس پر سختی بھی کی گئی مگر اس سے کوئی بات بھی اگلوائی نہ جا سکی۔ بالآخر جب حکومت مایوس ہو گئی تو 19 جون 1716ء کو اسے بھی قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اسے قید خانے سے نکال کر ایک جگہ بٹھا دیا گیا۔ پھر اس کے ساتھ محبوس سکھوں کو اس کے سامنے قتل کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے چار سالہ لڑکے اجیت سنگھ کو اس کی آغوش میں مارا گیا۔ بندہ بیراگی نے ایک بلی پال رکھی تھی۔ اسے بھی اس کے سامنے ہلاک کیا گیا۔ آخر میں دستِ پناہ گرم کر کے بندہ بیراگی کی بوٹیاں نوچی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا اس طرح زندگی بھر بے گناہ انسانیت پر ظلم کرنے والا خود بھی دردناک انجام سے بچ نہ سکا۔

○

سکھوں کا سیاسی ارتقاء

گزشتہ دو ابواب میں سکھ مذہب کے پس منظر، اس کے گورو صاحبان اور بندہ بیراگی کے سوانح بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے نو گورو صاحبان کے رونما ہونے والے بعض سیاسی واقعات اور ان کے اثرات مابعد کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ اب اس باب میں یہی بحث ذرا تفصیل سے کی جاتی ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جن کے تحت بابا نانک کے پیروؤں کا دنیاوی معاملات سے لاتعلق گروہ اٹھارہویں صدی میں ایک جنگجو اور خونخوار خالصہ دل، کے روپ میں ایوانِ حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے پنجاب کے دامنِ امن کو تار تار کرنے لگا، اور بالآخر اس صدی کے نصف آخر میں تقریباً پورا پنجاب ان کے زیرِ نگیں آ گیا۔

بابا نانک نے برصغیر کے مذہبی اور معاشرتی حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنی اصلاحی تحریک کو پنجاب میں شروع کیا۔ انہوں نے اپنی تعلیمات کی بنیاد انسانی مساوات پر رکھی اور اخوت کا درس دیا۔ وہ زمانہ برہمنی استعماریت کے عروج کا تھا۔ ذات پات کے نام نہاد فلسفے کی آڑ میں شرفِ انسانیت کو پامال کیا جا رہا تھا۔ ان حالات میں جب تبلیغِ اسلام کا دائرہ ہندوستان تک وسیع ہوا اور اس ظالمانہ نظام کا طلسم ٹوٹنے لگا تو بھگتی تحریک کے مفکرین نے اس برہمنی سامراج کے خلاف آواز بلند کی جس کے معروف مفکرین گورکھ ناتھ، راما نند، بھگت کبیر اور بابا نانک وغیرہ تھے۔ ان لوگوں کا مقصد جہاں شودر طبقے کو قعرِ مذلت سے نکال کر معاشرے میں اسے جائز مقام دلانا تھا، وہاں پس پردہ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندو عوام معاشرتی تحفظات کے لیے اپنا مذہب ترک کریں بلکہ یہ لوگ

ہندو بھی رہیں اور معاشرہ ان کے جائز مقام کو تسلیم بھی کر لے۔ ان کی یہ فکر بہت حد تک کامیاب رہی اور لوگ اس تحریک میں شامل ہونے لگے، لیکن بابا نانک نے اپنی تحریک کی بنیاد اس انداز سے اٹھائی کہ ان کے پیرو بتدریج ہندوستان کے دوسرے مذہبی حلقوں سے ممتاز ہو گئے۔ اگرچہ بابا نانک کے عہد میں یہ لوگ ہندوؤں سے بہت کم مختلف تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بابا نانک کے کسی عمل سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ وہ کوئی سیاسی وحدت قائم کرنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ البتہ انہوں نے رہبانیت کی مخالفت کی۔ خود دنیاوی زندگی بسر کی اور اپنے پیروؤں کو بھی معاشرے میں رہ کر اس میں موجود برائیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی تلقین کی۔ ایسی دنیاوی زندگی، جس میں مذہبی اصولوں کو مکمل فوقیت حاصل ہو، لیکن سیاسی جھگڑوں سے کوئی تعلق بھی نہ ہو۔

گورو انگد نے ایک نئے رسم الخط کو اختیار کر کے اپنے پیروؤں کو ایک خاص امتیاز دیا۔ اس خط کو بہت جلد سکھوں کے مذہبی رسم الخط کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس میں بابا نانک کے سوانح اور ان کی متصوفانہ شاعری مرتب کی گئی اور مذہبی احکام احاطۂ تحریر میں لائے گئے۔ چونکہ سکھوں کا تمام تر مذہبی ادب اسی رسم الخط میں تھا، لہٰذا اس نے توقع سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ ترقی کی۔

جدید سیاسیات کی روشنی میں کسی قوم کے اجزائے ترکیبی میں زبان کی بہت اہمیت ہے۔ دنیا کی بعض جغرافیائی وحدتیں محض لسانی امتیاز کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ اس وقت اگرچہ گورو انگد کے ذہن میں رسم الخط کی تبدیلی کے سیاسی محرکات نہ تھے، لیکن بعد ازاں اس امتیاز کی موجودگی نے سکھوں کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے متشکل ہونے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

اس کا ایک اور اہم اثر یہ ہوا کہ سکھوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا، جس سے ان کی تعلیمی پسماندگی دور ہو گئی اور بہت کم وقت میں سکھوں کی اکثریت اپنے مذہبی ادب سے شناسا ہو گئی۔

گورمکھی کو رواج دینے کے ساتھ ساتھ گورو انگد نے بابا نانک کے جاری کردہ لنگر کو بھی توسیع دی۔ اس سے معاشرے میں سکھ نظریات کی ترویج میں بہت مدد ملی۔ یہ لنگر عوام الناس کے لیے تھا۔ ہر کوئی اس سے فیض یاب ہو سکتا تھا۔ اس کے کئی فائدے ظاہر ہوئے۔ پہلا تو یہ کہ تمام لوگ اپنے معاشرتی مقام کو بالائے طاق رکھ کر ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اس سے مساوات کا عملی سبق ملا۔ باہمی ہمدردی اور رواداری کے جذبات کو فروغ ہوا اور بھائی چارے کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ دوسرے یہ کہ سکھوں میں کسی مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات پیش کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ یعنی لنگر کو جاری رکھنا اور اسے مزید ترقی دینا پوری سکھ قوم کا مشترکہ مقصد بن گیا۔ یہ احساس سکھوں کے سیاسی قوت بننے میں بہت ممد ثابت ہوا۔

سکھوں کو ایک قوم کی حیثیت سے منظم کرنے کے لیے ابتدائی اقدامات گورو انگد نے کیے۔ اسی کی استوار کی ہوئی بنیادوں پر باقی کام ہوا۔

تیسرے گورو امر داس نے اپنے پیروؤں کی تنظیم کی جانب خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے اپنے بائیس نائب مقرر کیے۔ ہر ایک کے لیے علاقے مخصوص کیے گئے، جہاں وہ مذہبی تبلیغ کے علاوہ اپنے ماننے والوں کے اخلاق و کردار کی بھی اصلاح کرتے تھے۔ یعنی انہوں نے بائیس ذیلی گدیاں قائم کیں۔ جہاں سے سکھوں کو دینی اور دنیاوی معاملات کے متعلق ہدایات ملتی تھیں۔ ان ذیلی گدیوں کو ''منجا'' کہا جاتا تھا۔ جس کے معنی چارپائی کے ہیں۔ اب مرکزی مقام ''گدی'' اور صوبائی مقامات ''منجا'' سے موسوم ہوتے تھے۔ علیحدگی کی طرف یہ بھی ایک اہم اور دوررس نتائج کا حامل تھا۔ اس سے جہاں تبلیغ میں روزافزوں ترقی ہوئی۔ وہاں سکھوں کی الگ قومی حیثیت کی تشکیل کو بھی تقویت ملی۔

تیسرے گورو کا عہد اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ انہوں نے سکھوں کو ایک روحانی مرکز دیا۔ یعنی امرتسر شہر کی بنیاد رکھی جو اگرچہ ابتداء میں تو سکھوں کا روحانی اور مذہبی مرکز تھا۔ لیکن مآل کار یہی جگہ ان کا سیاسی گڑھ بنی۔ شہنشاہ اکبر نے گورو کو پانچ سو بیگھہ زمین دی

تا کہ اس اراضی پر شہر بسایا جا سکے۔ شروع میں تالاب کے کنارے صرف گوروامر داس کی جھونپڑی ہوتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سکھوں نے اطراف و جوانب سے اس مقام پر بسنے کے لیے آنا شروع کر دیا۔ اوّل اوّل اس جگہ کو "رام داس پور اور پھر گورو کا چک" کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں اسے امرتسر کہا جانے لگا۔ یعنی وہ جگہ جہاں 'مقدس پانی کا تالاب' ہے۔

گوروامر داس کا ایک نئے شہر کی تعمیر کرانا زبردست سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔ اب تک سکھ روحانی عقیدت واحترام کی حامل کسی مرکزی جگہ سے محروم تھے، لیکن اب انہیں دینی اور دنیاوی امور کے سلسلے میں ایک مرکز سے ہدایات ملنے لگیں اور ان کی قومی زندگی اور زیادہ منضبط ہوگئی۔ اس کے اثرات پانچویں اور چھٹے گورو کے دور میں ظاہر ہوئے۔

گوروامر داس کے عہد کا آخری اہم واقعہ گوریائی کو ایک ہی خاندان کے لیے مختص کرنا ہے۔ انہوں نے گدی کو خاندانی میراث بنا دیا جبکہ پہلے مذہب کی بیش از بیش خدمت ہی معیارِ نیابت تھا۔ گوروامر داس نے اپنے داماد رامداس کو اپنی بیٹی کے کہنے پر اپنا جانشین مقرر کیا۔ گورو کی یہ بیٹی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ انہی خدمات کا گورو نے یہ صلہ دیا۔ بعد کے چھ گورو اسی عورت کے بیٹے، پوتے تھے۔ سیاسی نقطہ نظر سے سکھوں کی قومی تنظیم کے سلسلے میں یہ ایک بڑا اقدام تھا۔ پہلے سکھوں کی عقیدت کو ایک مخصوص مقام کی طرف منعطف کیا گیا اور اب دینی اور دنیاوی معاملات میں رہنمائی کے لیے ایک خاص گھرانے کو ان کی توجہ کا مرکز بنا دیا گیا۔ اس سے ان میں مزید مرکزیت پیدا ہوئی۔

گورورامداس کے عہدِ گوریائی میں صرف گوروامر داس کے وضع کردہ نظام کو تندہی سے عملی صورت دی گئی۔ اس کے اثرات بھی پانچویں اور چھٹے گورو کے زمانے میں سامنے آئے۔

پانچویں گورو ارجن دیو کا دور سکھوں کی سیاسی تنظیم کی تاریخ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ گورو ارجن اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کا مالک ہونے کے علاوہ بڑا وقت شناس اور مصلحت بین مدبّر بھی تھا۔ اس کے دور میں بہت سے تنظیمی کام ہوئے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے

فرقے کی اقتصادی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے اپنے ماننے والوں کی طرف سے رضا کارانہ طور پر پیش کی جانے والی رقوم کو مذہبی خزانے تک پہنچانے اور پھر انہیں خرچ کرنے کے انتظام کو بہتر بنایا اس طرح بہت جلد ایک بڑا خزانہ جمع ہو گیا اور تبلیغ کے سلسلے میں مالی مشکلات حائل نہ رہیں۔

جب مالی آسودگی آئی تو گوروارجن نے اپنے پیرووں کو تجارت کی ترغیب دی، جس پر پہلے زیادہ تر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ اس نے اپنے فرقے کے لوگوں کو گھوڑوں کی خرید وفروخت کے لیے بلخ، بخارا اور ترکی بھیجا۔ ہندوستان کی تاریخ میں تجارت کی غرض سے دریائے سندھ عبور کرنا، ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ کیونکہ اب تک کی تجارت دریائے سندھ تک ہی محدود تھی۔ اس تجارت سے سکھوں کو بہت فائدہ ہوا۔ گوروارجن نے حکم دیا کہ منافع کا دس فیصد مذہب کی ترویج وترقی کے لیے گورو کو دیا جائے۔ اس کو ''دسوند'' کہا جاتا تھا۔ اس طرح جب مختلف ذرائع سے گورو کے پاس بہت خزانہ جمع ہو گیا تو اس نے اپنے پیشرؤں کے سادہ طرز بود و ماند کو چھوڑ کر رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گزارنی شروع کر دی۔ اس نے کئی جگہوں پر عالیشان عمارتیں تعمیر کرائیں اور تالاب بنوائے۔ وہ عمدہ لباس استعمال کرتا۔ سینکڑوں ترکی گھوڑے اور دیوہیکل ہاتھی اس کے اصطبل میں موجود تھے۔ وہ درباداری کے تمام لوازامات فراہم کر کے امراء کی طرح رہنے لگا۔ سکھ اسے ''سچا بادشاہ' کہتے تھے۔ غرضیکہ اس کے دربار کی حیثیت مغل سلطنت کے اندر ایک ایسی مملکت کی ہوگئی، جو اپنے بیشتر معاملات میں دہلی کی اطاعت ضروری نہ سمجھتی تھی۔ پنتھ پرکاش کے مصنف نے سکھوں کی اقتصادی حالت کی بتدریج تبدیلی کو ایک دلچسپ مثال سے واضح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مال ومنال اور جاہ وحشمت گورونانک سے بارہ کوس دور تھے۔ گوروانگد سے ان کا فیصلہ چھ کوس رہ گیا۔ گوروامرداس کے زمانے میں یہ گورو گھر کے دروازے تک آ پہنچے۔ گورورامداس کے قدموں تک انہیں رسائی ہوئی اور گوروارجن نے انہیں اپنا لیا۔ یعنی چار گورو امیرانہ طریقِ معاشرت سے بڑی حد تک مجتنب ہوئے جبکہ گوروارجن نے وقت کے

بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیا۔

یہ معاشی خوشحالی سکھوں کے سیاسی قوت بننے کی جدوجہد میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے معاشرے میں ان کی قدر و منزلت اتنی بڑھی کہ لاہور کے دیوان چندو شاہ نے ازخود گوروارجن کو پیشکش کی کہ وہ اپنے لڑکے ہرگوند کی شادی اس کی بیٹی سے کرے۔ لیکن گوروارجن نے کسی وجہ سے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ یہیں سے سکھ قوم اور مغل حکومت کے درمیان تصادم کا آغاز ہوا۔ گوروارجن کے استرداد کو چندو شاہ نے اپنی توہین پر محمول کیا اور انتقام کے لیے موقع تلاش کرنے لگا۔ اس کے لیے اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا یعنی باغی شہزادہ خسرو کو گوروارجن کی طرف سے حمایت کی مبینہ پیشکش۔ بالآخر یہی واقعہ گوروارجن کی موت کا باعث بنا۔ اس واقعہ کی تفصیل اور مستقبل میں اس کے سیاسی اثرات قبل ازیں بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس لیے اس کا اعادہ ضروری نہیں صرف اس قدر کہنا مقصود ہے کہ دونوں واقعات کی اصل وجہ سکھوں کی اقتصادی فارغ البالی تھی جس نے معاشرے میں ان کے گورو کی اہمیت کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ لاہور کا دیوان اس سے اپنی رشتہ داری قائم کرنے کے لیے تیار ہو گیا، مگر گوروارجن نے انکار کی راہ اختیار کی۔ اس پر سکھ یہ سمجھنے لگے کہ اب انہیں پرامن طرزِ حیات چھوڑ کر جارحانہ ڈگر اختیار کرنی چاہیے۔

سکھ فرقے کی سیاسی تنظیم میں ابتدائی مراحل کے یہ دو واقعات انتہائی اہم ہیں۔ انہی کے بعد سکھوں میں سیاسی قوت حاصل کرنے کا احساس زیادہ شدت سے پیدا ہوا۔ دوسری طرف حکومت بھی ان کے عزائم سے آگاہ ہو چکی تھی اور وہ ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے لگی۔ گویا اب گوروارجن دیو کے عہد میں سکھ فرقے کی جداگانہ حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔

گوروارجن کے بعد اس کا لڑکا ہرگوند گدی نشین ہوا۔ گوروارجن نے اس کو وصیت کی تھی کہ اب تم گورو گدی پر دو تلواریں حمائل کر کے بیٹھا کرو۔ یہ ذہنیت سکھوں کی سیاسی تفوق حاصل کرنے کی تڑپ کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ ان کی خوش نصیبی ہے انہیں ہرگوبند جیسا قائد مل گیا۔ جس نے ایک منجھے ہوئے سیاستدان کی طرح ان کی رہنمائی کی اور انہیں مقصد سے

بہت قریب کر دیا۔ ہرگوبند کی خدمات کا مفصل ذکر بھی پہلے کیا جا چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہرگوبند نے باپ کی جمع شدہ دولت سے ایک فوج منظم کی اور سکھوں کو سپاہیانہ زندگی کی جانب رغبت دلائی۔ اس کام میں مذہب پر قربان ہونے کے لیے سکھوں کا حد سے بڑھا ہوا جذبہ اس کے بہت کام آیا اور وہ بہت جلد ایک قابلِ ذکر فوجی قوت کا مالک بن گیا۔ اس کے بعد شاہجہاں سے اس کی دو جنگیں ہوئیں اور ہرگوبند دونوں میں کامیاب رہا۔ ان فتوحات سے سکھوں کا عزم وحوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور انہیں اپنا مستقبل امید افزا دکھائی دینے لگا۔ سکھوں کو ولولہ تازہ دینا ہرگوبند کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس گورو کے عہد کا ایک اہم واقعہ اس کی گرفتاری ہے۔ جس کے دوران یہ ثابت قدم رہا اور حکومت کے سامنے سرنگوں نہ ہوا۔ بالآخر اسے حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش پر رہا کر دیا گیا۔

گورو ہررائے اور گورو ہرکشن کا عہد سیاسی جدوجہد کے اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کے دور کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں کیونکہ جہانگیر اور شاہ جہاں کی کارروائیوں کی وجہ سے سکھوں پر حکومت کا دبدبہ طاری ہو گیا تھا۔ صرف ایک مرتبہ اورنگ زیب عالمگیر نے گرنتھ صاحب کے بعض اندرجات کی وضاحت کے لیے گورو ہررائے کو دربار میں طلب کیا تھا۔ لیکن ہررائے نے رام رائے کے ذریعے اپنی صفائی پیش کر دی۔ اس کے بعد اورنگ زیب نے اس سے مزید تعرض نہ کیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سکھوں میں گدی کے مسئلے پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ رام رائے خود گدی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ معاملہ اورنگزیب کے پاس پہنچا جس نے رام رائے سے دوستی کے باوجود ہرکشن کے حق میں فیصلہ دیا۔ ان دونوں گوروؤں کے زمانے میں حکومت اور سکھ پنتھ کے تعلقات بڑی حد تک خوشگوار رہے اور ان میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوئی اور سکھ فرقہ پرامن فضا میں نئے خطوط پر ترقی کرتا رہا۔

گورو تیغ بہادر، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا معاصر تھا۔ اورنگ زیب اشاعتِ اسلام کے لیے زبردست جذبہ رکھنے والا حکمران تھا۔ وہ کسی قسم کی خلاف اسلام سرگرمیوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر گورو تیغ بہادر نے پنجاب میں اپنے مذہب کی زور وشور سے تبلیغ

شروع کی۔ بلکہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ہندوؤں کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ کیا اور بعض مقامات پر قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش بھی کی۔ اس پر اورنگ زیب نے گورو کو دہلی طلب کیا۔ اس سے باز پرس کی گئی تو اس نے مسلسل غیر معقل رویے کا مظاہرہ کیا جس پر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کی ذمہ داری اورنگ زیب پر کم اور گورو پر زیادہ عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ گورو اور اسکے پنتھ کی فتنہ انگیزیوں کی وجہ سے اورنگ زیب کو یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا تھا۔

پنجاب کی سیاسی صورتحال پر اس قتل کا فوری اثر ہوا۔ مالوہ اور دوآبہ کے علاقوں میں تیغ بہادر کافی مقبول تھا۔ اس لیے اس کے قتل پر ان علاقوں میں مغل حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات ابھرنے لگے اور غیر مسلم عوام میں بے چینی بڑھنے لگی، لیکن چونکہ حکومت مضبوط تھی، اس لیے فوری طور پر کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی۔ سکھوں نے اس واقعہ کو گورو ارجن اور گورو ہرگوبند کے خلاف حکومت کی انتقامی کارروائیوں کے پس منظر میں دیکھا اور اب چونکہ تیغ بہادر کی قیادت میں وہ قدرے منظم بھی ہو چکے تھے، لہٰذا انہوں نے گورو گوبند سنگھ کی سرکردگی میں گورو تیغ بہادر کی موت کا انتقام لینے کے لیے مسلح جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یعنی گورو تیغ بہادر کی موت کا واقعہ پنجاب میں مغل اقتدار کو ختم کرنے کی سکھ کوشش کا فوری سبب بنا۔

سکھوں نے اگرچہ گورو گوبند سنگھ کو اپنا پیشوا تو مان لیا لیکن ابھی وہ بہت کم سن اور ناتجربہ کار تھا اور ابھی اسے اپنے آپ کو ایک قابلِ اعتماد قائد ثابت کرنا تھا تا کہ سکھ قوم اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ اس کے منصوبوں کا ساتھ دے سکے۔ اس کام کے لیے اسے وقت درکار تھا۔ دوسرے سکھوں میں اگرچہ جوش و جذبہ تو بہت تھا اور تنظیم بھی کچھ نہ کچھ تھی ہی، لیکن فی الوقت وہ اپنے محدود وسائل کے باوصف کسی طویل فوجی جدوجہد کے لیے تیار نہ تھے، جبکہ ان کا مقابلہ دہلی کی مضبوط اور طاقتور حکومت سے تھا، جس کے وسائل لامحدود تھے اور جس کی سربراہی اورنگ زیب جیسے بیدار مغز اور آہنی عزم رکھنے والے حکمران کے ہاتھ میں تھی۔ تیسرے یہ کہ گورو تیغ بہادر کے واقعۂ قتل کے بعد حکومت سکھوں کی سرگرمیوں پر

برابر نگاہ رکھے ہوئے تھی تا کہ یہ لوگ کسی طرح اشتعال انگیزی نہ کریں۔

ان تین وجوہ کی موجودگی میں گورو گوبند سنگھ نے ایک دوررس سیاسی فیصلہ کیا۔ یعنی وہ اپنے پیروؤں کو لے کر پہاڑوں میں چلا گیا، اور مسلسل بیس برس تک سیاسی منظر سے غائب رہا۔ اس طویل عرصے میں اس نے حکومت کی دست درازیوں سے محفوظ رہ کر خود علم حاصل کیا اور سکھوں کی فوجی تربیت کی، انہیں شدید اور مصائب کی زندگی کا عادی بنایا اور ان میں اتحاد، اطاعت اور جذبۂ قربانی پیدا کیا۔ چنانچہ جب بیس سال کے بعد وہ پہاڑوں سے اترا تو اس کے پاس ایک ایسی قوت تھی جس کے بل بوتے پر وہ مغل حکومت سے ٹکر لے سکتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ گورو گوبند ہی وہ شخص ہے جس نے سکھوں کی فکر میں انقلاب برپا کر کے انہیں لڑاکا ذہن دیا۔ ان کے تحت الشعور میں یہ حقیقت راسخ کر دی کہ اب انہیں اپنی بقاء کے لیے صرف ہتھیار کا سہارا لینا ہوگا۔ یعنی خالصہ دل کی تشکیل، گورو گوبند سنگھ کی کاوشوں کی رہینِ منت ہے اور پنجاب میں سکھ حکومت کا قیام انہیں کی کاوشوں کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگرچہ وہ خود ان نتائج کے سامنے آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گیا، لیکن اس کی منظم کی ہوئی گوریلا فوج نے حصولِ مقصد میں بے حد اہم کردار ادا کیا اور یہ حربہ بھی اس طریق تربیت کا ایک اہم جزو ہے کہ جب حریف طاقتور ہو تو تصادم سے بچنا چاہیے، مگر جب موقعہ ملے تو پھر اپنے حریف پر کاری ضرب لگائے جائے۔ مستقبل میں سکھوں نے اسی حربے پر سب سے زیادہ عمل کیا۔

گورو گوبند سنگھ نے میدانوں میں پہنچتے ہی امنِ عامہ کے منافی سرگرمیاں شروع کر دیں جس کے بعد شاہی افواج اور سکھ جتھوں کے درمیان مسلح جھڑپیں ہونے لگیں اور گورو گوبند سنگھ گرفتاری سے بچنے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنے لگا۔ اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سکھوں کے اشتعال میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور حکومت سے مصالحت کے تمام امکانات معدوم ہو گئے۔ یہ گورو گوبند سنگھ کے دو کمسن لڑکوں کے سرہند میں قتل کا واقعہ ہے، جس کی تفصیل پہلے آ چکی ہے۔ اس واقعہ پر گورو گوبند سنگھ نے اپنی

وصیت میں سکھوں سے کہا تھا کہ اگر تمہیں کبھی موقع ملے تو سرہند والوں سے ضرور انتقام لینا۔ چنانچہ جب کچھ عرصے بعد بندہ بیراگی نے سرہند پر قبضہ کیا تو اس نے وہاں خوب تباہی مچائی۔ یہ گورو کی وصیت کا اثر ہے کہ آج بھی جب کوئی سکھ سرہند جاتا ہے تو شہرِ پناہ کی دو اینٹیں اٹھا کر دریا میں پھینک دیتا ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ واقعہ سکھوں کے لیے کتنا دلسوز تھا اور اس سے ان کے جذبات میں کس قدر تلاطم آ گیا تھا۔

سرکاری فوج سے گورو گوبند سنگھ کے کئی تصادم ہوئے لیکن سرکاری فوج اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہی کیونکہ وہ ہر بار انہیں جل دے کر نکل جاتا تھا۔ اگرچہ اورنگ زیب اپنی دکن کی مصروفیات کے باعث سکھوں کے قضیئے پر پوری طرح توجہ نہ دے سکا تھا، لیکن اس کے باوجود تھوڑی ہی مدت میں سکھوں کی طاقت مضمحل ہوگئی اور گورو گوبند سنگھ، اورنگ زیب سے کسی سیاسی تصفیے کی گفت وشنید کے لیے دکن جانے پر آمادہ ہوگیا۔ جہاں بادشاہ سے اس کی چند ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ اگرچہ ان کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اسی دوران میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا اور بہادر شاہ اوّل تخت نشین ہوا۔ اس سے گورو کے تعلقات کچھ بہتر ہو چکے تھے، لیکن کچھ عرصے بعد وہیں 1708ء میں ناندیر کے مقام پر کسی دشمن نے گورو گوبند سنگھ کو قتل کر دیا۔ دکن ہی میں قتل کے واقعہ سے کچھ عرصہ پیشتر گورو گوبند سنگھ کی بندہ بیراگی سے ملاقات ہوئی۔ بہت کم وقت میں یہ شخص گورو کے بہت قریب آ گیا۔ گورو نے بھی اسے اعتماد کے قابل سمجھا اور اسے اپنے ماضی سے آگاہ کر کے اپنا ادھورا کام اس کے سپرد کیا۔

یہ تھے وہ چیدہ چیدہ اسباب و واقعات جن کے باعث سکھ بتدریج پنجاب کے سیاسی افق پر پھیلتے گئے اور بالآخر بندہ بیراگی کے زمانے میں ان کی فوجی قوت اس قدر بڑھ گئی کہ مغل حکومت بھی ایک عرصے تک ان کے سامنے بے بس رہی حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف میں پنجاب عملاً ان کے قبضے میں آ گیا۔ ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے واقعات ہیں، جنھوں نے سکھوں کے منتقمانہ جذبات کو اور زیادہ برانگیختہ کیا اور ان کی شوریدہ سری کو ہوا دی۔ مثلاً ان کے بعض سربرآوردہ مذہبی رہنماؤں کے خلاف حکومت کی انتقامی

کارروائی۔ ان میں سے مانی سنگھ اور تارو سنگھ کا قتل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ لوگ سکھوں میں بہت محترم سمجھے جاتے تھے۔

گورو گوبند سنگھ کے قتل کے بعد بندہ بیراگی پنجاب آیا اور سکھوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ ان کی صفوں سے شکستگی دور کی اور پنجاب کے طول وعرض میں قتل وغارت کا بازار گرم کر دیا۔ امن وامان تہہ و بالا ہو گیا، عوام میں خوف و ہراس پھیل گیا اور لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر محفوظ علاقوں کی طرف بھاگنے لگے۔ مغل افواج نے بندہ بیراگی کے خلاف کئی مرتبہ کارروائی کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر 1716ء میں بادشاہ فرخ سیر نے بندہ کے استیصال کی مہم لاہور کے حاکم عبدالصمد دلیر جنگ کے حوالے کی جس نے ایک سخت معرکے کے بعد بندہ بیراگی کو گرفتار کر لیا۔ بعدازاں اسے اور اس کے ہمراہیوں کو دہلی لے جا کر قتل کر دیا گیا۔

سکھ اس واقعہ کو قتل عام کہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کہتے وقت انہیں بندہ بیراگی کی وحشت وبربریت اور بہیمیت سے پُر داستانیں بھی پیشِ نظر رکھنی چاہئیں۔

اس واقعہ کے بعد آٹھ دس سال تک سکھ دبے رہے، لیکن 1730ء کے لگ بھگ وہ پھر حکومت کا سامنا کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ اب بڑے بڑے سکھ سرداروں نے جا بجا اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں، جنہیں مسل کہا جاتا تھا۔ پنجاب میں اس قسم کی بارہ مسلیں تھیں۔ یہ سکھ سردار بیساکھی کے موقع پر امرتسر میں جمع ہوتے اور مستقبل کے لیے لائحۂ عمل طے کرتے۔

ان مسلوں میں سے سب سے بڑی ''بھنگی مسل'' تھی، جس نے لاہور فتح کیا۔ یہ مسل لاہور پر 1799ء تک حکمران رہی۔ یہاں تک کہ اس سال سکر چکیہ مسل کے سردار رنجیت سنگھ نے کنھیا مسل کے تعاون سے بھنگی مسل کو شکست دی اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ان واقعات پر آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

○

مہاراجہ رنجیت سنگھ

خاندانی پس منظر:

مہاراجہ رنجیت سنگھ 13 نومبر 1780ء کو گوجرانوالہ کے مقام پر سردار مہان سنگھ کے ہاں پیدا ہوا۔ سردار مہاں سنگھ سکرچکیہ مسل کا سربراہ تھا۔ جو سکھوں کی بارہ مسلوں میں سے ایک مشہور مسل ہے۔ اس مسل کی ابتداء رنجیت سنگھ کے دادا چڑٹ سنگھ نے کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کے حملے جاری تھے۔

رنجیت سنگھ کے بزرگ کاشتکار تھے اور خاصی دیر سے گوجرانوالہ کے نواحی موضع سکر چک میں آباد تھے۔ اس خاندان کا پہلا فرد جس نے ہندو مت ترک کر کے سکھ مت اپنایا وہ بدھول تھا۔ اس نے گورو ہررائے کے ہاتھ پر سکھ دھرم قبول کیا۔ نیا دھرم اختیار کرنے کے بعد اس کا نام بدھو سنگھ ہوا۔ بدھو سنگھ مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا۔ اس کی جسمانی ساخت بھی اچھی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے جیسوں کا ایک گروہ منظم کیا اور ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔ اس کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے آس پاس کے علاقے پر اس کی ہیبت طاری ہوگئی۔ اس نے موضع سکر چک میں اپنے رہنے کے لیے ایک کافی وسیع اور مضبوط مکان تعمیر کرایا۔ بدھ سنگھ کے بعد اس کے دونوں بیٹوں نے بھی باپ کے نقشِ قدم پر قدم رکھا اور لوٹ مار کرتے رہے۔ اس کا بڑا لڑکا نودھ سنگھ بہت جنگجو اور بہادر تھا۔ اس نے اپنے گروہ میں اضافہ کیا اور دور دور تک خوف و ہراس پیدا کر دیا۔ اسی کے عہد میں نادر شاہ نے برصغیر پر حملہ یا۔ جب نادر شاہ واپس جا رہا تھا تو نودھ سنگھ نے فیصل پوریہ مسل کے سردار کپور سنگھ کی معاونت سے

نادر شاہ کے عقب پر چھاپہ مارا اور اس کا کافی سامان لوٹ کر بھاگ گئے۔ نودھ سنگھ کے ان کارناموں کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور پنجاب کے تمام ساکھ سردار اس کا احترام کرنے لگے۔ نودھ سنگھ 1756ء میں فوت ہوا۔

نودھ سنگھ کے چار بیٹے تھے، جن میں سب سے بڑے چڑت سنگھ کی عمر باپ کی موت پر صرف بیس برس کی تھی۔ رنجیت سنگھ کے خاندانی پس منظر میں چڑت سنگھ کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جب گروہ کی قیادت اس کے ہاتھ آئی تو اس وقت تک پنجاب کے طول و عرض میں مختلف مسلیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان مسلوں میں بھنگی مسل اور اہل والیہ مسل کو سب سے زیادہ ناموری حاصل تھی۔ چنانچہ چڑت سنگھ نے بھی اپنی ایک الگ اور خود مختار مسل قائم کرنے کا تہیہ کیا۔ چڑت سنگھ قائدانہ صلاحیتیں رکھتا تھا۔ اس نے بہت سے مہم جو نوجوانوں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا اور صرف دو سال کی کوششوں کے بعد اس نے اپنی مسل کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اس جدوجہد میں اسے اپنے خسر امر سنگھ کی مکمل حمایت حاصل رہی۔ بہت کم عرصے میں اس نے سکھوں میں اہم مقام پیدا کر لیا اور بڑی تعداد میں سکھ اس کے جتھے میں شامل ہو گئے۔ اب اس نے ملک گیری کا منصوبہ بنایا۔ سب سے پہلا حملہ اس نے ایمن آباد پر کیا اور وہاں سے کافی اسلحہ اور سامان لوٹ لیا۔ اس کامیاب مہم کے بعد اس کے عزائم بہت بلند ہو گئے۔ اس نے گوجرانوالہ میں ایک مستحکم قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ ایمن آباد کے واقعہ کے بعد لاہور کے حاکم عبید خان نے ایک دستہ گوجرانوالہ کی جانب روانہ کیا تاکہ چڑت سنگھ کی بڑھتی ہوئی خلاف قانون سرگرمیوں کو روکا جا سکے لیکن یہ مہم کچھ زیادہ کامیاب نہ رہی، جس سے چڑت سنگھ کے حوصلے مزید بڑھ گئے اور اس نے اطراف و جوانب کے سرداروں کو پے در پے شکستیں دیں۔ وہ چند سال تک توسیع پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں جہلم، رام نگر، پنڈ دادنخان، سیالکوٹ، سارا پوٹھوار اور دھنی کا تمام علاقہ اس کے زیر نگیں آ گیا۔ اس نے رہتاس کا مشہور قلعہ بھی فتح کر لیا۔ کھیوڑہ کی نمک کی کان قبضے میں آنے سے اس کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اس کے مقبوضات کی سالانہ وصولی تین

لاکھ ہوگئی۔ سردار چڑت سنگھ کی اس روز افزوں ترقی سے بھنگی مسل کے قائدین بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ دونوں مسلوں کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں۔ بالآخر 1771ء میں ایسی ہی ایک محاذ آرائی کے دوران میں چڑت سنگھ جب اپنی نئی بندوق کی آزمائش کر رہا تھا کہ بندوق چھوٹ گئی اور چڑت سنگھ اپنی ہی گولی سے ہلاک ہوگیا۔

سردار چڑت سنگھ نے اپنے پیچھے دو کم سن لڑکے چھوڑے۔ اس کی وفات کے وقت بڑا لڑکا مہان سنگھ صرف دس برس کا تھا۔ ان لڑکوں کی ماں، مائی ویساں بڑی جہاندیدہ اور زیرک عورت تھی۔ اس نے مہان سنگھ کے نام مسل کے انتظامی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس کے علاوہ اس نے ہمسایہ مسلوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لیے شہنشاہ اکبر کی روایت پر عمل کیا۔ یعنی رشتوں ناتوں کے ذریعے اپنے وقت کو ضائع ہونے سے بچایا۔ چنانچہ مائی دیساں نے اپنی بیٹی کی شادی بھنگی مسل کے سردار، جے سنگھ کے لڑکے صاحب سنگھ سے کی۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے لڑکے مہاں سنگھ کی شادی ریاست جنید کے سردار کی بیٹی سے کی۔ ان شادیوں کی وجہ سے کچھ عرصے تک کے لیے سکر چکر یہ مسل کو بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اپنی بنیادیں مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ جب مہان سنگھ سنِ شعور کو پہنچا تو اس نے مسل کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے اور باپ کی طرح فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے اس نے رہتاس کے قلعے پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اس نے سیالکوٹ کے قریب ایک قصبے، کوٹلی لوہاراں کو فتح کیا۔ یہاں کے کاریگر بندوقیں بنانے کے بہت ماہر تھے۔ مہان سنگھ نے ان سے اپنے سپاہیوں کے لیے جدید بندوقیں بنوائیں۔ جس سے اس کی حملہ کرنے کی استعداد میں بہت اضافہ ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے رسول نگر پر حملہ کیا۔ وہاں کا پٹھان حاکم پیر محمد خان بڑی بہادری سے لڑا، لیکن شکست کھائی۔ مہان سنگھ نے قصبے کا نام رسول نگر سے بدل کر 'رام نگر' رکھ دیا۔ اسی طرح جب اس نے انہی پٹھانوں کی دوسری بستی علی پور پر قبضہ کیا تو اس جگہ کا نام بھی تبدیل کر کے 'اکال گڑھ' رکھ دیا۔

رنجیت سنگھ کی پیدائش:

سردار مہان سنگھ جب رسول نگر کے معرکے سے کامیاب واپس گوجرانوالہ پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا ہے۔ یہ خوش کن خبر سن کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ چونکہ وہ ابھی ابھی جنگ جیت کر آیا تھا اس لیے اس نے نومولود کا نام بھی 'رنجیت سنگھ' رکھا۔ رنجیت سنگھ نام رکھنے میں اس کی یہ توقع بھی شامل تھی کہ بڑا ہو کر یہ بچہ مردِ میدان ہو۔ اس کی یہ توقع حیرت انگیز طور پر پوری ہوئی اور آج رنجیت سنگھ پنجاب کے ایک اہم ترین فاتح اور حکمران کی حیثیت سے معروف ہے۔

مختلف معرکوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سردار مہان سنگھ کی شہرت پنجاب کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے نامور سکھ سردار اس کے پرچم تلے جمع ہونے شروع ہو گئے اور مہان سنگھ کی فوجی طاقت آس پاس کی مسلوں سے بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ اپنی طاقت کی دھاک جمانے کے لیے اس نے ساہیوال، پنڈی بھٹیاں اور عیسیٰ خیل وغیرہ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں اسے عوام اور چھوٹے چھوٹے سرداروں سے خاصی بڑی رقم نذرانے کے طور پر حاصل ہوئی۔ یہ دورہ مکمل کرنے کے بعد سردار مہان سنگھ نے جموں پر فوج کشی کی جہاں اس زمانے میں اقتدار کا جھگڑا چل رہا تھا۔ انتشار کی وجہ سے جموں کا راجا برج راج دیو، مہان سنگھ کا حملہ نہ روک سکا اور ترکوٹہ کے پہاڑوں کی طرف فرار ہو گیا۔ مہان سنگھ نے جموں کے عوام کو لوٹا۔ یہ شہر اپنی امارات کی وجہ سے مشہور تھا۔ چنانچہ یہاں سے اسے کافی مالِ غنیمت حاصل ہوا۔

اس مہم سے واپسی پر سردار مہان سنگھ نے کچھ دن گوجرانوالہ میں آرام کیا اور اسی سال دیوالی کے تہوار کے موقع پر امرتسر گیا۔ جہاں دوسرے تمام سکھ سردار بھی جمع تھے۔ ان میں کنھیا مسل کا سربراہ، سردار جے سنگھ بھی تھا جو اپنی ذاتی بہادری اور مسل کی لڑاکا قوت کی وجہ سے سکھ فرقے میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر

سردار مہان سنگھ بھی اسے ملنے کے لیے اس کی فرودگاہ میں گیا، لیکن وہاں جا کر سردار مہان سنگھ نے اس کے ساتھ بڑا ہتک آمیز سلوک کیا اور ان دونوں میں تلخ کلامی بھی ہوئی۔ سردار مہان سنگھ نے اس وقت تو یہ بات بڑھانے سے گریز کیا کیونکہ اسے معلوم ہوا کہ اس کی طاقت جے سنگھ کی طاقت سے خاصی کم ہے۔ لیکن بعد میں اس نے سردار جے سنگھ کو اس کے کبر ونخوت کا مزا چکھانے کے لیے سردار جے سنگھ کے مخالفوں سے ساز باز شروع کر دی۔ ان میں سے رام گڑھ مسل کے سردار جسا سنگھ اور کانگڑہ کے راجا سنسار چند نے اس سے تعاون کرنے پر آمادگی ظاہر کی کیونکہ ان دونوں کے علاقے سردار جے سنگھ نے ہتھیا رکھے تھے۔ چنانچہ ان سرداروں نے مل کر سردار جے سنگھ پر یورش کی۔ جے سنگھ نے اپنے لڑکے سردار گوربخش سنگھ کو مقابلے کے لیے بھیجا۔ دونوں فوجوں میں شدید جنگ ہوئی جس میں کنھیا فوج کو شکست ہوئی اور سردار گوربخش سنگھ مارا گیا۔ سردار مہان سنگھ کا بٹالہ پر قبضہ ہو گیا۔ جو کنھیا مسل کا صدر مقام تھا۔ اس ہزیمت کی وجہ سے سردار جے سنگھ کا سارا غرور یک لخت ختم ہو گیا اور اس نے صلح کی درخواست کی۔ اس نے جسا سنگھ اور سنسار چند کے مقبوضہ علاقے خالی کرنے اور سردار مہان سنگھ کو تاوانِ جنگ کی ایک معقول رقم دینے کا وعدہ کیا چنانچہ ان شرائط پر جنگ ختم ہو گئی۔

سردار جے سنگھ بوڑھا ہو چکا تھا۔ دوسرے اب اس شکست اور جوان بیٹی کی موت کی وجہ سے وہ حزن و یاس کا شکار ہو گیا۔ اس حالت میں اس نے اپنی مسل کے مستقبل کو جنگ کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے سردار مہان سنگھ کے اکلوتے بیٹے رنجیت سنگھ سے اپنے لڑکے گوربخش کی اکلوتی بیٹی مہتاب کور کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے اس خیال کی سب سے بڑی محرک گوربخش سنگھ کی بیوہ رانی سدا کور تھی۔ سدا کور بھی بڑی سوجھ بوجھ والی خاتون تھی۔ مستقبل میں اس نے رنجیت سنگھ کے اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ رنجیت سنگھ سے مہتاب کور کی منگنی 1786ء میں ہوئی۔ اس رشتہ داری سے رنجیت سنگھ کو اپنے ابتدائی دور میں بے انتہا سیاسی فوائد

حاصل ہوئے۔

سردار مہان سنگھ کی بہن کی شادی بھنگی مسل کے قائد سردار گوجر سنگھ کے بیٹے سردار صاحب سے ہوئی تھی، لیکن سیاسی معاملات میں رشتہ داریاں ہمیشہ مثبت کردار ادا نہیں کرتیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔ یعنی جب 1790ء میں گوجر سنگھ مر گیا اور صاحب سنگھ اس کا جانشین ہوا تو مہان سنگھ نے صاحب سنگھ سے حقِ حاکمانہ طلب کیا۔ صاحب سنگھ نے یہ مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر ان میں جنگ چھڑ گئی۔ ان دنوں گجرات بھنگی مسل کا مرکز تھا۔ مہان سنگھ نے گجرات پر حملہ کیا۔ صاحب سنگھ مقابلے کی تاب نہ لا کر سوہدرہ کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ مہان سنگھ نے بھی تعاقب کیا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اسی محاصرے کے دوران صاحب سنگھ بیمار ہو گیا اور محاصرہ اپنے کمسن لڑکے رنجیت سنگھ کے سپرد کر کے خود واپس گوجرانوالہ آ گیا۔ رنجیت سنگھ نے بڑی لیاقت سے محاصرہ جاری رکھا۔ اس نے اہلِ قلعہ کے لیے آنے والی کمک کو راستے ہی میں روک لیا۔ لیکن اس محاصرے کا کوئی واضح نتیجہ برآمد ہونے سے پہلے ہی 14 اپریل 1790ء کو سردار مہان سنگھ مر گیا۔ اس کی عمر صرف تیس برس تھی۔ اس نے اس مختصر وقت میں اپنی مسل کو زبردست ترقی دے کر بہت مضبوط بنا دیا۔

رنجیت سنگھ کے ابتدائی حالات:

رنجیت سنگھ 13 نومبر 1780ء دوشنبہ کو پیدا ہوا۔ سردار مہان سنگھ نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر بہت خوشی منائی اور کئی دن تک جشنِ امرت جاری رہا جس میں اس نے پنجاب کے تمام سکھ سرداروں کو بھی دعوت دی اور لاکھوں روپیہ خیرات کیا۔

رنجیت سنگھ پر بہت ہی چھوٹی عمر میں چیچک کا شدید حملہ ہوا۔ بیماری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس کی زندگی سے مایوسی ہو گئی۔ جب علاج معالجے سے کچھ آفاقہ نہ ہوا تو سردار مہان سنگھ نے آس پاس کے مشہور برہمنوں کو بلوایا اور ان سے بچے کی صحت کے لیے دعا کرائی۔

علاوہ ازیں بہت سے قیمتی تحائف کانگڑہ اور جوالا مکھی کے مندروں کو بطور نذرانہ کیے گئے۔ آہستہ آہستہ رنجیت سنگھ روبصحت ہو گیا، لیکن اس بیماری میں اس کی بائیں آنکھ ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گئی اور اس کا چہرہ بھی چیچک کے داغوں سے بدنما ہو گیا۔

تخت نشینی:

سردار مہان سنگھ اپنی زندگی میں ہی رنجیت سنگھ کو اپنا جانشین نامزد کر چکا تھا۔ چنانچہ جب مہان سنگھ 1790ء میں مرا تو رنجیت سنگھ بغیر کسی مخالفت کے گدی نشین ہو گیا اور مسل کے تمام سرکردہ افراد نے اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا۔ اس وقت رنجیت سنگھ کی عمر صرف دس سال تھی۔ رنجیت سنگھ اگرچہ مسل کا سردار تو بن گیا لیکن اس ذمہ داری پر پورا اترنے کے لیے ابھی اس کی صلاحیتیں مکمل طور پر اجاگر نہیں ہوئی تھیں۔ لہٰذا نام کا سردار تو رنجیت سنگھ ہی تھا مگر دراصل تمام اختیارات اس کی ماں مائی مالوائن کے ہاتھ میں تھے۔ وہ بڑی زیرک عورت تھی۔ اس نے اپنے خاوند کے مخلص ساتھیوں کی مدد سے مسل کا انتظام بڑی خوبی سے چلایا۔ اس دور میں جب ایک طرف مائی مالوائن اپنی مسل کو قائم رکھنے کے لیے زبردست جدوجہد کر رہی تھی تو دوسری طرف رنجیت سنگھ کی خوشدامن رانی سدا کور نے بھی رنجیت سنگھ کی بہت مدد کی۔ رانی سدا کور ان دنوں کنھیا مسل کی سربراہ تھی۔ اس نے ایک تو رنجیت سنگھ سے اپنی رشتہ داری کی بنا پر اور دوسرے سیاسی مصلحت کی وجہ سے سکر چکیہ مسل کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ تاکہ دونوں مسلیں ایک دوسرے کے سہارے زندہ رہیں۔ سردار مہان سنگھ کے پرانے دوستوں میں سے جس شخص نے سکر چکیہ مسل کے اس غیر یقینی دور میں سب سے بڑھ کر مخلصانہ خدمت کی، وہ دیوان لکھپت رائے تھا۔ یہ دیوان نوشہرہ کے ایک راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ لکھپت رائے، سردار مہان سنگھ کے عہد سے دیوان کے منصب پر فائز تھا۔ رنجیت سنگھ نے اس کی عزت و توقیر میں اضافہ کیا اور مسل کے تمام انتظامی معاملات اسی کی ذات میں مرتکز تھے۔ غرض کہ سب مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ ابتدائے عہد میں مائی

مالوائن، رانی سدا کور اور وزیر لکھپت رائے نے رنجیت سنگھ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں، ان میں سے کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں۔

حشمت خان چٹھہ کی ہلاکت:

جب مسل کی ذمہ داریاں رنجیت سنگھ کے کندھوں پر پڑیں تو اس وقت وہ کمسن تھا۔ اس کی ماں نے تمام انتظامی امور پر اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ یہ صورت تقریباً آٹھ سال تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچ کر رنجیت سنگھ نے کاروبارِ حکومت براہِ راست اپنی تحویل میں لے لیا۔ آٹھ سال کا یہ عرصہ رنجیت سنگھ نے محض کھیل کود اور سیر و شکار میں گزارا۔ وہ شکار کے تعاقب میں بعض اوقات اپنے فوجیوں کے ہمراہ اپنے شہر گوجرانوالہ سے بہت دور نکل جاتا۔ اسی طرح ایک دن وہ شکار کھیلتے کھیلتے موضع لدھے والی کی جانب نکل گیا۔ یہ علاقہ چٹھہ قبائل کے زیرِ تصرف تھا۔ اتفاق سے چٹھوں کا سردار حشمت خان بھی اسی علاقے میں شکار کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب اسے اطلاع دی گئی کہ رنجیت سنگھ قریب ہی موجود ہے تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت گھات میں بیٹھ گیا۔ چنانچہ جب نوعمر رنجیت سنگھ ادھر سے گزرا تو حشمت خان نے اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ شدید جھڑپ ہوئی۔ اس معرکے میں رنجیت سنگھ اور اس کے ہمراہیوں کے ہاتھوں حشمت خان سمیت بہت سے چٹھے مارے گئے۔ اس جنگ کے نتیجے کے طور پر چٹھہ قبائل نے رنجیت سنگھ کو اس علاقے کی برتر قوت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور اپنا کافی علاقہ بھی رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔ یہ واقعہ 1793ء کا ہے۔

رنجیت سنگھ کی پہلی شادی:

1785ء میں رنجیت سنگھ کی نسبت جے سنگھ کنھیا کی پوتی مہتاب کور سے طے پائی تھی۔ اس وقت رنجیت سنگھ کی عمر چھ برس کی تھی۔ اس لیے رخصتی بھی نہ ہوئی تھی۔ 1796ء میں

جب رنجیت سنگھ کی عمر سولہ برس ہوئی تو وہ برات لے کر بڑی دھوم دھام سے بٹالہ گیا اور دلہن لے کر راستے میں فراخدلی سے روپے لٹاتا ہوا واپس گوجرانوالہ آیا۔

کنھیا مسل کی معاونت:

1796ء میں رام گڑھیہ مسل کے سردار جسا سنگھ نے سردار جے سنگھ کی موت اور کنھیا مسل کی دگرگوں حالت سے فائدہ اٹھا کر، کنھیا مسل کے خلاف معاندانہ سرگرمیاں شروع کر دیں اور اس کے خاصے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جب رانی سدا کور بذاتِ خود جسا سنگھ کی جارحیت کو نہ روک سکی تو اس نے رنجیت سنگھ کو امداد کے لیے بلایا۔ اس پر رنجیت سنگھ اپنے مشہور سرداروں جودھ سنگھ، فتح سنگھ دھاری اور دل سنگھ وزیر آبادی کو ساتھ لے کر برق رفتاری سے بٹالہ پہنچا۔ سدا کور اور رنجیت سنگھ کی فوجوں نے مل کر 'میانی' کا محاصرہ کر لیا۔ یہ مقام رام گڑھیہ مسل کی راجدھانی تھا۔ محاصرہ تقریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ موسم سرما آ گیا اور بارشوں کی شدت کی وجہ سے رنجیت سنگھ کو محاصرہ اٹھا کر واپس جانا پڑا۔ یہ مہم اگرچہ بہت کامیاب نہ رہی، مگر اتنا ضرور ہوا کہ کنھیا مسل کو جسا سنگھ رام گڑھیہ کی آئے دن کی دست درازیوں سے نجات مل گئی۔

قلعہ لاہور میں رنجیت سنگھ کی آمد:

رنجیت سنگھ کنھیا مسل کی کمک کے لیے جاتے ہوئے جب بیرونِ لاہور پہنچا تو لاہور پر قابض سکھ سرداروں نے اس سے لاہور میں چند دن کے قیام پر اصرار کیا۔ چنانچہ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر رنجیت سنگھ نے فوج کو تو سفر جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود سردارانِ لاہور کی دعوت قبول کر لی۔ اس قیام کے دوران رنجیت سنگھ کی بڑی خاطر مدارت کی گئی۔ رنجیت سنگھ نے قلعہ لاہور کو پہلی بار اسی موقعہ پر دیکھا تھا اور وہ لاہور کی عظمت و رفعت سے شدید طور پر متاثر ہوا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ رنجیت نے اسی دورے میں لاہور پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے اس ارادے میں بہت کامیاب ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کی دوسری شادی:

رنجیت سنگھ کے خاندان میں اکثر 'سیاسی شادیوں' کا رواج تھا۔ رنجیت سنگھ کی پہلی شادی بھی سیاسی مصلحت کے تحت ہوئی تھی۔ اب اس نے اپنی حکومت میں مزید اضافہ کرنے کے لیے نکئی مسل سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔ انہی تعلقات کے نتیجے میں رنجیت سنگھ کی شادی نکئی مسل کے قائد سردار گیان سنگھ کی بہن جے کور کے ساتھ 1798ء میں ہوئی۔ اس شادی کی وجہ سے رنجیت سنگھ کو کنھیا مسل کے ساتھ ساتھ نکئی مسل کا ٹھوس تعاون بھی حاصل ہو گیا جو مستقبل میں اس کے عزائم کے لیے بہت مد ثابت ہوا۔

رنجیت سنگھ بحیثیت خود مختار سردار:

سردار مہان سنگھ جب دنیا سے رخصت ہوا تو اس وقت رنجیت سنگھ بوجہ کمسنی، شعور مملکت سے کما حقہ بہرہ یاب نہ تھا۔ اس لیے سردار مہان سنگھ نے اپنے آخری وقت میں رنجیت سنگھ کو اپنے دو انتہائی معتمدین کے سپرد کیا۔ یعنی دیوان لکھپت رائے اور سردار دل سنگھ، مہان سنگھ کا معاون بھی تھا۔ چنانچہ سردار مہان سنگھ کے بعد انہی کی مساعی سے مسل کا انتظام معطل نہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ رنجیت سنگھ کو اپنی والدہ مائی مالوائن اور اپنی خوشدامن رانی سدا کور کے مشورے بھی حاصل رہے اور یہ لوگ رنجیت سنگھ کے لیے استحکام و ترقی کا زینہ ثابت ہوئے لیکن کچھ ہی عرصے بعد سردار دل سنگھ اور دیوان لکھپت رائے کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اس سے مسل کے انتظامات میں خلل واقع ہوا۔ رنجیت سنگھ اس صورتحال کو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اور اس نے تمام اختیارات خود سنبھال کر دیوان لکھپت رائے کو دھنی کے علاقے میں کسی غیر فوجی مہم پر بھیج دیا اور سردار دل سنگھ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر لیا۔ دیوان لکھپت رائے اس سفر میں مر گیا۔ اس طرح یہ درباری کشمکش ختم ہو گئی اور رنجیت سنگھ مطلق العنان سردار کی

حیثیت سے مسندِ اقتدار پر متمکن ہوا۔ اب تک اس میں خود اعتمادی، سیاسی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔

دیوان لکھپت رائے کی معزولی کے سلسلے میں ایک دوسری روایت بھی بیان کی جاتی ہے۔ کچھ مؤرخین جن میں سید محمد لطیف کا نام بے حد اہم ہے۔ اس روایت سے اتفاق کرتے ہیں۔ جب کہ دوسرے مؤرخ اس واقعے کو قطعی بے بنیاد قرار دیتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ دیوان لکھپت رائے نے رنجیت سنگھ کی ماں مائی مالوائن سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ کچھ عرصہ تو یہ معاملہ چلتا رہا۔ بالآخر رنجیت سنگھ کو اپنے ذرائع سے اس کی خبر ہو گئی۔ رنجیت سنگھ یہ قصہ سن کر بہت غضب ناک ہوا۔ چنانچہ اس نے دیوان لکھپت رائے کو تو کسی کام سے دھنی کی طرف بھیج دیا جہاں اس کو ٹھکانے لگانے کے لیے سازش مکمل کی جا چکی تھی اور موقع پا کر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ نے اپنی ماں کی طرف توجہ کی اور اسے بھی مروا دیا بلکہ بعض مؤرخین کے مطابق اسے اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ اب اس نے سردار دل سنگھ کو اپنا وزیراعظم مقرر کیا اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر حکومت کرنے لگا۔

شاہ زمان اور پنجاب:

احمد شاہ ابدالی والیٔ کابل نے پنجاب پر متعدد حملے کیے۔ ان میں اس کا پانچواں حملہ، جو اس نے 1761ء میں کیا، فیصلہ کن نتائج کا حامل تھا۔ جب کہ اس کے بقیہ حملے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ پنجاب پر سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اپنے آبائی ملک افغانستان میں حالات کی خرابی سے عہدہ برآ ہونے میں مصروف رہا، لیکن ان دونوں محاذوں پر اسے کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ مرہٹوں سے جنگ کے بعد اس نے سکھوں سے بھی ایک نتیجہ خیز معرکہ لڑنے کا فیصلہ کیا اور اسی مقصد کے تحت وہ 1761ء کے بعد کئی بار پنجاب میں وارد ہوا لیکن سکھ ہر بار اسے جل دے کر نکل جاتے۔ یوں

ابدالی اور سکھوں میں کھلی جنگ کی نوبت نہ آئی۔ کابل سے پنجاب آنے میں احمد شاہ کی خاصی مالی اور افرادی قوت ضائع ہو جاتی۔ لیکن سکھ اس کے آنے کی خبر سنتے ہی فوراً میدانوں سے روپوش ہو جاتے۔ جس سے ان کی قوت محفوظ رہتی اور دو ایک ماہ پنجاب میں گزارنے کے بعد احمد شاہ ابدالی واپس کابل چلا جاتا۔ ادھر کابل میں بغاوتوں وغیرہ کی وجہ سے حالات مزید ناگفتہ بہ ہوگئے۔ اس نے حالات پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا اور اسی کشمکش کے دوران 1773ء میں اس جہانِ فانی سے رحلت کر گیا۔

احمد شاہ ابدالی کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس نے بھی کابل کے حالات بہتر بنانے کی بہت کوشش کی تا کہ وہ یکسوئی سے پنجاب میں سکھوں کی فتنہ پردازیوں پر توجہ دے سکے، لیکن وہ بھی داخلی استحکام حاصل نہ کر سکا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پنجاب کے طول و عرض میں سکھ مسلیں قائم ہو چکی تھیں۔ پنجاب سے مغل اقتدار تو کبھی کا ختم ہو چکا تھا اور اب پنجاب مکمل طور پر سکھوں کے تصرف میں تھا۔ تیمور شاہ اپنے عہد میں حالات کا رخ نہ تبدیل کر سکا۔ اس نے پنجاب پر دو بار حملہ کیا۔ مگر ناکام رہا۔ وہ اپنے تیسرے حملے میں ملتان پر قابض ہو گیا۔ لیکن افغانستان کے اندرونی حالات نے نہ تو احمد شاہ کو مکمل طور پر سکھوں سے فیصلہ کن جنگ کا موقع دیا اور نہ ہی تیمور شاہ کو۔ چنانچہ ان کو کئی بار پنجاب کا استیصال کا اہم کام چھوڑ کر واپس جانا پڑا۔ جس کی وجہ سے سکھوں کے خلاف مؤثر کارروائی نہ ہو سکی۔ علاوہ ازیں تیمور شاہ کے عہدِ حکومت میں پنجاب اور کشمیر کے ان علاقوں سے افغانستان اقتدار تقریباً بالکل ہی ختم ہو گیا تھا، جن پر احمد شاہ ابدالی نے قبضہ کیا تھا۔ چنانچہ جب تیمور شاہ کے بعد اس کا بیٹا زمان شاہ تخت نشین ہوا تو اس وقت افغانوں کا پنجاب پر کہیں بھی قبضہ باقی نہ رہا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے آخری ربع میں برصغیر کی سیاسی حالت:

زمان شاہ کے دورِ حکومت میں پنجاب اور برصغیر کے سیاسی حالات ماضی قریب کی

نسبت خاصے تبدیل ہو چکے تھے۔ یہاں اس تبدیلی کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ کے موقع پر مرہٹوں کی قوت تباہ ہوگئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تنظیمِ نو کی اور اب وہ پھر ایک قابلِ ذکر قوت کے مالک تھے۔ جسونت ہلکر ان کا سردار تھا۔ دوسری قوت 'ایسٹ انڈیا کمپنی' تھی۔ کمپنی نے پہلے تو پرتگیزوں اور فرانسیسیوں کو منظر سے ہٹایا اور اس کے بعد مغل دربار سے مراعات حاصل کر کے انہوں نے برصغیر کے سیاسی معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کر دی۔ وہ فوجی طاقت بھی جمع کرنے لگے۔ بالآخر ان کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ انہوں نے 1759ء میں نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر مکمل قبضہ کرلیا۔ اب انگریزوں کی راہ میں صرف ایک ہی اہم رکاوٹ باقی رہ گئی تھی۔ وہ مملکت خداداد میسور کا حریت نواز حکمران سلطان فتح علی ٹیپو شہید تھا۔ سلطان شہید انگریزوں کے سامراجی ارادوں کو سمجھتا تھا، اس لیے اس نے ان کے ارادوں کو ناکام بنانے کا تہیہ کرلیا۔ انگریزوں کے ساتھ اس کی کئی جنگیں ہوئیں۔ ابتدائی معرکوں میں وہ کامیاب رہا۔ جب انگریزوں نے محسوس کیا کہ سلطان کا پلہ بھاری ہورہا ہے اور وہ اکیلے سلطان کے خلاف کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تو انہوں نے اپنی روایتی عیاری سے کام لے کر سلطان کے دو طاقتور ہمسایوں یعنی مرہٹوں اور نظام حیدرآباد دکن کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سلطان کے بعض ممتاز درباریوں کو بھی خرید لیا جس سے ٹیپو کی قوت مضمحل ہوگئی۔ لیکن سلطان نے ہمت نہ ہاری اور مادرِ وطن کو غلامی سے بچانے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے شاہ زمان والیٔ کابل کو بھی اپنی مدد کے لیے بلایا۔ شاہ زمان نے اس پیغام کا مثبت جواب دیا۔ شاہ زمان کے علاوہ سطان ٹیپو نے فرانس کے بادشاہ نپولین بونا پارٹ سے بھی امداد کی درخواست کی۔ اس زمانے میں برطانیہ اور فرانس ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے۔ نپولین، سلطان کی امداد کے لیے ایک بھاری فوج کے ساتھ روانہ ہوا اور بڑھتے بڑھتے مصر تک آ گیا۔ لیکن مصر پہنچ کر اس کے لیے کئی وجوہات کی بنا پر مزید پیش قدمی ممکن نہ رہی۔ اس طرح فرانس کی مدد سرنگا پٹم نہ پہنچ سکی۔

شاہ زمان کا پنجاب پر حملہ:

دوسری طرف شاہ زمان نے سلطان ٹیپو کی مدد کے لیے کئی بار برصغیر آنے کی کوشش کی لیکن افغانستان کے اندرونی حالات کے پیشِ نظر وہ ایسا نہ کر سکا۔ کچھ مدت تک وہ اپنے ملکی حالات ٹھیک کرنے کی سعی کرتا رہا۔ اس سلسلے میں اسے کچھ کامیابی ہوئی تو وہ برصغیر کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پنجاب پر کل چار حملے کئے۔ دو مرتبہ یعنی 1793ء اور 1795ء میں تو اسے حسن ابدال ہی سے واپس جانا پڑا۔ کیونکہ کابل میں اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس کے مخالفین نے فساد برپا کر دیا تھا۔ لیکن تیسری مرتبہ وہ مزید تیاری کر کے آیا اور 3 جنوری 1797ء کو اس نے لاہور فتح کر لیا مگر حالات کی ناموافقت کے سبب اسے آگے بڑھنے کی بجائے واپس لوٹنا پڑا۔

شاہ زمان نے اپنے ابتدائی حملے کے دوران حسن ابدال اور قلعہ رہتاس پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن اس کے اپنے ملک کے اندرونی سیاسی حالات نے اسے شمالی برصغیر میں مزید کسی کارروائی کی اجازت نہ دی تھی۔ شاہ زمان 1798ء کے موسم سرما میں آخری بار پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ اس کی آمد کا اہم مقصد سلطان ٹیپو کے ساتھ کیے گئے وعدے کو پورا کرنا تھا۔ شاہ زمان بھاری فوجی تیاریوں کے بعد کابل سے روانہ ہوا۔ راستے میں کسی سکھ مسل کی طرف سے مزاحمت نہ ہوئی۔ کیونکہ تمام سکھ اس کی آمد کی خبر سنتے ہی پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لے چکے تھے۔ شاہ زمان بحفاظتِ تمام لاہور پہنچ گیا۔ ان دنوں لاہور پر بھنگی مسل کے سردار قابض تھے۔ وہ بھی شہر خالی کر کے بھاگ گئے اور شاہ زمان بلا مقابلہ لاہور پر قابض ہو گیا۔ لاہور پہنچ کر شاہ زمان نے آس پاس کے تمام سکھوں پر اپنے مقصد کی وضاحت کر دی اور کہا کہ وہ سکھوں کے خلاف کارروائی کے لیے نہیں آیا، بلکہ وہ سلطان ٹیپو کے ساتھ متحد ہو کر انگریزوں سے معرکہ آرائی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے جب انگریزی منصوبوں کے مضمرات اور نتائج سکھوں کو سمجھائے تو انہوں نے بھی اسے ایک حد تک تعاون کی یقین دہانی

کرائی۔ یعنی جب وہ جنوبی برصغیر کی جانب روانہ ہوگا تو اس کا عقب محفوظ رہے گا، لیکن جب لاہور میں اس کی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور وہ روانگی کے لیے پرتول رہا تھا تو اسے خبر ملی کہ اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ محمود نے حکومتِ ایران کی مدد سے ہرات پر حملہ کر دیا ہے اور اس کا مقصد مرکز پر قبضہ کر کے شاہ زمان کے اقتدار کو ختم کرنا ہے۔ اس اطلاع کے ملنے پر اس کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہ رہا اور وہ اپنے تخت و تاج کے تحفظ کے لیے فوراً واپس کابل کے لیے روانہ ہو گیا۔

شہزادہ محمود کی بغاوت کے ضمن میں بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ چال ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے چلائی تھی۔ کیونکہ ایک طرف نپولین بوناپارٹ اور دوسری طرف سے شاہ زمان سلطان ٹیپو کی مدد کے لیے آرہے تھے۔ لارڈ ولزلی نے سوچ لیا تھا کہ یہ دونوں فوجیں میسور پہنچ گئیں تو اس کے لیے ہندوستان میں اپنے استعماری مقاصد حاصل کرنا قطعاً محال ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ پہلے شاہ زمان کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ شاہ زمان کا یہ باغی بھائی ان دنوں اس سے ناراض ہو کر ایران میں اقامت پذیر تھا۔ اس کی شورش کے باعث شاہ زمان کا ارادہ تشنہ تکمیل رہ گیا۔ واپسی کا سفر اس نے اتنی افراتفری اور سرعت سے طے کیا کہ یہاں تک کہ طغیانی کی وجہ سے دریائے جہلم میں ڈوب جانے والی توپیں بھی اس نے نہ نکالیں۔ یہ توپیں بعد میں رنجیت سنگھ نے دریا سے نکال کر کابل بھجوا دی تھیں۔ شاہ زمان، رنجیت سنگھ کے اس فعل پر اس قدر خوش ہوا کہ اسے قیمتی تحائف کے علاوہ لاہور کی حاکمیت کا پروانہ بھی عطا کر دیا۔ اسی استحقاق کی بنیاد پر رنجیت سنگھ نے بعد میں لاہور پر قبضہ کیا تھا۔

بہرحال بیرونی امداد میسور نہ پہنچ سکی۔ سلطان ٹیپو نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، لیکن اس کی تمام کاوشوں کے باوجود ہندوستان غلامی سے نہ بچ سکا۔ 1799ء میں سلطان اور انگریزوں کے درمیان آخری جنگ ہوئی۔ سلطان نے مدافعانہ جوہر دکھائے لیکن غیر کے حملوں اور اپنوں کے حیلوں کی

وجہ سے اس کی تمام سعی لاحاصل ثابت ہوئی۔ شمع حریت کا یہ ممتاز ترین پروانہ 4 مئی 1799ء کو وطن کی آزادی کے تحفظ کے لیے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ زمان شاہ اس کے بعد افغانستان کے سیاسی معاملات میں اس قدر الجھ گیا کہ پھر وہ کبھی برصغیر نہ آ سکا۔ انگریز، نہایت آسانی سے ہندوستان پر قابض ہو گئے اور انہوں نے یہاں ایک لمبی مدت تک حکومت کی۔

اہلِ لاہور کا سفر نامہ:

شاہ زمان نے جونہی دریائے جہلم عبور کیا، بھنگی مسل کے تینوں سکھ سرداروں نے دوبارہ لاہور پر قبضہ کر لیا۔ یہ سردار تاریخ پنجاب میں 'لاہور کے تین حکمران' کے نام سے مشہور ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کے زمانے ہی سے لاہور اور اس کے نواحی علاقے بھنگی سرداروں کے زیرِ تسلط تھے۔ اب وہ خود تو مر چکے تھے لیکن ان کی اولاد موجود تھی اور بدستور لاہور پر حکمرانی کر رہی تھی۔ یعنی صاحب سنگھ ولد گوجر سنگھ، چیت سنگھ ولد لہنا سنگھ اور مہر سنگھ ولد سوبھا سنگھ یہ سردار بڑے جفا جو اور بدخو تھے۔ مسلمان رعایا سے تو ان کا سلوک بالخصوص قابلِ مذمت تھا اور غیر مسلم بھی ان سے چنداں خوش نہیں تھے۔ کیونکہ جب یہ عوام سے محصولات وغیرہ وصول کرنے نکلتے تو ہوسِ مال میں کسی کا لحاظ نہ کرتے اور سب کچھ چھین کر لے جاتے۔ ان کے دور میں ظلم و استبداد کا بازار گرم تھا اور امن و سکون اور حق و انصاف قطعاً مفقود تھا۔ بنابریں لاہور کے عوام ان حکام کے ہاتھوں شدید عذاب میں مبتلا تھے اور ہر قیمت پر ان سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لاہور کے شہریوں کی طرف سے ایک محضر نامہ تیار کر کے رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا گیا کیونکہ اس وقت تک وہ بہت ناموری حاصل کر چکا تھا۔ اس تحریری پیغام میں اسے کہا گیا کہ شہر کا نظام ابتر ہو چکا ہے۔ رعایا تباہ حال ہے شہر کی دفاعی حالت بھی خاصی کمزور ہے، لہٰذا تم آ کر فوراً شہر پر قبضہ کر لو۔ اس ضمن میں ہم اپنا مکمل تعاون پیش کریں گے اور اس محضر پر تمام عمائدینِ شہر نے دستخط کیے جن میں سے چند

قابلِ ذکر نام یہ ہیں:

میری شادی خان، مہر محکم دین، بھائی گوربخش سنگھ، حکیم حاکم رائے، میاں عاشق محمد، مفتی محمد مکرم، میاں طاہر محمد باقر، رنجیت سنگھ کے علاوہ اس کی خوشدامن رانی سدا کور کو بھی ایک خط روانہ کیا گیا جس میں اس سے لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کو ہر قسم کی امداد دینے کی اپیل کی گئی۔ جب عرضداشت رنجیت سنگھ کو ملی، جو اس وقت رام نگر میں تھا۔ تو اس نے اپنے ایک مسلمان مصاحب، قاضی عبدالرحمٰن کو لاہور بھیجا تاکہ وہ اس تحریک کے محرکین کے ساتھ اس ضمن میں مفصل مذاکرات کرکے ان کی دعوت کے حقیقی پس منظر کا اندازہ لگا سکے۔ قاضی عبدالرحمٰن یہاں آ کر لوگوں سے ملا اور حالات کو موافق دیکھ کر رنجیت سنگھ کو فوراً آنے کا پیغام بھیجا۔

رنجیت سنگھ کی لاہور آمد

رنجیت سنگھ خود ایک مدت سے لاہور پر اقتدار حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ دوسرے وہ شاہ زمان کے فرمان کی وجہ سے اپنے آپ کو لاہور پر حکمرانی کے لیے آئینی طور پر مجاز سمجھتا تھا۔ تیسرے یہ کہ لاہور پنجاب کا مرکزی مقام تھا۔ یہ بات بھی رنجیت سنگھ کے مدِنظر تھی کہ لاہور پر قبضہ ہو جانے کے بعد اسے پنجاب کے دوسرے سرداروں اور نوابوں پر تفوق حاصل ہو جائے گا۔ ان عوامل کی موجودگی میں رنجیت سنگھ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور قسمت آزمائی کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ رانی سدا کور سے مشورے کے لیے رام نگر سے بٹالہ پہنچا۔ رانی سدا کور نے بھی اسے حالات کی موافقت سے فائدہ اٹھانے کی صلاح دی اور ممکنہ فوجی امداد فراہم کرکے اس کے ساتھ ہی لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔ رنجیت سنگھ انتہائی تیزی سے پیشقدمی کرتا ہوا امرتسر کے راستے لاہور پہنچا۔ اس کی فوج کی کل تعداد پچیس ہزار تھی۔ خالصہ فوج نے وزیر خان کے تعمیر کردہ باغ کو اپنا فوجی مستقر بنایا۔ (جو شہر لاہور کے جنوب میں واقع تھا اور آج کل اس جگہ پنجاب پبلک لائبریری، عجائب گھر اور

جامعہ پنجاب وغیرہ کی عمارتیں ہیں) خود رنجیت سنگھ اسی دستے کے ساتھ تھا۔ دوسرا دستہ اس نے رانی سدا کور کی قیادت میں دہلی دروازے کے مقابل تعینات کیا۔ جونہی لاہور پر حکمران بھنگی مسل کے سرداروں کو رنجیت سنگھ کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے شہر کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ علاوہ ازیں وہ دفاعی انتظامات مکمل کر کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ صورت دیکھ کر رنجیت سنگھ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی گہری چال تو نہیں چلی گئی۔ چونکہ اس حالت میں رنجیت سنگھ کے لیے لاہور پر حملہ کرنا اور اسے فتح کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن نظر آ رہا تھا لہٰذا اس نے دوبارہ ان لوگوں سے رابطہ قائم کیا، جنہوں نے اسے حملہ کی دعوت دی تھی۔ اس میں میاں عاشق محمد اور میاں محکم دین نے رنجیت سنگھ کو یقین دلایا کہ ہم لوگ اپنے وعدے پر قائم ہیں اور جب خالصہ فوج حملہ کرے گی تو میاں محکم دین لوہاری دروازہ کھول دے گا۔ چونکہ میاں محکم دین لوہاری دروازے کا افسر اعلیٰ تھا اور اس کا دفاع اسی کے ذمہ تھا۔ اس کے علاوہ رنجیت سنگھ کو یہ بھی کہلا بھیجا گیا کہ شہر کی فصیل میں ایک بہت بڑا شگاف ڈال دیا جائے گا تا کہ خالصہ فوج آسانی شہر میں داخل ہو سکے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود رنجیت سنگھ کا شک برابر قائم رہا اور وہ شہر پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ چنانچہ میاں محکم دین نے رنجیت سنگھ کو ایک بار پھر اپنے خلوص کی یقین دہانی کرائی اور اسے تاکید کی کہ فلاں وقت ضرور حملہ کر دیا جائے، میں دروازہ کھول دوں گا۔

لاہور پر رنجیت سنگھ کا حملہ:

اس دفعہ رنجیت سنگھ نے حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی اثناء میں حاکمانِ لاہور کے دو سو گھڑ سواروں نے لوہاری دروازے سے نکل کر رنجیت سنگھ کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا، لیکن رنجیت سنگھ کی مستعدی سے وہ جلد ہی پسپا ہو کر واپس شہر میں چلے گئے۔ آخر کار مقررہ دن اور وقت پر رنجیت سنگھ نے میاں محکم دین پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے بہترین شہسواروں کے ساتھ لوہاری دروازہ پر یورش کی۔ ادھر میاں محکم دین نے وعدے کے مطابق دروازہ کھول

دیا اور رنجیت سنگھ کی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں۔ لیکن واقعات کے برعکس حاکمِ لاہور سردار چیت سنگھ کو اطلاع دی گئی کہ رنجیت سنگھ کا حملہ شمال مشرق کی جانب سے دہلی دروازے پر ہوا ہے۔ چنانچہ یہ اطلاع ملنے پر وہ قلعے سے پانچ سو سوار ساتھ لے کر برق رفتاری سے دہلی دروازے پر پہنچا تاکہ وہاں کے محافظ دستے کی مدد کر سکے۔ اس غلط فہمی سے رنجیت سنگھ نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور شہر کے اہم مقامات پر قابض ہو گیا۔ جونہی سردار چیت سنگھ کو دوبارہ اطلاع ملی کہ اس کے ساتھ غداری ہوئی ہے اور رنجیت سنگھ نے شہر کے بیشتر حصے پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ فوراً دہلی دروازے سے واپس ہوا تاکہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے لیکن مقابلے میں کامیابی کی کوئی صورت نہ دیکھ کر وہ فوراً قلعہ میں محصور ہو گیا۔ جب کہ دوسرے دو حاکمانِ لاہور سردار صاحب سنگھ اور سردار مہر سنگھ کو جب شہر کی حد تک رنجیت سنگھ کی کامیابی کی خبر ملی تو وہ بجائے مقابلہ کرنے کے بھاگ نکلے۔ سردار چیت سنگھ نے قلعہ بند ہو کر مخالف فوج پر توپخانہ سے شدید گولہ باری کی۔ اسی اثناء میں رانی سدا کور کی زیرِ قیادت دستے نے دہلی دروازے پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے شہر میں داخل ہو گیا اور رنجیت سنگھ کی مرکزی فوج سے آ کر مل گیا۔ اب اس متحدہ فوج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جب قلعے کے اندر سے سردار چیت سنگھ نے رنجیت سنگھ کی فوج پر توپوں سے زبردست آگ برسانی شروع کی تو باہر سے بھی اس کا ویسا ہی جواب دیا گیا۔ مسلسل بیس گھنٹے تک مقابلہ ہوتا رہا۔ سردار چیت سنگھ نے محسوس کیا کہ اس کی کامیابی کے امکانات قطعاً معدوم ہیں تو اس نے رنجیت سنگھ کو صلح کی درخواست بھیجی۔ رنجیت سنگھ نے اس کی یہ درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ سردار چیت سنگھ نے ایک معقول جاگیر کے عوض قلعے اور شہر پر رنجیت سنگھ کا اقتدار تسلیم کر لیا۔

فتح لاہور کے بعد رنجیت سنگھ کے کچھ سپاہیوں نے لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کرنا چاہا۔ بلکہ چند ایک دکانوں اور گھروں کو لوٹ بھی لیا گیا۔ جونہی رنجیت سنگھ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی، اس نے فوراً ایک سخت حکم جاری کیا، جس میں اس نے سپاہیوں کے اس رجحان کی حوصلہ شکنی کیا اور انہیں سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ شہریوں کے جان و مال کو ہرگز

نقصان نہ پہنچایا جائے اور جو بھی اس جرم میں ملوث ہوا اُسے بدترین سزا دی جائے گی۔ چنانچہ جن سپاہیوں نے لوٹ مار کی تھی انہیں سزا بھی دی گئی۔ رنجیت سنگھ کے اس طرزِ عمل نے لاہور کے ساتھ ساتھ اہلِ لاہور کے دلوں کو بھی جیت لیا اور عوام نے اسے نئے حکمران کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ چونکہ عوام بھنگی مسل کے سرداروں کی بدنظمی اور ظلم و جور سے پہلے ہی بیزار تھے اس لیے انہوں نے رنجیت سنگھ کو خوش آمدید کہا۔

رنجیت سنگھ اس لوگوں کا بہت ممنون تھا۔ جن کی کوششوں کی وجہ سے اسے یہ کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ ان لوگوں میں سے وہ مہر محکم الدین کی خاص کر عزت و تکریم کرتا تھا اور اسے ''باپو جی'' کے الفاظ سے مخاطب کرتا تھا۔ لاہور پر قبضہ اس کے لیے کلیدِ کامیابی ثابت ہوا۔ پھر اسے تمام معرکوں میں کامرانی حاصل ہوئی اور اس کا اقتدار پنجاب کی حدود سے نکل کر کشمیر اور کابل تک پھیل گیا۔

جنگ بھسین:

جب رنجیت سنگھ نے 1799ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور بھنگی مسل کے تینوں سرداروں کی حاکمیت کا خاتمہ ہو گیا تو اس روز افزوں ترقی سے پنجاب کے دوسرے سکھ سرداروں میں حسد و کینہ کے علاوہ خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور وہ اس کی بڑھتی ہوئی قوت سے جلنے لگے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایک متحدہ محاذ کی تشکیل دی اور اپنی مجموعی طاقت سے رنجیت سنگھ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ان کے اقتدار کے لیے کسی قسم کا خطرہ نہ بن سکے۔

جو سکھ مسلدار اور نواب اس اتحاد میں شامل ہوئے ان کے نام یہ ہیں:

قصور کے مسلمان فوجدار نظام الدین خان، جودھ سنگھ وزیر آبادی، صاحب سنگھ بھنگی والیٔ گجرات، گلاب سنگھ بھنگی والیٔ امرتسر اور جسا سنگھ رام گڑھیہ نے باہمی طور پر رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی قوت کو ابتداء ہی میں کچلنے کے لیے زبردست جنگی تیاریاں کیں اور ایک کثیر فوج جمع کر کے لاہور پر حملے کی غرض سے روانہ ہوئے۔

اگرچہ اس کی قوت، متحدہ سرداروں کی قوت کے مقابلے میں ہر لحاظ سے کم تھی، پھر بھی جب اسے اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے اپنی ساری قوت کے ساتھ شہر سے باہر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی فوج لے کر ان کا راستہ روکنے کے لیے نکل کھڑا ہوا اور لاہور کی نواحی بستی بھسین کے پاس واقع ایک کھلے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔

رنجیت سنگھ کے مخالفین کا اتحاد کسی ٹھوس بنیاد اور مثبت مقصد کے بغیر ہی محض ہنگامی طور پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کے خلاف متحد تو ہو گئے تھے، لیکن ان میں سے ہر ایک صرف اپنے عزائم کی تکمیل چاہتا تھا۔ لہٰذا دو ماہ تک ان کی فوجیں میدان میں پڑی رہیں اور کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔ یہ وقفہ رنجیت سنگھ کے لیے مفید ثابت ہوا اور اس نے اپنی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کی۔ دونوں لشکر دو ماہ تک یونہی بے کار پڑے رہے۔ البتہ معمولی قسم کی جھڑپیں ہوتی رہیں اور فیصلہ کن معرکے کی نوبت نہ آئی۔ اس دوران میں متحدہ لشکر میں اختلافات بڑھتے رہے۔ اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا جس سے متحدہ محاذ میں شریک سرداروں کا حوصلہ شدید طور پر متاثر ہوا۔ یعنی سردار گلاب سنگھ بھنگی والی امرتسر ایک دن اچانک مر گیا۔ اس کی موت شراب کے غیر معمولی استعمال کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس ناگہانی نقصان سے متحدہ لشکر کی ہمت پست ہو گئی۔ اس سے قبل وہ اپنے ایک اور اہم ساتھی سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کی کمی نہایت شدت سے محسوس کر رہے تھے، جو ضعیفی اور بیماری کی وجہ سے ان کے ساتھ نہ آ سکا تھا۔ ان واقعات کی وجہ سے متحدہ فوج میدان میں مزید نہ جم سکی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

یہ نتیجہ سراسر رنجیت سنگھ کے حق میں تھا، کیونکہ جنگ کی صورت میں اس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نہ تھے، لہٰذا جب مخالف لشکر بھاگ گیا تو گویا اس کے سر سے ایک بھاری مصیبت ٹل گئی اور وہ فاتحانہ انداز سے لاہور واپس آیا۔ رنجیت سنگھ کی یہ ابتدائی کامیابی اس کی آئندہ ترقی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر اس معرکے میں اسے شکست ہو

جاتی تو اس کا مستقبل وہیں تاریک ہو جاتا۔ لیکن قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے مخالف ہزیمت سے دوچار ہوئے اور پھر کبھی بھی متحد نہ ہو سکے۔ اس فتح کے بعد رنجیت سنگھ کی شہرت میں بہت اضافہ ہوا اور گردونواح کے بہت سے معروف سردار اس کے باجگزار بن گئے۔ یہ معرکہ مارچ 1800ء میں ہوا تھا۔

اس جنگ کے بعد رنجیت سنگھ کی مالی حالت بہت دگرگوں ہو گئی۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ ایک دو ماہ تک فوج کو تنخواہ بھی نہ مل سکی۔ بعض لوگوں نے اس مالی بحران کو حل کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کے سامنے کسی ساہوکار سے قرض لینے کی تجویز پیش کی، لیکن رنجیت سنگھ نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ اتفاق سے چند دن بعد ہی رنجیت سنگھ کو ایک بھاری دفینہ مل گیا۔ اس دفینے کے مقام کے بارے میں کوئی روایتیں ہیں۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ رقم بدھو کے آدے، واقع جی ٹی روڈ۔ لاہور سے ملی تھی۔ دوسرے مؤرخین کا خیال ہے کہ خزانہ قلعے ہی میں کہیں سے دریافت ہوا تھا۔ بہرحال! اس خزانے کی رقم اتنی زیادہ تھی کہ اس نے رنجیت سنگھ کی اپنی تمام ضروریات بھی پوری کیں اور کافی کچھ اس کے پاس بچ بھی رہا۔ اب اس نے آس پاس کے علاقے فتح کرنے پر توجہ دی۔

جموں اور سیالکوٹ کا رخ:

سب سے پہلے رنجیت سنگھ نے جموں اور اس کے قرب و جوار کے علاقے فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ لاہور سے اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستے میں نارووال (ضلع سیالکوٹ) پر حملہ کیا۔ نارووال کے سردار نے آٹھ ہزار روپے سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا اور رنجیت سنگھ کی بالادستی تسلیم کر لی۔ یہاں سے خراج لینے کے بعد رنجیت سنگھ آگے بڑھا۔ میروال اور جسٹر کی فتح کرتا ہوا جموں سے دو میل کے فاصلے پر آ کر خیمہ زن ہو گیا۔ جموں کا راجا مقابلے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ اس نے بیس ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی بطور نذرانہ پیش کئے اور سالانہ خراج دینے کا بھی اقرار کرتے ہوئے رنجیت سنگھ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا۔ رنجیت سنگھ نے

بھی اسے شاندار خلعت عطا کی۔ رنجیت سنگھ نے 1801ء میں سیالکوٹ پر حملہ کر کے اسے بھی اپنے علاقے میں شامل کرلیا۔

گجرات پر حملہ:

رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ بھنگی مسل کے تین حاکموں کو شکست دینے کے بعد جولائی 1799ء میں کیا تھا۔ اس لیے بھنگی مسل سے متعلق عام سکھ رنجیت سنگھ سے نفرت کرتے تھے اور اسے غاصب سمجھتے تھے۔ بھسین کی جنگ میں زیادہ تر بھنگی مسل کے سکھوں نے حصہ لیا۔ اس جنگ میں ایک طرح کی شکست کے بعد بھنگی مسل کی فوجی قوت میں کمی ہوگئی تھی اور اس کے بعد 1800ء میں امرتسر کے حکمران گلاب سنگھ بھنگی کی موت کے بعد ان میں مزید نااتفاقی پیدا ہوگئی۔ لیکن بھنگی مسل کے سرداروں کے دل سے رنجیت سنگھ کی عداوت ختم نہ ہوئی تھی۔ اب صاحب سنگھ بھنگی والیٔ گجرات نے اکال گڑھ کے حاکم سردار دل سنگھ کو ساتھ ملا کر رنجیت سنگھ کے آبائی شہر گوجرانوالہ پر حملے کا ارادہ کیا۔ سردار دل سنگھ، رنجیت کے باپ مہان سنگھ کا پرانا ساتھی تھا اور اسی نے اسے اکال گڑھ کی جاگیر عطا کی تھی۔ اس سے قبل رنجیت سنگھ گوجرانوالہ سے اپنی محفوظ فوج اور توپخانہ لاہور منگوا چکا تھا تاکہ لاہور کے دفاع کو مضبوط بنایا جاسکے۔ صاحب سنگھ نے اسی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، لیکن جونہی رنجیت سنگھ کو ان حالات کی خبر ملی اس نے خود اپنی پوری قوت کے ساتھ گجرات پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں اس کی طاقت دس ہزار سپاہیوں اور بیس توپوں پر مشتمل تھی۔ رنجیت سنگھ کی آمد کا سن کر صاحب سنگھ شہر میں محصور ہوگیا اور شہر کی فصیل پر سے رنجیت سنگھ کی فوج پر گولہ باری شروع کردی۔ رنجیت سنگھ نے جواب میں اسی شدت سے اپنا توپخانہ استعمال کیا جس کی وجہ سے صاحب سنگھ کی قوتِ مزاحمت مضمحل ہوتی گئی۔ جب اس نے اپنی شکست قریب دیکھی تو اس نے سکھوں کے مذہبی رہنما بابا صاحب سنگھ بیدی کے توسط سے صلح کرلی۔ رنجیت سنگھ نے بھاری نذرانے اور آئندہ پرامن رہنے کے وعدے پر اس کی جان بخشی کردی۔

اکال گڑھ کا الحاق:

گجرات کو سرنگوں کرنے کے بعد رنجیت سنگھ اکال گڑھ کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے ترکیب بازی سے دل سنگھ کو زندہ گرفتار کر لیا، اور اسے اپنے ساتھ لاہور لے آیا۔ بعدازاں اسے بابا کیسرا سنگھ سوڈھی کی سفارش پر رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد اسے رنجیت سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے اسے دربارِ عام میں اس غیر وفادارانہ طرزِ عمل پر خوب شرمندہ کیا۔ بعدازاں اسے واپس اکال گڑھ جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن دل سنگھ پر طعن و تشنیع کا اتنا اثر ہوا کہ وہ اکال گڑھ پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا اور چند ہی دنوں بعد مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد رنجیت سنگھ اظہارِ تعزیت کے لیے اکال گڑھ گیا۔ اس نے دل سنگھ کی بیوہ کو ایک معقول جاگیر دے کر اکال گڑھ کا اپنی سلطنت سے الحاق کر لیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے کی لاہور آمد:

رنجیت سنگھ کے ان مہمات سے فارغ ہو کر واپس لاہور آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک نمائندہ یوسف علی خان اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے کمپنی کی طرف سے پنجاب کے نئے حکمران کو خیر سگالی کے پیغام کے علاوہ متعدد قیمتی تحائف پیش کیے۔ رنجیت سنگھ نے بھی جواب میں ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا اور اسے بیش بہا انعامات کے ساتھ رخصت کیا۔

کھڑک سنگھ کی ولادت:

1801ء کے ابتدائی ربع کا ایک اہم واقعہ رنجیت سنگھ کے ہاں لڑکے کی ولادت ہے۔ اس لڑکے کا نام کھڑک سنگھ تجویز ہوا۔ اس کی ماں رانی داتار کونکئی تھی۔ لڑکے کی پیدائش پر سارے ملک میں جشن منایا گیا، جو چالیس دن جاری رہا۔ فقراء و مساکین میں بے شمار روپیہ تقسیم کیا گیا۔

مہاراجہ کا خطاب اور جشن:

اب ہر طرف رنجیت سنگھ کی بلند اقبالی اور علو ہمتی کا شہرہ ہو چکا تھا۔ رنجیت سنگھ جدھر کا رخ کرتا اسے فتح ہی حاصل ہوتی۔ لاہور کے آس پاس تمام علاقوں پر اسے اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے سارے پنجاب کا تاجدار بننے کے لیے اقدامات کرنے شروع کر دیے۔ چنانچہ اس نے پنجاب کے تمام سکھ سرداروں کو لاہور میں مدعو کیا۔ سب سرداروں نے آپس میں صلاح مشورے کے بعد طے کیا کہ رنجیت سنگھ کو اپنے لیے مہاراجہ کا لقب اختیار کرنا چاہیے۔ یہ بھی طے ہوا کہ اس مقصد کے لیے ایک خاص تقریب بیساکھی کے موقع پر منعقد کی جائے۔ الغرض بیساکھی پر قلعہ لاہور میں اس تاریخی تقریب کے انعقاد کے لیے وسیع اہتمام کیا گیا۔ تمام چھوٹے بڑے سردار ایک بار پھر جمع ہوئے۔ دیوانِ عام میں عظیم الشان دربار لگا۔ سکھوں کی مشہور مذہبی شخصیت بابا صاحب سنگھ بیدی نے رنجیت سنگھ کو باقاعدہ مہاراجہ کا خطاب دیا اور اس کی پیشانی پر مہاراجگی کا تلک لگایا۔ تمام حاضرین نے انتہائی خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ مساکین و غرباء میں کثیر خیرات تقسیم کی گئی۔ تمام سرداروں کو خلعتیں، اعزازات و انعامات دیے گئے۔ یہ واقعات اپریل 1801ء کا ہے۔

سکّہ:

مہاراجہ پنجاب کی ہمہ مقتدر حیثیت حاصل کر لینے کے بعد رنجیت سنگھ نے اپنے اقتدار کے مظہر کے طور پر سکّہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں اس نے بندہ بیراگی کی قائم کردہ روایت کو برقرار رکھا یعنی اس سکّے پر اپنے نام کے بجائے وہی الفاظ کندہ کرائے جو بندہ بیراگی کے زمانے سے رائج تھے۔ رنجیت سنگھ کے عہد کے روپے کو نانک شاہی روپیہ اور پیسے کو نانک شاہی پیسہ کہا جاتا تھا۔ ان سکوں پر یہ عبارت درج تھی:

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بید رنگ
یافت از نانک گورو گوبند سنگھ

اصلاحات:

سکہ جاری کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے اپنے مقبوضات کی انتظامی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اصلاحات نافذ کیں۔ اس کام کی ابتداء لاہور سے کی گئی۔ عدالتیں قائم ہوئیں اور پولیس فورس کو منظم کیا گیا۔ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے مسلمان قاضی مقرر ہوئے۔ اس منصب پر سب سے پہلی تقرری قاضی نظام الدین کی ہوئی۔ سعد اللہ چشتی اور مفتی محمد شاہ معاون تھے۔ پولیس فورس کا سربراہ کوتوال شہر امام بخش خرسوار کو مقرر کیا گیا۔ شہر کی فصیل کی مرمت کے لیے ایک لاکھ روپیہ کی منظوری دی گئی۔ عوام کو سستا علاج مہیا کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ بیسیوں خیراتی شفاخانے قائم کیے گئے۔ ان میں دوائیں فراہم کی گئیں۔ مستند طبیب ملازم رکھے گئے۔ اس محکمہ صحت کا سربراہ اپنے زمانے کے ممتاز ترین طبیب حکیم فقیر نورالدین کو مقرر کیا گیا۔ ان انتظامات سے لاہور میں ایک طویل مدت کے بعد پھر امن وسکون کے دور کا آغاز ہوا۔

قصور کی فتح:

قصور میں افغان سرداروں کا خاندان مغلوں کے عہد ہی سے فوجداری کے منصب پر فائز تھا۔ جب مغل سلطنت انتشار کا شکار ہوئی تو یہ لوگ بھی ان کے تسلط سے آزاد ہو گئے اور اتنی طاقت حاصل کر لی کہ آس پاس کے حکمران ان سے دبتے تھے۔ جن دنوں لاہور میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، قصور کے حاکم نظام الدین خان نے لاہور پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن رنجیت سنگھ اس پر سبقت لے گیا اور اس کے کارروائی کرنے سے پہلے ہی لاہور پر قابض ہو گیا۔ اس وجہ سے نظام الدین، رنجیت سنگھ سے حسد کرنے لگا اور اس نے رنجیت

سنگھ کو نیچا دکھانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اس سرد جنگ کے نتیجے میں بھسین کے مقام پر کھلے تصادم کی نوبت آئی۔ جس میں اور بھی کئی مسلدار رنجیت سنگھ کے ساتھ عملی تعاون کر رہے تھے۔ لیکن اس معرکے میں رنجیت سنگھ کو لڑے بغیر ہی فتح حاصل ہوئی، جس سے نظام الدین کے بغض و عداوت کے جذبات میں مزید اضافہ ہوا اور وہ رنجیت سنگھ کو شکست دینے کے لیے تدبیر سوچنے لگا۔ اس سلسلے میں اس نے پھر صاحب سنگھ بھنگی سے گفت وشنید کی اور ان میں باہمی دفاع کا سمجھوتہ ہو گیا۔ اس صورتِ حال سے رنجیت سنگھ بہت گھبرایا۔ چنانچہ اس نے ان کو موقع دینا مناسب نہ سمجھا اور پہلے صاحب سنگھ بھنگی کو زیر کیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر اس نے قصور کا رخ کیا۔ اس پر نظام الدین نے بھی رنجیت سنگھ کے متوقع حملے کے پیشِ نظر دفاعی انتظامات شروع کر دیے۔ رنجیت سنگھ نے سردار فتح سنگھ کلیانوالہ کی قیادت میں خالصہ فوج کو قصور کی جانب روانہ کیا۔ نظام الدین نے شہر سے باہر مقابلہ کیا۔ پٹھان بڑی پامردی سے لڑے لیکن سکھوں کے حملے کو روک نہ سکے اور پسپا ہو کر شہر میں محصور ہو گئے۔ سکھوں نے شہر پر دھاوا بول دیا اور تھوڑی دیر میں اسے بھی فتح کر لیا اور شہر میں قتلِ عام اور غارتگری شروع کر دی۔ عوام کو لوٹ مار سے بچانے کے لیے نظام الدین نے صلح کی درخواست کی جسے منظور کر لیا گیا۔ نظام الدین نے بھاری رقم تاوانِ جنگ کے طور پر ادا کی۔ اپنے بھائی راجا خان اور واصل خان کو یرغمالی کے طور پر دربارِ لاہور میں بھیج دیا اور آئندہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ قصور کی فتح کا واقعہ 1801ء کے آواخر میں رونما ہوا۔

قصور فتح کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے نظام الدین ہی کو وہاں کا صوبیدار مقرر کیا لیکن اس واقعے کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ اس کے بعد قطب الدین خان قصور کا حاکم بنا۔ بعض مؤرخین قطب الدین کو نظام الدین کا بھائی اور بعض بیٹا لکھتے ہیں۔ قطب الدین کچھ عرصہ تو رنجیت سنگھ کو خراج ادا کرتا رہا لیکن پھر اس کے دل میں بھی خود مختاری کا خیال پیدا ہوا تو اس نے رنجیت سنگھ کے خلاف ملتان کے حاکم مظفر خان سے فوجی تعاون کا

معاہدہ کرلیا۔ مہاراجہ اس صورتِ حال سے بہت متفکر تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے مرکز کے بالکل پہلو میں ایک زبردست باغی رہے چنانچہ اس نے اب کے قصور کی مکمل فتح کا ارادہ کرلیا۔ 1805ء میں جب رنجیت چنیوٹ کی فتح کے بعد واپس آیا تو اسے قطب الدین کے متعلق اطلاع ملی کہ اس نے رنجیت سنگھ کے باجگزار کچھ سرداروں کی جاگیروں پر قبضہ کرلیا ہے اور علاوہ ازیں اس نے لاہور کے زیرِ اقتدار بعض دیہاتوں کو بھی لوٹ لیا ہے۔ لہٰذا رنجیت سنگھ نے اس کی سرکوبی کے لیے تیاری شروع کردی اور تیاریوں کے بعد سردار فتح سنگھ کو روانہ کیا۔ علاوہ ازیں اپنے باجگزار تمام سرداروں کو اپنی فوجوں کے ساتھ جلد قصور پہنچنے کی ہدایات جاری کر دیں۔ بعدازاں خود بھی اپنے خاص سوار دستے کے ہمراہ قصور پہنچ گیا۔ کئی خونریز جھڑپیں ہوئیں جب سکھوں کا پلہ بھاری ہونے لگا تو قطب الدین نے شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کیا۔ دونوں طرف کا بے شمار جانی نقصان ہوا۔ آخرکار سکھ غالب آ گئے انہوں نے قصور فتح کرلیا۔ رنجیت سنگھ نے شہرِ قصور کو تباہ و برباد کرنے کے بعد قتلِ عام کا حکم دیا۔ ہزاروں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور اکثر کو اسیر بنا لیا گیا۔ شہر کی متعدد عمارتیں زمین بوس کر دی گئیں۔ جب قطب الدین خان نے سکھوں کی یہ وحشت و بربریت دیکھی تو اس نے کافی سونا چاندی بطور نذرانہ پیش کیا اور تاوانِ جنگ کی ایک کثیر رقم ادا کر کے سکھوں کی تمام شرائط قبول کر لیں اور قصور کے عوام کو سکھوں کے استبداد سے نجات دلائی۔

رنجیت سنگھ نے قصور کا الحاق لاہور کے ساتھ کر کے قطب الدین کو ستلج پار ممدوٹ کی جاگیر دے دی، جس کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ تھی اور اس طرح 1807ء میں قصور باضابطہ طور پر لاہور کے ماتحت آ گیا۔ رنجیت سنگھ نے قصور پر نہال سنگھ اٹاری والے کو اپنا نائب مقرر کیا کیونکہ اس نے اس معرکے کے دوران امتیازی کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ قصور کی فتح دس فروری 1807ء کو ہوئی تھی۔

امرتسر کا الحاق:

امرتسر سکھوں کا سب سے زیادہ قابلِ احترام مقام ہے۔ اس شہر پر قابض شخص کو بھی محترم سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا ہر بڑے سردار کی طرح رنجیت سنگھ بھی امرتسر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس زمانے میں بھنگی مسل امرتسر کی حکمران تھی۔ اس کا مشہور سربراہ سردار گلاب سنگھ بھنگی 1800ء میں بھسین کی جنگ کے دوران کثرتِ شراب نوشی کے باعث مر گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کم عمر لڑکا گوروت سنگھ گدی نشین ہوا، جب کہ اس کی بیوی مائی سکھن گوروت سنگھ کی نگران تھی۔ الغرض رنجیت سنگھ کے ترقی کے زمانے میں امرتسر مضبوط قیادت سے محروم تھا۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے امرتسر کے بعض لوگوں سے ساز باز کر کے 1805ء میں اچانک امرتسر پر حملہ کر دیا۔ بھنگی حکمران نے معمولی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ رنجیت سنگھ نے اسے معقول جاگیر عطا کی اور امرتسر کا الحاق لاہور سے کر لیا۔ امرتسر میں قیام کے دوران رنجیت سنگھ دربار صاحب اور دیگر مقدس مقامات کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور ان کے اخراجات کے لیے جاگیریں وقف کیں۔

امرتسر کے قلعے سے رنجیت سنگھ کو بہت سا مال و زر اور ہتھیار حاصل ہوئے۔ یہاں سے اسے پانچ بڑی توپیں بھی ملیں جنہیں بعد میں مہاراجہ نے اکثر معرکوں میں استعمال کیا۔ ان پانچ توپوں میں سے چار تو دستبرد روزگار کا شکار ہو گئیں، لیکن ایک آج تک محفوظ ہے۔ یہ توپ جسے بھنگیوں کی توپ یا 'زمزمہ' کہا جاتا ہے، شاہراہ قائداعظم پر جامعہ پنجاب اور عجائب گھر کے مابین ایک خوبصورت چبوترے پر مزین ہے۔

چنیوٹ کا الحاق:

جھنگ اور چنیوٹ پر سردار احمد خان سیال کی حکمرانی تھی۔ لیکن پنڈی بھٹیاں کے سکھ سردار جسا سنگھ بھنگی ولد کرم سنگھ دلوا نے احمد خان سے چنیوٹ چھین لیا تھا۔ چنیوٹ کے متحد

ممتاز شہریوں نے جسا سنگھ کے خلاف رنجیت سنگھ کے پاس شکایات بھیجیں اور اسے حملہ کی دعوت دی۔ جب رنجیت سنگھ نے حملہ کیا تو جسا سنگھ محصور ہو گیا۔ اس نے دو ماہ تک مقابلہ کیا۔ بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے چنیوٹ کا الحاق بھی لاہور سے کر لیا۔

جھنگ پر فوج کشی:

جھنگ میں سردار احمد سیال حکمران تھا۔ اس کے پاس بڑی تعداد میں بہترین گھوڑے تھے۔ عام مال کی بھی کمی نہ تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنا ایک نمائندہ اس کے پاس روانہ کیا کہ وہ بھی پنجاب کے دیگر سرداروں کی مانند رنجیت سنگھ کی سیاسی برتری تسلیم کرے، اسے سالانہ خرچ ادا کرے اور ملتان کے حاکم مظفر احمد خان سے فوجی معاہدہ ختم کر دے جو اس نے مہاراجہ کے خلاف کر رکھا ہے۔ لیکن نواب احمد خان نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر رنجیت سنگھ نے جھنگ پر حملے کی تیاری شروع کر دی اور کثیر فوج لے کر جھنگ کے نواح میں پہنچ گیا۔ نواب احمد خان نے بھی پنجاب کے مشہور و معروف جنگجو مسلمان قبائل کو جمع کر لیا۔ ان میں کھرل، بھروانہ اور سیال قابلِ ذکر ہیں۔ احمد خان سیال نے سکھ فوج کا کھلے میدان میں مردانہ وار مقابلہ کیا۔ دونوں طرف سے توپخانے کا بھرپور استعمال ہوا۔ دست بدست لڑائی کے شدید معرکے ہوئے۔ مسلمانوں نے خوب خوب مزاحمت کی لیکن بالآخر ان کے قدم اکھڑ گئے اور انہوں نے شہر میں پناہ لی اور قلعے اور شہر کی دیواروں سے گولے برسانے لگے۔ سکھوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جھنگ کے ہندوؤں نے اپنے آقا سے غداری کرتے ہوئے رات کے وقت جھنگ کے قلعے کی فصیل میں بڑے بڑے شگاف ڈال دیے اور اس طرح رنجیت سنگھ جھنگ کے قلعے پر قابض ہو گیا۔ احمد خان سیال ہندوؤں کی غداری کی وجہ سے شکست کھا گیا اور مع اہل و عیال ملتان، نواب مظفر خان کے پاس چلا گیا۔ بعد ازاں رنجیت سنگھ نے احمد خان سیال کو ساٹھ ہزار سالانہ خراج کے عوض ریاست واپس کر دی۔ علاوہ ازیں اسے جھنگ سے احمد خان سیال کے خزانہ سے بے شمار ہیرے جواہرات بھی حاصل ہوئے۔

کانگڑہ کی فتح:

کانگڑہ کی ریاست کوہ ہمالیہ کی ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور وسیع ہونے کے علاوہ قدیم ترین بھی تھی۔ آس پاس کی کئی ریاستیں اس کے ماتحت تھیں۔ اس پر راجا سنسار چند حکمران تھا۔ راجا سنسار چند پہلے ایک بار رانی سدا کور کے علاقے پر حملہ کر چکا تھا، اس وقت بھی رنجیت سنگھ نے رانی سدا کور کی مدد کی تھی اور راجا سنسار چند کو بھگا دیا تھا، اب اس نے پھر رانی سدا کور کے علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ سدا کور نے پھر رنجیت سنگھ کو کمک کے لیے بلایا۔ یہ خبر رنجیت سنگھ کو لاہور میں ملی۔ اس نے فوراً سردار فتح سنگھ کو فوج دے کر بھیجا اور بعد میں خود بھی بٹالہ کی طرف روانہ ہوا۔ راجا سنسار چند کو جونہی رنجیت سنگھ کی آمد کی اطلاع ملی وہ پسپا ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے رانی سدا کور کے تمام علاقے کو جو سنسار چند نے فتح کر لیا تھا واپس حاصل کر کے اس پر سدا کور کا اقتدار بحال کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے نوشہرہ کو بھی فتح کر کے سدا کور کے علاقے سے اس کا الحاق کر دیا، اور خود ہمالیہ کے دامن کی جانب کوچ کر گیا۔ کانگڑہ کے مشہور شہر نور پور کو فتح کیا اور اسے بھی سدا کور کی عملداری میں شامل کر دیا۔ راجا سنسار چند بجائے رنجیت سنگھ کا مقابلہ کرنے کے پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے اس کا تعاقب کیا۔

جب رنجیت سنگھ، سنسار چند کا تعاقب کر رہا تھا تو اسے رانی سدا کور نے پیغام بھیجا کہ سجان پور کے حکمران بدسنگھ اور سنگت سنگھ نے سدا کور کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ اس سے قبل بھی وہ کئی بار اس کے خلاف معاندانہ کارروائیاں کر چکے تھے۔ رنجیت سنگھ یہ اطلاع ملنے پر واپس آیا اور سجانپور کو تہ و بالا کر دیا۔ نتیجتاً بھنگی مسل کے دونوں مذکورہ سرداروں کو اپنی شرائط پر سدا کور سے مصالحت پر مجبور کر دیا۔ سجانپور کو مغلوب کرنے کے بعد رنجیت سنگھ پنڈی بھٹیاں کی طرف چلا گیا اور اسے بھی فتح کر لیا۔ کہتے ہیں کہ جب رنجیت سنگھ ان فتوحات کے بعد واپس لاہور آیا تو اس کے ساتھ دیگر مال و اسباب کے

علاوہ بہترین قسم کے چار سو گھوڑے بھی تھے۔ جو اسے مختلف مقامات سے مالِ غنیمت میں حاصل ہوئے تھے۔

بعدازاں راجا سنسار چند 1803ء میں تیسری بار ہوشیار پور، جالندھر اور بٹالہ کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔ جب رنجیت سنگھ نے جالندھر دوآب کا رخ کیا تو سنسار چند بھاگ گیا۔ لہٰذا رنجیت سنگھ نے دوسری سکھ مسلوں کے علاقوں کو فتح کر کے سدا کور کے علاقے سے ان کا الحاق کر دیا اور خود سلطان پور کے جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے چلا گیا۔

راجا سنسار چند نے ہوشیار پور اور جالندھر وغیرہ پر چوتھی مرتبہ 1804ء میں حملہ کیا لیکن رنجیت سنگھ کی آمد پر وہ پھر ہمالیہ کے دشوار گزار سلسلہ کوہ میں روپوش ہو گیا۔

لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کا واقعہ پیش آیا، یعنی ہمالیہ کی پہاڑی ریاست کہلور کے راجا کی دعوت پر نیپال کے گورکھوں نے کانگڑہ پر حملے شروع کر دیے امر سنگھ تھاپہ ان کا سردار تھا۔ سنسار چند اس قضیے میں ایسا الجھا کہ اسے دوسروں کے خلاف فوج کشی بھول گئی۔ ان دنوں ہر طرف گورکھ لشکر نے اُدھم مچا رکھا تھا۔ کوئی سرداران کا راستہ روکنے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ گنگا جمنا دوآبہ کی چیرہ دستی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اب انہوں نے کانگڑہ کا رخ کیا تو وہاں کے راجا سنسار چند نے اپنے آپ کو ان کے مقابلے کے قابل نہ سمجھ کر اپنے شہر میں محصور ہونا ہی مناسب خیال کیا۔ اس پر اس نے اپنے بھائی فتح چند کو رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ فتح چند، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس حاضر ہوا اور ایک بڑی رقم پیش کر کے اپنا مدعا بیان کیا۔ مہاراجہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ کہتے ہیں کہ گورکھا جرنیل امر سنگھ کا نمائندہ زورآور سنگھ بھی رنجیت سنگھ سے ملا اور اس نے سنسار چند سے دوگنی رقم دینے کی پیش کش اس صورت میں کی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کانگڑہ کی حمایت میں فوجی مداخلت نہ کرے۔ لیکن مہاراجہ نے اس کو قطعی رد کر دیا اور اپنی فوج لے کر راجا سنسار چند کی کمک کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس طرح سکھوں اور گورکھوں میں 1806ء میں معرکہ آرائی ہوئی۔ جس میں نیپالی پسپا ہو گئے اور مہاراجہ واپس

آ گیا۔

گورکھا جرنیل امر سنگھ تھاپہ نے دوبارہ 1809ء میں کانگڑہ پر حملہ کیا اور کانگڑہ کا محاصرہ کر لیا۔ اب کے بھی راجا رنجیت سنگھ کو اپنی مدد کے لیے بلایا اور مہاراجہ فوراً بسرعت تمام وہاں پہنچا، لیکن اسی اثناء میں گورکھا جرنیل امر سنگھ اور راجا سنسار چند نے آپس میں رنجیت سنگھ کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا۔ جب مہاراجہ 28 مئی 1809ء کو پٹھانکوٹ پہنچا تو اسے بھی اس سازش کا علم ہو گیا۔ چنانچہ اس نے پہلے تو ترکیب بازی سے سنسار چند کو مغلوب کیا، اور 24 اگست 1809ء کو کانگڑہ کے قلعے پر مہاراجہ کی فوج قابض ہو گئی۔ بعدازاں اس نے گورکھا لشکر پر حملہ کیا۔ گورکھے اپنی روایتی بہادری سے لڑے۔ بڑا خونریز معرکہ ہوا۔ دونوں طرف سے بے شمار سپاہی اور افسر ہلاک و زخمی ہوئے۔ بالآخر گورکھا فوج میں ہزیمت کے آثار نمایاں ہوئے۔ سکھوں نے آخری زوردار حملہ کر کے میدان جیت لیا اور گورکھے بھاگ نکلے۔ گورکھوں کے خلاف رنجیت سنگھ کی یہ فتح بہت اہمیت کی حامل ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ 24 ستمبر 1809ء کو بڑے تزک و احتشام سے کانگڑے کے قلعے میں داخل ہوا اور شاندار دربار منعقد کیا۔ تمام پہاڑی ریاستوں کے حکمران حاضر ہوئے اور نذریں پیش کیں۔ ان میں کانگڑہ، بسوہلی، جسروانہ، داتاپور، نورپور، جبوانی، سکیت، کوٹلہ شاہ پور، چمبہ، سب گولیر، مانکوٹ، کلو اور منڈی کی ریاستیں شامل ہیں۔ مہاراجہ نے بھی ان سب سرداروں کو انعامات اور خلعتیں عطا کیں۔ مہاراجہ نے کانگڑہ اور اس کے گردونواح کے تمام علاقے کا الحاق پنجاب سے کر کے وہاں سردار ویسا سنگھ مجیٹھیہ کو ناظم مقرر کیا۔ انتظامات کے لیے وہاں کچھ فوج متعین کی اور خود واپس لاہور آ گیا۔ اس کی آمد پر لاہور میں بڑا جشن منایا گیا۔

اہلووالیہ مسل سے روابط:

مہاراجہ رنجیت سنگھ بڑا مصلحت شناس سیاستدان تھا۔ وہ بہر طور اپنے اقتدار کا استحکام

چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے پہلے کنھیا مسل کو اپنے ساتھ ملایا اور اس کی مدد سے لاہور کے بھنگی حکمرانوں کو شکست دی۔ علاوہ ازیں وہ نکئی مسل میں اپنی شادی ہو جانے کی وجہ سے بھی بیسیوں فوائد سے متمتع ہوا۔ اب رنجیت سنگھ نے اپنی توسیع پسندانہ حکمت عملی کو بروئے کار لانے کے لیے اہلووالیہ مسل سے قریبی روابط پیدا کرنا ضروری سمجھا۔ اہلووالیہ مسل سارے پنجاب میں طاقتور مانی جاتی تھی۔ ان دنوں اس کا سربراہ سردار فتح سنگھ تھا۔ چنانچہ مہاراجہ 1806ء میں یاترا کے لیے امرتسر گیا اور وہاں سے وہ گوروارجن کے تالاب میں اشنان کے لیے ترنتارن گیا۔ وہاں اس نے سردار فتح سنگھ کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ ملاقات ہوئی اور دونوں نے گرنتھ صاحب کو درمیان میں رکھ کر آپس میں تعاون کا سمجھوتہ کیا۔ اس موقع پر دونوں نے پگڑیاں تبدیل کر کے باہمی بھائی چارے کی بنیاد رکھی۔ یہ اقدام رنجیت سنگھ کے مستقبل کے لیے بہت مفید ثابت ہوا اور اس نے اس اتحاد سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

ملتان پر حملے:

ملتان ابتدائے تاریخ ہی سے ایک اہم تجارتی مقام کی حیثیت سے معروف ہے۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں ملتان پر نواب مظفر خان کی حکومت تھی۔ رنجیت سنگھ نے جب کئی ریاستوں کو سرنگوں کر لیا تو اس کے دل میں ملتان کو زیر کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ مہاراجہ نے اس پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ وقتاً فوقتاً ملتان پر کئی حملے کیے گئے۔ پہلا حملہ 1803ء کے اوائل میں کیا گیا۔ مہاراجہ خود فوج کے ساتھ گیا۔ جب لشکر ملتان سے بیس میل کے فاصلے پر پہنچا تو نواب مظفر خان نے اس جگہ مہاراجہ کا استقبال کیا۔ کیونکہ وہ مسلح تصادم کے لیے تیار نہ تھا اس نے مہاراجہ کو اپنی وفاداری کی تحریری یقین دہانی کرائی اور مہاراجہ واپس آ گیا۔ 1805ء میں مہاراجہ پھر ملتان کی جانب گیا۔ لیکن ابھی وہ ملتان پہنچ بھی نہیں پایا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہلکر انگریز سپہ سالار جنرل لیک سے شکست کھا کر پنجاب میں

بھاگ آیا ہے اور برطانوی فوج اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ یہ ایک بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔ چنانچہ مہاراجہ ملتان کی مہم ملتوی کر کے فوراً لاہور واپس آیا اور اس قضیے کو نمٹایا۔ اس واقعے کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی۔

1807ء میں قصور فتح کرنے کے بعد مہاراجہ نے ملتان پر اس بہانے یورش کی کہ نواب مظفر، قصور کے حکمران سے ساز باز رکھتا ہے۔ چنانچہ قصور سے آنے کے بعد اس نے لاہور میں صرف دو ہفتے قیام کیا اور فوج لے کر ملتان پر چڑھ دوڑا۔ نواب مظفر خان نے بہاولپور کے حکمران نواب بہاول خان کو مدد کے لیے بلایا۔ اس نے اپنے نمائندے کے ذریعے مہاراجہ اور نواب مظفر میں صلح صفائی کرا دی۔ لیکن اس کے باوجود سکھ فوج نے ملتان کے نواحی علاقے میں خوب غارت گری کی۔ صلح کے بعد راجا نذرانہ وصول کر کے واپس لاہور آ گیا۔

نواب مظفر نے ایک آدھ مرتبہ تو خراج ادا کیا لیکن اس کے بعد بند کر دیا۔ اس پر مہاراجہ نے اپنے تمام سرداروں کو اپنی اپنی فوجی طاقت کے ہمراہ حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب سب لوگ پہنچ گئے تو اس نے 20 فروری 1810ء کو لاہور سے ملتان کے لیے کوچ کیا اور نہایت تیز رفتاری سے چار دن کے مختصر وقت میں ملتان پہنچا۔ اب کہ نواب مظفر بھی مقابلے کے لیے آمادہ تھا۔ اس نے شہر سے باہر معرکہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ 25 فروری کو دونوں فوجوں میں خونریز معرکہ ہوا۔ دونوں طرف کا بے اندازہ جانی نقصان ہوا۔ پٹھان جان توڑ کر لڑے لیکن سکھ فوج اپنی عددی برتری کی وجہ سے ان پر غالب آ گئی اور ملتانی فوج کو پسپا ہو کر قلعے میں محصور ہونا پڑا۔ شہر رنجیت سنگھ کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اب نواب مظفر نے قلعے میں قدم جما دیے اور بے جگری سے دفاع کرنے لگا۔ سکھوں نے قلعے پر بار بار دھاوا کیا لیکن ناکام رہے۔ جب کئی دن تک قلعہ فتح نہ ہو سکا تو آخر کار سردار نہال سنگھ اٹاری والے نے قلعے کی دیواروں کے نیچے کافی گہری سرنگیں کھود کر ان میں بارود بھر دیا۔ جب بارود کو آگ دکھائی گئی تو دیوار کا خاصہ حصہ زمین بوس ہو گیا۔ لیکن سردار نہال

سنگھ دیوار سے مناسب فاصلے پر نہ ہونے کی وجہ سے اڑتے ہوئے پتھروں کی زد میں آ گیا اور شدید زخمی ہوا۔ ایک دوسرا مشہور سردار عطر سنگھ دہاڑی بھی پتھر لگنے سے موقع پر ہلاک ہو گیا۔ جب دیوار گر گئی تو سکھ فوج نے تیز حملہ کیا۔ زبردست دست بدست جنگ کے بعد نواب مظفر سفید جھنڈا بلند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ نواب نے تاوانِ جنگ کے علاوہ ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ ادا کیا اور آئندہ وفا شعار رہنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد مہاراجہ واپس لاہور آ گیا۔

1816ء میں پھر مہاراجہ نے ملتان پر چڑھائی کی۔ اس کا مقصد حاکمِ ملتان سے بقایا جات کی وصولی تھا۔ یہ رقم ایک لاکھ سے زائد تھی۔ نواب مظفر نے اپنے نمائندے کو چالیس ہزار روپے دے کر بھیجا۔ رنجیت سنگھ نے کل رقم کا مطالبہ کیا لیکن نواب نے لیت و لعل سے کام لیا۔ اس پر مہاراجہ نے اپنی فوجوں کو متحرک کیا اور مضافاتی بستیوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ جب صورتِ حال یہ ہوئی تو نواب مظفر نے مزید اسی ہزار دے کر جان چھڑائی اور مہاراجہ نے لاہور کا رخ کیا۔

اگلے سال یعنی 1817ء کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے خراج کی وصولی کے لیے اپنے آدمی ملتان بھیجے، لیکن اسے اپنی جگہ یقین تھا کہ کام آسانی سے نہیں نکلے گا۔ چنانچہ اس نے تیاریاں شروع کر دیں اور پہلے دستے کی روانگی کے کچھ ہی دن بعد اس کے لیے کمک بھی بھیج دی۔ اس فوج نے جا کر ملتان کا محاصرہ کر لیا لیکن بعض افسروں کی غیر مستعدی کی وجہ سے محاصرہ ناکام ہو گیا۔ جب یہ اطلاع مہاراجہ کو ملی تو اس نے تیس ہزار کا لشکرِ جرار شہزادہ کھڑک سنگھ کی قیادت میں ملتان کی طرف روانہ کیا، مہاراجہ نے اس مہم کے لیے خصوصی انتظامات کیے۔ تمام علاقوں کے سرداروں کو رسد کی فراہمی کا حکم دیا۔ رسد کو بذریعہ دریا ملتان پہنچانے کے لیے کثیر استعداد کشتیاں حاصل کی گئیں۔ ڈاک کی ترسیل کا بھی خاص اہتمام کیا گیا۔ اسی فوج میں مصر دیوان چند بھی شامل تھا۔ جو دیوان محکم چند کے بعد فوجی معاملات کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اصل میں فوج کا سپہ سالار وہی تھا، لیکن مہاراجہ

رنجیت سنگھ نے شہزادہ کھڑک سنگھ کو اس مصلحت کے تحت سپہ سالار مقرر کیا تھا کہ سکھ سردار، مصر دیوان چند کی ماتحتی میں لڑنے سے گریز کریں گے۔ اس فوج نے ملتان کے علاقے پر زبردست یورش کی، اور معمولی مزاحمت کے بعد خان گڑھ اور مظفر گڑھ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جب اس فوج نے ملتان شہر پر حملہ کیا تو نواب مظفر خان نے شہر سے باہر مقابلہ کیا۔ خونی معرکے کے بعد جب سکھ کامیاب ہونے لگے تو نواب شہر میں پناہ گزین ہو گیا۔ سکھوں نے شہر پر یلغار کی اور کئی دن کی مزاحمت کے بعد شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب نواب مظفر نے قلعے میں محصور ہو کر دفائی جنگ لڑنی شروع کی۔ سکھوں نے قلعے کے بالمقابل مورچے قائم کر لیے اور قلعے کی فصیل پر گولہ باری کرنے لگے۔ نواب مظفر نے بڑے استقلال اور ہمت سے مقابلہ کیا۔ سکھوں کی بیحد کوشش کے باوجود قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ اسی اثناء میں سکھوں کا بھاری توپخانہ بھی ملتان پہنچ گیا۔ ان میں مشہور شوپ کلاں (بھنگیوں والی توپ) بھی تھی۔ اس توپ نے علاقے میں دو جگہوں پر بڑے شگاف ڈال دیئے۔ علاوہ ازیں سکھوں نے نواب مظفر کے کچھ لشکریوں کو رشوت دے کر ساتھ ملا لیا۔ اس طرح تقریباً دو ماہ کے محاصرے کے بعد سامانِ رسد اور گولہ بارود کی کمی ہو گئی تھی۔ ہر روز کے حملوں کی وجہ سے نواب مظفر کی نفری کم ہوتی گئی۔ حالات کا یہ رخ دیکھ کر نواب نے صلح کے لیے گفت و شنید کا آغاز کیا اور پیشکش کی کہ اگر قلعہ اسی کے پاس رہنے دیا جائے تو وہ دو لاکھ روپیہ نذرانہ کے طور پر پیش کرے گا اور اپنے لڑکے کو تین سو سواروں کے ساتھ دربارِ لاہور میں ملازمت کے لیے حاضر کرے گا۔ جب یہ بات مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لاہور میں بتائی گئی تو اس نے اس کو قبول نہ کیا اور حکم دیا کہ قلعے پر ہر حال میں قبضہ کیا جائے۔ اس پر کھڑک سنگھ نے نواب کو پیغام بھیجا کہ قلعے سے دستبردار ہو جاؤ۔ نواب نے اب یہ حل تجویز کیا کہ اگر شجاع آباد اور خان گڑھ کے قلعے اور ان کا ملحقہ علاقہ نواب کو گزارے کے لیے دے دیا جائے تو وہ مظفر گڑھ اور ملتان کے قلعے خالی کر دے گا۔ یہ تجویز بھی توثیق کے لیے مہاراجہ کے پاس بھیجی

گئی۔ مہاراجہ نے اس تجویز کو مان لیا۔ لیکن جب اس سمجھوتے پر عمل درآمد ہونے لگا تو نواب مظفر کے عزیز واقارب نے اسے طعنے دیے کہ وہ بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ہم یہ ذلت کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ اس پر ساری صورتحال یک لخت بدل گئی اور پھر سے فوجی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سکھ فوج نے قلعے پر ہر چہار طرف سے حملہ کیا۔ توپوں کی گولہ باری نے دیوار میں کئی جگہ شگاف کر دیئے۔ بارودی سرنگیں لگا کر قلعے کی دیواریں گرا دی گئیں اور نہنگ اکالیوں کا دستہ سردار سادھو سنگھ کی قیادت میں ایک طرف سے قلعے میں داخل ہو گیا۔ اس جگہ نواب مظفر بذاتِ خود موجود تھا۔ اس نے اور اس کے بیٹوں بھتیجوں نے تیغ زنی کے تاریخی مظاہرے کئے لیکن ایک ایک کر کے سب مارے گئے۔ نواب کے قتل ہوتے ہی اس کی فوج ہمت ہار گئی اور سکھوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ نواب کے دولڑکے قید کر کے لاہور روانہ کر دیئے گئے۔ مہاراجہ ان سے بڑی ملائمت سے پیش آیا اور شرقپور کا علاقہ ان کو بطور جاگیر عطا کیا۔

ملتان کے قلعے سے سکھ فوج کو کثیر زر و مال حاصل ہوا۔ اس مالِ غنیمت میں اشرفیاں، ہیرے، جواہرات، مرصع تلواریں، مہریں، بندوقیں، قالین غالیچے اور شالیں وغیرہ تھیں۔ اس کی مجموعی مالیت کا اندازہ دو لاکھ لگایا گیا ہے۔ شجاع آباد کے قلعے سے بھی کافی کچھ ملا۔ یہ تمام مالِ غنیمت سرکار خالصہ کی ملکیت قرار دے کر خزانے میں داخل کر دیا گیا۔ اس فتح پر مہاراجہ نے لاہور میں بہت بڑا جشن منایا۔ جس میں اس مہم میں شریک سرداروں کو انعامات اور قیمتی خلعتیں وغیرہ عطا کی گئیں۔

مہاراجہ نے ملتان کا الحاق لاہور سے کر لیا۔ ملتان میں اپنا تھانہ قائم کیا اور وہاں سردار دل سنگھ نریہنہ، سردار جودھ سنگھ کلسیہ اور سردار سنگھ دوآبیہ کی سربراہی میں چھ سو سپاہی مقرر کئے۔ شجاع آباد کے قلعے میں بھی فوج کے دو دستے تعینات کئے گئے۔ ملتان کے قلعے اور شہر کی فصیلوں وغیرہ کی مرمت کا حکم دیا۔

کھڑک سنگھ کی منگنی:

1803ء میں مہاراجہ نے اپنے لڑکے کھڑک سنگھ کی نسبت جمیل سنگھ کنھیا کی چھوٹی بیٹی سے طے کی۔ سارے ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔ اس منگنی کی وجہ سے رنجیت سنگھ اور کنھیا مسل کے درمیان خوشگوار تعلقات میں اضافہ ہوا۔

مشہور طوائف موراں سے بھی مہاراجہ کا تعارف اسی زمانے میں ایک محفل میں ہوا۔ مہاراجہ کو بہت جلد اس سے تعلق خاطر پیدا ہو گیا اور وہ کافی مدت تک اس کا اسیر رہا۔

دربار امرتسر:

1803ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ مقدس مذہبی مقام امرتسر کی زیارت کے لیے گیا اس کے ساتھ اس کے تمام سرکردہ سردار اور کچھ فوج بھی تھی۔ امرتسر میں فوج نے اپنے جنگی کرتبوں کا مظاہرہ کیا۔ یہاں مہاراجہ نے عظیم الشان دربار منعقد کیا اور اپنی باقاعدہ فوج کے افسروں کے تقرر کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ باقاعدہ فوج بھی قائم کی گئی۔ باقاعدہ فوج کی کل تعداد ساڑھے تیرہ ہزار تھی۔ اس میں اگر بے قاعدہ فوج بھی شامل کر لی جائے تو مہاراجہ کی کل فوجی قوت اکتیس ہزار بنتی ہے۔ باقاعدہ سرداروں میں سردار فتح سنگھ کلیانوالہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ مہاراجہ اس کی صلاحیتوں کا بڑا معترف تھا۔

شالامار باغ کی مرمت:

1805ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک دن شالامار باغ کی سیر کو گیا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس علاقے میں سکھوں نے بہت لوٹ مار کی تھی اور شالامار باغ بھی ان کی غارتگری کا نشانہ بنا تھا۔ چنانچہ جب مہاراجہ باغ کی سیر کو آیا تو اس کی ویران حالت دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ فوراً اس کی مرمت کی جائے۔ علی مردان خان کی بنوائی ہوئی نہر کو بھی دوبارہ جاری کرنے کا حکم دیا۔ گل و سبزہ کی حفاظت کے لیے بھی مناسب انتظام کیا۔ اس طرح مہاراجہ کی توجہ سے باغ کی عظمتِ رفتہ لوٹ آئی۔

مرہٹہ سردار کی پنجاب میں آمد:

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے 1805ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ ملتان کی مہم پر تھا اور ابھی اس نے وہاں اپنی کارروائی کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ اسے لاہور سے اطلاع ملی کہ اندور کا حکمران جسونت راؤ ہلکر، انگریز جرنیل لارڈ لیک سے شکست کھا کر پنجاب میں داخل ہو چکا ہے اور لارڈ لیک اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ معاملے کی اہمیت کے پیشِ نظر مہاراجہ نے ملتان کے خلاف مہم کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا اور خود فوراً واپس لاہور آیا۔ لاہور میں جسونت راؤ کا نمائندہ اس کے پاس حاضر ہوا۔ تحائف اور نذرانے پیش کیے اور انگریزوں کے خلاف مدد طلب کی۔ اس کے بعد مہاراجہ نے اپنی مجلسِ مشاورت بلائی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر انگریزوں اور مرہٹوں میں اب کے جنگ ہوئی تو وہ پنجاب کی حدود میں ہوگی اور اس میں پنجاب ہی کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔ اس لیے ان دونوں طاقتوں کے درمیان تصادم روکنے کے لیے مہاراجہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے۔ مہاراجہ نے امرتسر میں جسونت راؤ کے قیام کا بندوبست کیا۔ ساتھ ہی انگریز حکام کو مہاراجہ نے ایک خط لکھا جس میں ان سے مصالحت کی درخواست کی گئی تھی۔ مہاراجہ نے فریقین کے تعلقات بہتر بنانے کے لیے بہت تگ ودو کی۔ اسی اثناء میں ہندوستانی جنگ باز گورنر جنرل لارڈ ولزلی واپس برطانیہ چلا گیا اور اس کی جگہ لارڈ کارنوالس نے بھی مزید جنگ وجدل مناسب نہ سمجھا اور مرہٹوں سے صلح کر لی۔ جس کے نتیجے میں مرہٹوں کے مفتوحہ علاقے انہیں واپس مل گئے۔ یہ واقعہ مہاراجہ کی سیاسی بصیرت کا مظاہرہ ہے۔ اسی واقعہ کی بدولت انگریزی حکومت کے ساتھ اس کے روابط بہت اچھے ہو گئے۔ مہاراجہ کے علاوہ اس معاملے میں سردار بھاگ سنگھ اور سردار فتح سنگھ اہلو والیہ نے بھی کافی سفارتی کاوش کی تھی لہٰذا سرکار انگریز نے ان سے بھی خاص تشکر کا اظہار کیا۔

ستلج پار کی سکھ ریاستوں میں تنازعہ:

دلادی نامی ایک معمولی قصبہ ریاست نابھہ اور ریاست پٹیالہ کی سرحد پر واقعہ ہونے کی وجہ سے دونوں ریاستوں میں تنازعہ کا سبب تھا۔ دونوں ریاستیں اس پر اپنا حق سمجھتی تھیں۔ پٹیالہ کے حکمران صاحب سنگھ نے تو بھائی تاراسنگھ کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے وہاں مقرر کر رکھا تھا۔ بھائی تاراسنگھ کو کسی نے قتل کر دیا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اسے جسونت سنگھ نابھہ کی سازش سمجھا اور فوجی تیاریاں کر کے اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ تھانیسر کے حکمران مہتاب سنگھ اور کیتھل کے حکمران بھائی لال سنگھ نے اس کشمکش میں مہاراجہ پٹیالہ کا ساتھ دیا۔ دونوں ریاستوں میں اکثر چھوٹی بڑی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایسی ہی ایک جھڑپ میں سردار مہتاب سنگھ مارا گیا، جس سے مہاراجہ پٹیالہ کے غم وغصہ میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس نے اب مہاراجہ رنجیت سنگھ سے امداد مانگی۔ اس کا ایلچی سردار دھیان سنگھ مہاراجہ کے پاس حاضر ہوا اور نہایت بیش قیمت مروارید کی مالا پیش کر کے مہاراجہ کو اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ رنجیت سنگھ نے اس کی مدد کی فوراً حامی بھر لی۔ کیونکہ دراصل وہ خود بھی ستلج پار کی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کے لیے موقع کا منتظر تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کافی فوج اور توپخانہ لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں تمام سرداروں سے نذرانے وصول کرتا ہوا وہ پٹیالہ پہنچا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ چند دن کے توقف کے بعد مہاراجہ نے فریقین کا مؤقف سنا اور متنازعہ گاؤں کے سلسلے میں مہاراجہ پٹیالہ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لیکن مہاراجہ ناتھ کی دلجوئی کے لیے تلونڈی، جگراؤں اور کوٹ بسیہ کے علاوہ اکتیس گاؤں جن کی سالانہ آمدنی تقریباً چوبیس ہزار روپے تھی، راجا نابھہ کو دے دیئے۔ لدھیانہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ جنیا کے حکمران کو عطا ہوا۔ علاوہ ازیں سردار فتح سنگھ اہلووالیہ کو بھی کچھ علاقہ دیا۔ اس فیصلے کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کے بعد مہاراجہ واپس آ گیا۔

اگلے سال یعنی 1807ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ریاست پٹیالہ کے ایک خالص اندرونی معاملے میں پھر مداخلت کرنا پڑی۔ ہوا یہ کہ ولی عہد کے مسئلے پر پٹیالہ کے راجا اور اس کی بیوی میں جھگڑا ہو گیا۔ رانی اپنے بیٹی کی ولی عہدی کا اعلان کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ راجا راجکمار کے استحقاق کو تو تسلیم کرتا تھا، لیکن اس اعلان کو قبل از وقت سمجھتا تھا۔ معاملے نے طول کھینچا اس رسہ کشی میں ریاستی حکام دو گروہوں میں منقسم ہو گئے اور اب ان میں تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو بعض بہی خواہ مصاحبین کے کہنے پر راجا نے اس قضیے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ثالث بننے کی درخواست کی جسے مہاراجہ نے فوراً قبول کر لیا اور بہت سی فوج لے کر پٹیالہ جا پہنچا۔ جہاں اس کا پر جوش استقبال کیا گیا۔ مہاراجہ نے دونوں گروہوں کا موقف سنا اور فیصلہ یہ کیا کہ مہاراجہ کی زندگی میں ولی عہد کے تقرر کا باضابطہ اعلان غیر ضروری ہے رانی کے گروہ کو خوش کرنے کے لیے مہاراجہ نے ولی عہد کو ایک بڑی جاگیر دینے کی سفارش کی۔ اس جاگیر کی سالانہ آمدنی پچیس ہزار روپیہ تھی۔ فریقین نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا اور مہاراجہ نذرانوں کا انبار لے کر وہاں سے روانہ ہوا۔

واپس آتے ہوئے جب مہاراجہ انبالہ پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ سرمور کا سردار کشن سنگھ لاہور کی برتری ماننے سے انکار کرتا ہے۔ سرمور کا صدر مقام نرائن گڑھ ایک بڑے خوش منظر بلند مقام پر واقع تھا۔ یہاں کا قلعہ بھی دفاعی اعتبار سے بہت مضبوط خیال کیا جاتا تھا۔ جس میں بہت سی توپیں نصب تھیں۔ راجا کشن سنگھ نے جب مہاراجہ کی آمد کی خبر سنی تو مزاحمت کے لیے تیار ہو گیا۔ مہاراجہ کی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس جنگ میں سردار فتح سنگھ کلیانوالہ نے بہادری اور جرأت کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے دستے کے ساتھ براہ راست قلعے کی فصیل پر حملہ آور ہوا اور دشمن کی دو توپیں چھین کر لے آیا۔ لیکن توپیں مہاراجہ کے لشکر میں نہیں پہنچی تھیں کہ گولی لگنے سے سردار فتح سنگھ ہلاک ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سردار فتح سنگھ کی موت سے از حد غمناک ہوا۔ اس نے لشکر کو حملے کا حکم دیا۔ اس پر سردار موہن سنگھ اور سردار فتح سنگھ بھنڈاری آگے بڑھے، لیکن یہ دونوں سردار بھی تھوڑی دیر بعد جنگ کی تباہ

کاری کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس صورتِ حال پر مہاراجہ بہت غضبناک ہوا اور فوج کو زوردار اور فیصلہ کن حملے کا حکم دیا۔ چنانچہ سکھ فوج نے اس قدر تیز حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور قلعہ ان کے قبضے میں آ گیا۔ راجا کشن سنگھ جان بچا کر بھاگ نکلا۔ مہاراجہ نے نرائن گڑھ کا علاقہ سردار فتح سنگھ اہلو والیہ کو بطور جاگیر عطا کیا۔ علاوہ ازیں اسے نرائن گڑھ کے نواحی علاقے نوشہرہ، بہلولپور اور مورنڈہ بھی دیے گئے۔

دیوان محکم چند کی دربارِ لاہور میں شمولیت:

1897ء کے آخر میں دیوان محکم چند جو اپنے وقت کا ممتاز ترین ماہرِ فنِ حرب تھا، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس سے قبل وہ سردار صاحب سنگھ بھنگی کے پاس ملازم تھا۔ صاحب سنگھ کے ساتھ جنگوں میں مہاراجہ نے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ اب وہ مہاراجہ کے پاس آیا تو مہاراجہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور دربار میں ممتاز منصب عطا کیا۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوان محکم چند مہاراجہ کی توسیع پسندانہ پالیسی میں بہت ممد و معاون ثابت ہوا۔

لاہور میں دربار کا انعقاد:

1808ء کے ربع اوّل میں جب مہاراجہ پہاڑی علاقوں کے دورے سے لوٹا تو اس نے لاہور میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا، جس میں پنجاب کے تمام میدانی اور پہاڑی ریاستوں کے راجے شریک ہوئے۔ مہاراجہ کو نذریں پیش کیں اور حسبِ مراتب خلعتیں پائیں۔ اس تقریب میں صرف دو سردار باوجود یاددہانیوں کے شریک نہ ہوئے۔ ایک گجرات کا حکمران صاحب سنگھ بھنگی اور دوسرا سیالکوٹ کا حکمران جیون سنگھ، مہاراجہ کو ان کا یہ طرزِ عمل بہت گراں گزرا۔ لہٰذا اس نے انہیں سزا دینے کا تہیہ کر لیا۔

سیالکوٹ کی فتح:

تقریب کی مصروفیات سے فراغت پاتے ہی مہاراجہ نے سیالکوٹ کے حکمران کو سبق سکھانے کے لیے فوجوں کو تیار کیا اور سیالکوٹ پر حملہ کر دیا۔ سیالکوٹ پہنچ کر اس نے حاکم سیالکوٹ سردار جیون سنگھ سے لاہور دربار کے انعقاد میں نہ آنے کی وضاحت چاہی لیکن اس نے اظہارِ معذرت کی بجائے جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا جس کی وجہ سے تصادم کے امکانات اور بڑھ گئے۔ بالآخر جیون سنگھ نے خود ہی قلعے سے مہاراجہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ لیکن مہاراجہ کی فوج نے زبردست حملے کے بعد قلعہ فتح کر لیا اور سپاہیوں نے قلعے میں جو بھی سامنے آیا اچک لیا اور خوب غارتگری کی۔ مہاراجہ نے سردار جیون سنگھ کو گزر اوقات کے لیے مناسب جاگیر دے دی اور سیالکوٹ کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔

اکھنور کی جانب پیش قدمی:

سیالکوٹ کو فتح کرنے کے بعد مہاراجہ نے اکھنور کی جانب پیش قدمی کی۔ لیکن وہاں کے حکمران عالم سنگھ نے مصالحت ہی میں عافیت سمجھی اور تیرہ ہزار روپیہ دے کر رنجیت سنگھ کو ٹالا۔

گجرات کے راجا کی معذرت طلبی:

اکھنور سے فارغ ہو کر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گجرات کا رخ کیا۔ گجرات کا حکمران صاحب سنگھ بھنگی، حاکمِ سیالکوٹ کے انجام کا حال سن چکا تھا۔ اس لیے جونہی مہاراجہ گجرات کے نزدیک پہنچا اس نے اپنا نمائندہ مہاراجہ کی خدمت میں بھیجا جس نے صاحب سنگھ کی طرف سے دست بستہ معافی مانگی اور آئندہ کے لیے اطاعت گزاری کی تحریر لکھ دی۔ اس پر مہاراجہ نے اس کی معافی قبول کر لی اور اسے سرداری پر بحال رہنے دیا اور خود واپس لاہور آ گیا۔

کنھیا علاقے کا دورہ:

اسی سال مہاراجہ رنجیت سنگھ کنھیا علاقے کی طرف گیا۔ کنھیا سردار جمیل سنگھ نے پچیس ہزار روپیہ نذر کیا۔ علاوہ ازیں مہاراجہ نے اس کے کافی علاقے کو لاہور کے ساتھ ملحق کر لیا۔ جمیل سنگھ سے مہاراجہ نے رشتہ داری بھی قائم کر رکھی تھی۔

شیخوپورہ:

شیخوپورہ کا قلعہ پنجاب کے چند مستحکم ترین قلعوں میں سے ایک تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ مدت سے اس پر قبضہ کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں جب شیخوپورہ کے سردار امر سنگھ سے بات چیت کی گئی تو اس نے اس شرط پر مہاراجہ کی برتری قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ اس علاقے میں اسے ہی حاکم رہنے دیا جائے اور قلعہ اس سے خالی نہ کرایا جائے۔ مہاراجہ نے یہ شرط منظور نہ کی۔ مہاراجہ قلعے کو بہر حال اپنے تصرف میں لانا چاہتا تھا جس کے لیے امر سنگھ تیار نہ تھا۔ چنانچہ مہاراجہ نے قلعے پر بزور قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا اور زبردست فوج ولی عہد کھڑک سنگھ کی قیادت میں روانہ کی۔ کھڑک سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور اس کی دیواریں منہدم کرنے کے لیے شدید گولہ باری شروع کر دی۔ لیکن دیواروں پر گولہ باری کا کچھ اثر نہ ہوا۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے اور قلعے کے ایک انچ حصے پر بھی قبضہ نہ ہو سکا۔ کھڑک سنگھ اس صورتِ حال پر بہت پریشان ہوا اور اس نے طاقت کے بجائے ترکیب بازی سے کام لیا۔ اس نے قلعے کے چند اہم افراد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ انہوں نے لالچ میں آ کر قلعے کے ایک نازک مقام کی نشان دہی کر دی۔ چنانچہ کھڑک سنگھ نے توپخانے کی تمام قوت اسی جگہ مرکوز کر دی۔ تھوڑی دیر بعد اس جگہ سے دیوار گر گئی اور سکھ لشکر قلعے میں گھس گیا۔ سردار امر سنگھ پکڑا گیا۔ مہاراجہ نے شیخوپورہ کا علاقہ شہزادہ کھڑک سنگھ کو انعام میں دے دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سے کشمکش کا آغاز:

لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کوئی وقت فرصت کا نہیں گزارا۔ اسے ہر وقت کوئی نہ کوئی علاقہ فتح کرنے کا خیال رہتا تھا۔ ایک تو وہ فطرۃً مہم جو تھا اور دوسرے وہ عمر کے اس حصے میں تھا جس میں کہ باوجود بے بضاعتی کے بھی انسان کا دل ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کو چاہتا ہے۔ اس لیے اس کی کیفیت یہ تھی کہ ہمہ وقت پا بہ رکاب۔ آٹھ نو سال تک اس نے توسیع پسندانہ پالیسی پر بھرپور عمل کیا۔ نتیجتاً بہت بڑا علاقہ اس نے فتح کر لیا۔ وہ جدھر کا رخ کرتا اس کے مخالف شکست کھاتے اور وہ ظفریاب ہوتا۔ بڑے سے بڑے نامور سردار اس سے مات کھا گئے۔ لاہور کے قرب و جوار کی تمام سکھ مسلیں اس کے ماتحت آ چکی تھیں۔ قصور اور ملتان کی دو زبردست مسلمان قوتوں کو وہ شکست دے چکا تھا۔ کانگڑہ کی ہندو ریاست بھی اس کے لیے سدِّ راہ نہ بن سکی۔ اب رنجیت سنگھ اپنے اقتدار کی حدود کو مزید پھیلانے کے لیے ستلج پار کی طرف بڑھنا چاہتا تھا اور وہاں اپنا اثر قائم کرنے کے لیے اس نے ماضی قریب میں ستلج پار واقعہ ریاستوں کے معاملات میں کئی بار مداخلت کی تھی۔ چنانچہ ان ریاستوں کو مہاراجہ کے عزائم کا احساس ہو گیا اور اب انہوں نے سنجیدگی سے اس مسئلے کا حل سوچنا شروع کر دیا۔

انگریزوں نے پہلے بنگال کو فتح کیا اور پھر بتدریج بڑھتے ہوئے 1803ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی سے مغرب کی سمت انگریز عملداری کی حد دریائے جمنا تھی۔ دریائے جمنا اور دریائے ستلج کے درمیانی علاقے میں دوسری ریاستوں کے علاوہ کئی سکھ ریاستیں بھی تھیں۔ اب اس علاقے کی صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف سے انگریز پیش قدمی کر رہے تھے اور دوسری طرف سے مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی سلطنت کو وسعت دے رہا تھا۔ ان حالات میں یہ بات واضح ہو گئی کہ ان ریاستوں کے خودمختار رہنے کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ اب ان کے لیے صرف یہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے حلیف بن جائیں۔

چنانچہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ریاستی سربراہوں کا ایک اجتماع سامانہ میں ہوا۔ جس میں اس مسئلے پر ہر پہلو سے غور کیا گیا۔ قبل ازیں کچھ سردار انگریزوں کے تحفظ میں جا چکے تھے۔ انہوں نے رائے پیش کی کہ سرکارِ برطانیہ کے ساتھ الحاق بہتر رہے گا۔ وہ ذاتی طور پر انگریزوں کی سیاسی دیانت کے معترف تھے۔ اس تجویز سے بعض دوسرے سرداروں نے اختلاف کیا، لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پناہ میں جانے سے ان کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ کیونکہ اوّل تو مہاراجہ ہی انہیں ختم کر دے گا۔ اگر بفرضِ محال مہاراجہ انہیں باقی رہنے بھی دے تو کل کلاں جب انگریز پورے ہند پر قبضہ کرنے کے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے ستلج پار کر کے مہاراجہ کی سلطنت پر حملہ کریں گے تو سکھ ریاست کے ساتھ ساتھ اس میں شامل ان چھوٹی وحدتوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جبکہ انگریزوں کے ساتھ ملنے میں ایسا کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوتا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ انگریزی حکومت کے ساتھ ملنا ہی ان کے حق میں مفید ہے۔ اس فیصلے کے بعد ان راجوں نے اپنا ایک مشترکہ وفد دہلی بھیجا تاکہ وہ انگریز حکام سے اس مسئلے پر مذاکرات کر سکے۔ یہ وفد 27 مارچ 1808ء کو دہلی کے ریزیڈنٹ مسٹر سٹین سے ملا۔ مسٹر سٹین نے وفد کو کوئی حوصلہ افزا جواب نہ دیا اور صرف یہ کہا کہ وہ اس درخواست کو کلکتہ میں گورنر جنرل کے پاس بھیج دے گا۔

اس مسئلے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا پڑے گا کہ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں یورپ کی سیاسی صورتحال کیا تھی۔ یورپ میں یہ زمانہ نپولین بونا پارٹ کے عروج کا تھا۔ نپولین اس وقت تک پورے یورپ کو روند چکا تھا اور روس سے معاہدہ کر کے اپنی ایک سرحد محفوظ کر چکا تھا اور اب اس کا ارادہ تھا کہ ترکی کے تعاون سے ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ یہ افواہ عام ہوتے ہی برطانوی حکومت زبردست اضطراب میں مبتلا ہو گئی۔ کیونکہ نپولین کے حملے کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا انگریز گورنر جنرل لارڈ منٹو نے اس سنگین معاملے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ابتدائی

اقدامات کے طور پر اپنے وفود ہمسایہ ریاستوں میں بھیجے۔اس سلسلے میں مہاراجہ کے پاس بھی ایک وفد مسٹر چارلس ٹی مٹکاف کی سربراہی میں قصور سے کچھ فاصلے پر واقع قصبے کھیم کرن میں 11 ستمبر 1808ء کو حاضر ہوا۔ مہاراجہ نے سردار فتح سنگھ اہلو والیہ اور دیوان محکم چند کو دو ہزار منتخب جوانوں کے ساتھ استقبال کے لیے بھیجا۔ جب مٹکاف مہاراجہ کی فرودگاہ میں پہنچا تو مہاراجہ نے اپنے خیمے سے باہر آ کر اس کا خیر مقدم کیا اور بیش بہا انعامات عطاء کئے۔ دوسرے دن مہاراجہ اس سے ملنے کے لیے اس کی خیمہ گاہ میں گیا تو مٹکاف نے گورنر جنرل کی طرف سے متعدد قیمتی تحائف پیش کئے۔اس کے بعد مذاکرات شروع ہوئے۔مٹکاف نے حکومتِ ہند کی طرف سے ایک مسودہ پیش کیا جس میں کہا گیا تھا:

1- فرانسیسی حملے کی صورت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ انگریزوں کے ساتھ تعاون کرے۔
2- اگر انگریز افغانستان پر فوج کشی کریں تو مہاراجہ اپنے علاقے سے انگریز فوجوں کو گزرنے دے۔
3- مہاراجہ بوقتِ ضرورت افغانستان جانے والی انگریزی ڈاک کے تحفظ کا بندوبست کرے۔

مہاراجہ نے کہا کہ اس مسودے میں صرف برطانوی مفادات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور پنجاب کے مفادات کو قطعاً نظر انداز کیا گیا ہے۔لہٰذا ہم اس مسودے کو مستقل حیثیت دینے سے قاصر ہیں۔اس کے بعد مہاراجہ نے اپنا جوابی مسودہ مٹکاف کے حوالے کیا۔ اس مسودے کے مندرجات یہ تھے:

1- مہاراجہ اور افغانستان کے درمیان قضیے کی صورت میں انگریز سرکار دخل نہ دے۔
2- دربار لاہور اور حکومتِ ہند کے درمیان دوستی رہے۔
3- انگریز سرکار، پنجاب کی تمام سکھ ریاستوں پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شاہی برتری تسلیم کرے۔(اس سے مہاراجہ کا مقصد ستلج پار کی ریاستوں پر ہاتھ صاف کرنا تھا)

انگریز سفیر نے عرض کی اسے ان شرائط کو تسلیم کرنے کا اختیار نہیں لیکن وہ اسے گورنر

جنرل کے پاس بھیج سکتا ہے۔ جہاں سے جواب آنے پر مہاراجہ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

اس ملاقات کے فوراً بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فوجوں کو تیاری کا حکم دیا۔ دراصل مہاراجہ فرانسیسی حملے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک اہم ترین مسئلہ ستلج پار کی سکھ ریاستوں کو اپنے زیرِ تسلط لانا تھا اور اس کے نزدیک انگریزوں کی طرف سے اس معاہدے کی پیشکش کی غرض و غایت محض مہاراجہ کے دائرہ عمل کو محدود کرنا تھا۔ جس کے لیے مہاراجہ ہرگز تیار نہ تھا، کیونکہ اس نے خالصہ پنتھ کے اتحاد کو اپنا مقصدِ حیات بنا رکھا تھا اور وہ ہر قیمت پر ایک عظیم تر سکھ ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔

مہاراجہ ستلج پار کی سکھ ریاستوں کے انگریزی حکومت کے تحفظ میں چلے جانے کو کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ لٰہذا اس نے اس ملاقات کے فوراً بعد اپنی تمام طاقت کے ساتھ دریائے ستلج عبور کیا اور سکھ ریاستوں کا دورہ شروع کر دیا۔ اس دورے میں نابھہ کے راجا جسونت سنگھ، راجا بھاگ سنگھ، سردار گوردت سنگھ اور بھائی لعل سنگھ کے علاوہ بھی کئی مشہور سردار، مہاراجہ کے ہمرکاب تھے۔ فیروز پور کے حکمران نے نذرانہ پیش کیا۔ اس وقت مہاراجہ 'کھائی' نامی ایک مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے اس نے سردار کرم سنگھ چاہل کو فرید کوٹ پر حملے کے لیے ہراول کے طور پر بھیجا۔ اس کے بعد خود بھی اسی سمت میں روانہ ہوا۔ فرید کوٹ کو سردار کرم سنگھ نے مفتوح کر لیا۔ مہاراجہ نے اکتوبر 1808ء کو اس جگہ اپنا تھانہ قائم کیا اور یہاں سے روانہ ہو کر ملیر کوٹلہ کے حکمران سے پیش کش وصول کی۔ یہاں سے مہاراجہ نے انبالہ کا رخ کیا اور قلعے کو فتح کر کے وہاں بھی اپنا تھانہ بنا دیا۔ یہاں اس نے سردار فتح سنگھ صافی کو دو ہزار سواروں کے ساتھ قلعدار مقرر کیا۔ اس کے بعد مہاراجہ شاہ آباد اور دوسرے شہروں سے ہوتا ہوا دسمبر میں واپس امرتسر آ گیا۔

مہاراجہ کے اس جارحانہ طرزِ عمل پر حکومتِ برطانیہ نے بہت برا منایا۔ مسٹر مٹکاف نے مہاراجہ کے خلاف اپنی حکومت کو رپورٹیں بھیجیں اور مہاراجہ سے زیرِ لب احتجاج بھی کیا جس کی مہاراجہ نے پرواہ نہ کی۔ حکومتِ ہند نے مہاراجہ کی نقل و حرکت پر گہری نظر تو رکھی لیکن

مہاراجہ کو بزور روکنے سے گریز کرتی رہی۔ لیکن جب مہاراجہ شاہ آباد تک جا پہنچا تو انگریزوں نے جوابی کارروائی کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ مہاراجہ کو مزید ڈھیل دینے سے ستلج پار کی ریاستوں کا اعتماد انگریزوں پر سے قطعاً اٹھ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور انگریز یہ صورتحال پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا کرنل ڈیوڈ اکھترلونی کی کمان میں برطانوی فوج نے 16 جنوری 1809ء کو جمنا پار کیا اور برڑیہ، پٹیالہ سے ہوتی ہوئی لدھیانہ آ پہنچی۔ اس فوج کے آنے پر اس علاقے میں مہاراجہ کی فوجی کارروائیوں کی وجہ سے پھیلے ہوئے خوف و ہراس میں کمی آ گئی اور والیانِ ریاست اپنے مستقبل کے بارے میں پرامید ہو گئے۔ انہوں نے پھر آپس میں مشورے کئے اور اپنے سابقہ فیصلے کا اعادہ کرتے ہوئے انگریز کرنل کی وساطت سے گورنر جنرل نے ان کی اس استدعا کو منظور کرتے ہوئے ایک اعلان جاری کیا۔ اس اعلان میں کہا گیا تھا کہ ستلج پار کے والیانِ ریاست ایک مدت سے انگریز سرکار کی پناہ میں آنے کے خواہشمند تھے۔ جس کا انہوں نے ایک سے زائد بار اظہار بھی کیا۔ چنانچہ اب انگریز سرکار نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ لہٰذا مہاراجہ رنجیت سنگھ آئندہ اس علاقے سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ اس نے اپنی فوج اس علاقے میں متعین کر رکھی ہے اسے بھی واپس بلا لے۔ بصورتِ دیگر انگریز سرکار کے لیے طاقت استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

جب یہ اعلان کرنل مذکور کے پاس پہنچا تو اس نے اس اعلان کی بنیاد پر ایک اطلاع نامہ 9 فروری 1809ء کو مہاراجہ کے پاس بھیج دیا۔ اس اطلاع نامے کے مندرجات حسب ذیل تھے:

1- ستلج کے اس طرف مہاراجہ کے جو مقبوضات ہیں وہ ان کے پرانے مالکوں کو لوٹا دیئے جائیں۔

2- ستلج کے اس طرف مہاراجہ کی جو فوج متعین ہے وہ واپس مہاراجہ کے علاقے میں چلی جائے۔

3- پھلور گھاٹ پر موجود سکھ فوج دریا کے دوسرے کنارے پر چلی جائے اور آئندہ ہرگز دریا عبور نہ کرے۔ کیونکہ اب یہ علاقہ انگریزی عملداری میں شامل ہو چکا ہے۔ چونکہ انگریز سرکار نے اپنی فوج کے قلیل التعداد دستے دریا کی دوسری طرف واقع اپنے تھانوں میں تعینات کرر کھے ہیں۔ لہٰذا مہاراجہ کو بھی اس علاقے میں زیادہ سے زیادہ اسی قدر فوج رکھنے کی اجازت ہے۔

4- اگر مہاراجہ مذکورہ شرائط پر عمل کرے تو دونوں ہمسایہ مملکتوں کے درمیان دوستی کے رشتے مزید مضبوط ہوں گے اور اسے ان شرائط پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ وہ کئی بار مسٹر مٹکاف کے سامنے ان باتوں کی معقولیت کا اقرار کر چکا ہے۔ لیکن اگر مہاراجہ نے ان معروضات کو قابلِ اعتناء نہ سمجھا تو انگریز حکومت اس سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوگی کہ مہاراجہ کے دل میں انگریزوں کی دوستی کی کوئی قدر نہیں ہے۔ اس صورت میں برطانوی افواج اپنا فرض ادا کریں گی۔

5- اس اطلاع نامے کا مقصد انگریزی سرکار کے جذبات واحساسات کو مہاراجہ تک پہنچانا ہے۔ تاکہ مہاراجہ ساری صورتِ حال پر اچھی طرح سے غور کرے۔ وہ اس پیشکش کو اپنے حق میں بہتر پائے گا کیونکہ انگریز سرکار اپنی برتر فوجی حیثیت کے باوجود مسلح تصادم کی خواہاں نہیں ہے۔ بلکہ صلح کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔

جب یہ مراسلہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ملا تو وہ بہت طیش میں آیا اور اس نے انگریزوں سے جنگ کی ٹھان لی۔ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا۔ مہاراجہ نے اپنے ماتحت تمام سرداروں کو اپنی تمام تر فوجی قوت کے ساتھ لاہور حاضر ہونے کا حکم دیا اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ وافر مقدار میں اشیائے رسد اور گولہ بارود مہیا کر کے ہمراہ لایا جائے۔ مہاراجہ نے اپنے مشہور جرنیل دیوان محکم چند کو کانگڑہ سے پھلور پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ ان دنوں کثیر فوج کے ساتھ کانگڑہ میں گورکھوں کے خلاف کارروائی کر رہا تھا۔ دیوان محکم چند حکم ملتے ہی تمام فوج اور توپخانے کے ساتھ پھلور پہنچ گیا۔ علاوہ ازیں تمام قلعوں کو دفاعی اعتبار سے زیادہ مضبوط بنایا

گیا۔ لاہور کے قلعے کی فصیل کی مرمت کی گئی اور خندق کی چوڑائی میں اضافہ کیا گیا۔ امرتسر کے قلعہ گوبند گڑھ کو مزید پختہ کیا گیا۔ سب قلعوں پر توپیں نصب کی گئیں۔ اسی اثناء میں اطراف و جوانب سے سکھ سردار اپنے اپنے جتھے لے کر لاہور پہنچ گئے۔ چند دنوں میں تقریباً ایک لاکھ عظیم لشکر انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے جمع ہو گیا اور مہاراجہ نے اسے ستلج پار مختلف مقامات کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔

جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ان وسیع جنگی تیاریوں کی تفصیل کمپنی تک پہنچی تو انہوں نے بھی صورتِ حال کے مطابق تمام ضروری انتظامات کر لیے۔ کرنل ڈیوڈ کھترلونی کو مناسب کمک بھیج دی اور اس نے لدھیانہ میں اپنی زبردست فوجی چھاؤنی قائم کر دی۔ اس دوران میں یورپ سے بھی خاصی امید افزا خبریں ملیں۔ ادھر نپولین کا زور ٹوٹ رہا تھا اور اس کی سلطنت شدید نوعیت کے داخلی انتشار کا شکار ہو گئی۔ لہٰذا اب اس کا برصغیر پر حملہ خارج از امکان ٹھہرا۔ نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر انگریزوں کا رویہ مزید سخت ہو گیا۔ اس اثناء میں انگریزوں اور مہاراجہ کے درمیان مراسلت ہوتی رہی۔ اس خط و کتاب میں انگریز اپنے مؤقف پر سختی سے ڈٹے رہے اور انہوں نے مہاراجہ کو دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ وہ ستلج کے بغیر کسی دوسری سرحد کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔

جب انگریزوں نے اپنے مطالبے پر مسلسل اصرار کیا اور مسلح تصادم کی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مناسب اقدامات کر لیے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے مؤقف پر ازسرِ نو غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر ستلج پار کی ریاستوں پر کمپنی کے تسلط کو تسلیم کر لے تو اس سے اس کا حقیقی مقصد ختم ہو کر رہ جائے گا، کیونکہ اس کا مقصد تو خالصہ پنتھ کا عظیم تر اتحاد تھا اور سکھوں کی بارہ مسلوں میں سے چھ مسلیں ستلج کے پار واقع تھیں۔ لیکن حالات نے اب جو رخ اختیار کیا تھا اس کی وجہ سے مہاراجہ کے لیے اپنے مطمعِ نظر میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی۔ کیونکہ تصادم کی صورت میں اس کی کامیابی کے امکانات مخدوش تھے۔ مہاراجہ کی حکومت ابھی اپنے ارتقاء کے بالکل ابتدائی مراحل میں تھی جب کہ اس کے مقابل

انگریز سرکار کی بنیادیں استوار ہوئے ایک مدت ہو چکی تھی اور وہ جدید ترین سیاسی نظریات کی روشنی میں اپنا نظامِ حکومت چلا رہی تھی۔ اس کی فوج بھی تعداد میں زیادہ ہونے کے علاوہ جدید ترین حربی آلات سے آراستہ تھی۔ جب کہ سکھ حکومت اور فوج پرانی روش کی حامل ہونے کی وجہ سے انگریزی حکومت اور فوج کی نسبت بہت کم استعداد رکھتی تھی۔

اب مہاراجہ نے اس پہلو پر غور کیا کہ اپنے موقف سے دستبردار ہونے میں اس کے نقصانات اور فوائد کا کیا تناسب ہوگا۔ اگر وہ دریائے ستلج تک انگریزوں کی عملداری تسلیم کر لے تو اسے ستلج پار کے اپنے مقبوضات سے دست کش ہونا پڑتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس میں اس کا فائدہ یہ تھا کہ انگریزوں کے ساتھ صلح کے بعد وہ مستقبل میں انگریزی مداخلت کے خطرے سے محفوظ ہو جاتا۔ جب اس کی یہ سرحد محفوظ ہو جاتی تو وہ باقی علاقوں کی طرف بھرپور توجہ دینے کے قابل ہو جاتا۔ یعنی صرف ایک سمت میں اس کی فتوحات کا سلسلہ بند ہوتا۔ لیکن پشاور، کانگڑہ، سوالک، جموں، کشمیر، ڈیرہ جات اور ملتان کے وسیع علاقے اس کے توسیع پسندانہ عزائم کی جولانگاہ بن سکتے تھے اور یہ کچھ ایسا خسارے کا سودا نہیں تھا۔ لیکن تصادم کی صورت میں مہاراجہ کی کامیابی غیر یقینی تھی اور اگر جنگ میں سکھوں کو شکست ہو جاتی تو ستلج پار کے ساتھ ساتھ ستلج اور ادھر کے علاقے میں بھی سکھ اقتدار کا برقرار رہنا مشکل ہو جاتا اور جس عظیم خالصہ سلطنت کے قیام کے لیے مہاراجہ کوشاں تھا اس کی ادھوری شکل بھی معرضِ خطر میں پڑ جاتی، چونکہ پنجاب کے وہ تمام والیانِ ریاست جنہیں مفتوح ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، مہاراجہ کی بجائے انگریزی حکومت کا ساتھ دیتے اور مہاراجہ کے لیے اس صورت سے کماحقہ عہدہ برآ ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ان تمام مضمرات کے عواقب پر غور کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے مشیروں کی رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ اسے پرامن بقائے باہمی کے اصول پر عمل کرتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ جنگ کی بجائے صلح کرنی چاہیے، کیونکہ اس طرح پنجاب کے متعدبہ حصے پر وہ بلا شرکتِ غیرے حکومت کر سکتا تھا۔

معاہدہ امرتسر:

اس دوران میں کلکتہ سے معاہدہ کا نیا مسودہ آ گیا۔ اس مسودے کا لب ولہجہ اور نفسِ مضمون بھی سابقہ مسودے سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ لیکن مہاراجہ نے اس عہدنامے کو قبول کر لیا۔ اس عہدنامے پر کمپنی کے نمائندے مسٹر مٹکاف اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 25 اپریل 1809ء کو امرتسر میں دستخط کیے۔ یہ معاہدہ تاریخ میں معاہدہ امرتسر کے نام سے مشہور ہے۔

اس معاہدے میں ایک دوسرے سے باہمی احترام، دوستی اور خیر سگالی کے تعلقات کی ضرورت پر زور دینے کے بعد کہا گیا تھا کہ:

1- سرکار انگریز دریائے ستلج کے شمالی علاقوں پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مکمل اختیار کو تسلیم کرتی ہے اور وہ مہاراجہ کی سلطنت کے کسی معاملے سے دلچسپی نہیں رکھے گی۔

2- مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ستلج پار کے جن علاقوں پر قبضہ کیا ہے انہیں خالی کر دے گا اور ان علاقوں میں وہ صرف اسی قدر فوج تعینات کرے گا جو مقامی انتظام کے لیے ضروری ہو گی اور آئندہ وہ ستلج پار کوئی فوجی کارروائی نہیں کرے گا۔

3- مندرجہ بالا شرائط میں سے کسی ایک پر عمل نہ کرنے کی صورت میں پورا عہدنامہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ یہ بھی قرار پایا کہ دونوں حکومتوں کے جانشین بھی اس معاہدے کی پابندی کریں گے۔

مسٹر مٹکاف نے مہاراجہ سے کہا کہ برطانوی روایات کے مطابق اب وہ اس معاہدے کو گورنر جنرل کے پاس توثیق کے لیے بھیجے گا اور جب کلکتہ سے منظوری مل جائے گی اس وقت یہ معاہدہ قابلِ نفاذ ہو گا۔ چنانچہ گورنر جنرل ان کونسل نے 30 مئی 1809ء کو اس معاہدے پر توثیقی دستخط کیے اور اس کے بعد اس معاہدے پر عمل درآمد شروع ہوا۔

معاہدہ امرتسر کے نتائج:

پنجاب کی تاریخ میں یہ معاہدہ بہت اہم ہے۔اس معاہدے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ بوجوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اپنا موقف چھوڑنا پڑا اور انگریزوں کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ الگ بات ہے اس معاہدے سے مہاراجہ کو کیا کیا فوائد حاصل ہوئے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ یہ معاہدہ برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے معرضِ وجود میں آیا اور اس میں مہاراجہ کا ذکر صرف توازن قائم رکھنے کے لیے ہی تھا۔اس معاہدے کا سکھوں پر نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ وہ ذہنی طور پر انگریزوں سے مرعوب ہو گئے۔ چنانچہ مستقبل میں سکھ انگریزوں کے مقابلے پر کوئی قابلِ ذکر مزاحمت نہ کر سکے۔

اس معاہدے کے بعد سکھوں اور انگریزوں کی حدود اختیار ایک دوسرے سے متصل ہو گئیں اور ان میں موجود فاصلہ ختم ہو گیا۔

اس معاہدے کی رو سے انگریز اقتدار کی سرحد دریائے جمنا سے دریائے ستلج تک آ پہنچی۔اس میں لطف کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کی سلطنت میں یہ اضافہ محض ان کی سفارتی اہلیت کی وجہ سے ہوا تھا اور اس کے لیے انہیں ایک گولی بھی نہیں چلانی پڑی تھی، جبکہ مہاراجہ قبل ازیں اس علاقے میں فوجی کارروائیوں پر اپنی خاصی مالی اور افرادی قوت صرف کر چکا تھا۔ نتیجتاً اسے تو کچھ بھی حاصل نہ ہوا اور انگریز بغیر کسی زحمت کے سب کچھ کے مالک بن گئے۔ مہاراجہ نے اس معاہدے کی عمر بھر پاسداری کی اور ستلج پار کو اپنے ذہن سے قطعاً خارج کر دیا۔

ستلج پار ریاستوں کے لیے اطلاع نامہ:

کمپنی نے کافی غور و خوض کے بعد فروری 1809ء میں ستلج پار کی ریاستوں کو تحفظ دینے کا باقاعدہ اعلان کیا تھا۔ معاہدہ امرتسر کی وجہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اس علاقے

سے دستبردار ہو چکا تھا۔ چنانچہ اب انگریز سرکار نے ان ریاستوں سے مستقبل میں اپنے تعلقات کی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے ایک دستاویز تیار کی اور تمام والیانِ ریاست کے ایک خصوصی اجتماع میں اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ اس دستاویز میں تمہیدی طور پر یہ بتایا گیا تھا کہ ستلج پار کی ریاستوں کے سربراہوں نے کئی بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ انگریز سرکار کے دامنِ دولت سے وابستہ ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انگریز سرکار نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس علاقے کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے اور یہاں اپنی فوج متعین کر دی ہیں۔ افواج بھیجنے کا مقصد ان ریاستوں کی سالمیت اور خودمختاری کا تحفظ ہے۔ 25 اپریل کو لاہور کا حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کمپنی کے ساتھ ایک معاہدے کی رو سے اس علاقے میں اپنا عمل دخل ختم کر چکا ہے۔ اس لیے اب یہ بات لازمی ہوگئی ہے کہ کمپنی اس علاقے کی ریاستوں کے ساتھ اپنے روابط کی وضاحت کر دے۔ اس ضمن میں کمپنی مندرجہ ذیل اعلان کرتی ہے:

1- انگریز سرکار مستقبل میں ستلج پار کی ریاستوں کو بیرونی جارحیت سے محفوظ رکھے گی۔ یعنی اس علاقے کی دفاعی ذمہ داریاں انگریز سرکار نے سنبھال لی ہیں۔
2- انگریز سرکار اس فرض کی انجام دہی کے معاوضے کے طور پر ان ریاستوں سے کسی قسم کے نقد یا جنس کا مطالبہ نہیں کرے گی۔
3- انگریز سرکار کے ساتھ وابستگی سے پہلے ان والیانِ ریاست کو جو حقوق و اختیارات حاصل تھے وہ آئندہ بھی بدستور رہیں گے اور ان میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔
4- فوجی ضروریات کے تحت جب انگریزی فوج کو ان ریاستوں سے گزرنا پڑے تو ہر رئیس نہ صرف انہیں گزرنے کی اجازت دے گا بلکہ مقدور بھر ان افواج کی مدد بھی کرے گا۔ یعنی ان کے لیے رسد اور رہائش وغیرہ کا بندوبست کرے گا۔
5- جب کوئی دشمن برطانوی سلطنت پر حملہ کرے تو یہ ریاستیں حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے اپنے تمام وسائل سے برطانوی حکومت کی حمایت کریں۔ ان ریاستوں کی فوجیں

برطانوی افواج کی کمان میں لڑیں گی۔

6- فوجی استعمال کے لیے اس علاقے سے گزرنے والے برطانوی مال پر محصول نہیں لیا جائے گا۔

7- انگریز سرکار کو اس علاقے سے بلا محصول گھوڑے خریدنے اور گزارنے کی اجازت ہوگی۔ گھوڑوں کی خرید اور ان کی نقل و حرکت کے لیے انگریز حکام کو مجاز پروانہ راہداری جاری کیا کریں گے۔

اس اعلان کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد ستلج پار ریاستوں سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تعلقات کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ ریاستیں ہمیشہ کے لیے مہاراجہ کی دسترس سے باہر نکل گئیں۔ لدھیانہ میں انگریزی افواج کے لیے چھاؤنی قائم کی گئی۔ کرنل ڈیوڈ کھتر لونی اس چھاؤنی کا سربراہ تھا۔ وہ مستقلاً لدھیانہ ہی میں رہنے لگا۔ اس واقعے کے بعد سکھ حکومت اور انگریزی حکومت کے مابین سفیروں کا تبادلہ ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے ایک معتمد بخشی نند سنگھ بھنڈاری کو لدھیانہ میں اپنا نمائندہ مقرر کیا، جبکہ انگریزی حکومت نے خوشوقت رائے کو اپنے سفیر کی حیثیت سے لاہور بھیجا۔ اس طرح انگریز سرکار اور مہاراجہ کے درمیان ستلج پار کی ریاستوں کے مسئلے پر جو کشیدگی پیدا ہوئی تھی وہ دور ہوگئی اور ان ریاستوں کا مستقبل انگریز سرکار سے وابستہ ہوگیا۔

خوشاب:

خوشاب اور ساہیوال کا علاقہ بلوچوں کے تصرف میں تھا۔ یہ لوگ بڑے جنگجو تھے۔ یہاں ان کے کئی قبیلوں نے خود مختار ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ انہوں نے اس علاقے میں جا بجا مضبوط قلعے بنا رکھے تھے۔ فروری 1810ء میں مہاراجہ اس علاقے کو فتح کرنے لگا۔ خوشاب کے حاکم جعفر خان بلوچ نے شہر سے باہر مزاحمت کی لیکن مہاراجہ کی فوج غالب آ گئی اور بلوچ سردار اپنے قلعے میں محصور ہونے پر مجبور ہوگیا۔ مہاراجہ نے پہلے شہر پر قبضہ کیا

اور پھر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ بلوچوں نے ڈٹ کر مزاحمت کی اور مہاراجہ کئی دن تک قلعہ فتح نہ کر سکا۔ کئی خونریز معرکے ہوئے جن میں طرفین کا بہت نقصان ہوا۔ جب قلعے پر قبضے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جعفر خان کو پیغام بھیجا کہ اگر تم ہتھیار ڈال دو تو گزارے کے لیے مناسب بندوبست کر دیا جائے گا۔ لیکن اس نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر مہاراجہ نے فیصلہ کن اقدام کا حکم دیا چنانچہ سکھ سپاہیوں نے قلعے کی دیواروں کے نیچے کافی گہری سرنگیں کھود کر ان میں بارود بھر دیا۔ لیکن اس خیال سے کہ بیکار انسانی جانوں کا ضیاع نہ ہو، مہاراجہ نے جعفر خان کو آخری بار انتباہ کیا کہ اب بھی اگر ہتھیار ڈال دو تو تمہاری اور تمہارے ہمراہیوں کی جان بچ جائے گی۔ لیکن انکار کی صورت میں انجام خوفناک ہوگا۔ اپنے کسی آدمی کو بھیج دو ہم اسے وہ انتظام دکھا دیں گے جو ہم نے قلعے کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے کے لیے کیا ہے۔ اس پر بلوچ سردار کے لیے شکست تسلیم کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ رہا۔ چنانچہ اس نے قلعہ خالی کر دیا۔ مہاراجہ نے اس کے ساتھ قابلِ قدر سلوک کیا اور گزر بسر کے لیے اسے معقول جاگیر دے دی۔

ساہیوال:

خوشاب فتح کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ساہیوال کا رخ کیا۔ یہاں کے حاکم فتح خان نے بھی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ فتح خان فوجی لحاظ سے بہت مضبوط تھا۔ اس کے پاس دس بارہ بڑے مستحکم قلعے تھے۔ مہاراجہ کی یلغار کی خبر سن کر اس نے اپنے قلعوں پر توپیں چڑھا دیں اور مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ 10 فروری 1810ء کو دونوں فوجوں میں بڑا سخت معرکہ ہوا۔ مہاراجہ کو فتح حاصل ہوئی اور قلعے پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن فتح خان نے شہر میں پاؤں جمانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ساہیوال کے شہریوں کا بھی کافی جانی نقصان ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ یہ معرکہ بھی جیت گیا۔ فتح خان اور اس کا لڑکا زندہ گرفتار کر لیے گئے۔ تقریباً سال بھر یہ باپ بیٹا کانگڑہ کے قلعے میں قید رہے۔ جنوری

1811ء میں مہاراجہ نے ان کو رہا کر کے گزر اوقات کے لیے مناسب جاگیر دے دی۔ فتح کے بعد اس علاقے کو مہاراجہ نے اپنی سلطنت کا باقاعدہ حصہ بنالیا۔

جموں:

جب مہاراجہ خوشاب کی جانب روانہ ہوا تو اس نے سردار حکما سنگھ کی قیادت میں ایک دستہ جموں کی تسخیر کے لیے بھیجا تھا۔ ان دنوں ریاست جموں اندرونی لحاظ سے بڑے غیر یقینی حالات سے گزر رہی تھی۔ لہٰذا مہاراجہ نے اس زریں موقعے کو کھونا مناسب خیال نہ کیا۔ ریاست جموں کے وزیراعظم میاں موٹا نے مقدور بھر مزاحمت کی لیکن شکست کھا گیا اور ریاست مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے قبضے میں آ گئی۔

وزیر آباد:

وزیر آباد کا حکمران سردار جودھ سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بڑا قریبی دوست اور حلیف تھا۔ اکثر معرکوں میں اس نے مہاراجہ کے لیے بیش قدر خدمات انجام دی تھیں۔ مہاراجہ بھی اس کی خدمات کا بہت معترف تھا۔ سردار جودھ سنگھ نومبر 1809ء میں فوت ہوا۔ اس کے مرنے پر مہاراجہ اظہارِ تعزیت کے لیے وزیر آباد گیا اور اس کے لڑکے گنڈا سنگھ کو خود دستار بندی کر کے جانشین بنایا۔ لیکن ساتھ ہی اس سے بڑی رقم بطور پیشکش بھی طلب کی۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑے رد و کد کے بعد چالیس ہزار پر فیصلہ ہوا۔ مگر اس کے بعد بھی گنڈا سنگھ کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اس کے رشتہ داروں نے اس کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں جب حالات گنڈا سنگھ کے قابو سے باہر ہو گئے تو مہاراجہ نے جون 1810ء میں گجرات میں اپنے نائب خلیفہ نور الدین کو حکم بھیجا کہ وزیر آباد پر قبضہ کر لے۔ چنانچہ اس نے وزیر آباد کا الحاق سلطنتِ لاہور سے کر دیا۔ مہاراجہ نے گنڈا سنگھ کے گزارے کے لیے مناسب بندوبست کر دیا۔

شاہِ شجاع آباد کی پنجاب میں آمد:

احمد شاہ ابدالی کے بعد کابل کو کوئی قابل بادشاہ نصیب نہ ہو سکا۔ احمد شاہ کے جانشین شاہ زمان نے پنجاب کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے کئی کوششیں کیں لیکن نہ صرف یہ کہ وہ برصغیر کی مہمات ہی میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ افغانستان میں بھی حکومت پر اس کی گرفت کمزور ہو گئی۔ شاہ زمان 1800ء میں فوت ہوا تو شاہ محمود برسرِ اقتدار آیا۔ لیکن وہ بھی سلطنت کا وقار بحال نہ کر سکا۔ 1803ء میں شاہِ شجاع آباد بادشاہ بنا۔ وہ قدرے بہتر حکمران ثابت ہوا۔ اس نے چھ سات برس حکومت کی۔ لیکن اپنے ہی ملک کے سازشی عناصر نے 1809ء میں اسے جنگ نیملا میں شکست دی اور تختِ کابل پر قبضہ کر لیا۔

شاہ شجاع آباد افغانستان سے نکل کر پنجاب کی جانب آیا۔ اس سے قبل اس کا بھائی شاہ زمان بھی تخت و تاج کھو کر پنجاب میں آ چکا تھا اور ان دنوں راولپنڈی میں مقیم تھا۔ راولپنڈی میں دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی اس کے بعد شجاع آباد مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔ ان دنوں مہاراجہ خوشاب کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ 2 فروری 1810ء کو مہاراجہ کو اطلاع دی گئی کہ شاہ شجاع آباد اس سے ملنے کے لیے آ رہا ہے 3 فروری کو دونوں کی خوشاب میں ملاقات ہوئی۔ مہاراجہ نے اسے شاہانہ طریقے سے خوش آمدید کہا اور اس سے بات چیت کی۔ ان کے یہ مذاکرات بالکل ابتدائی نوعیت کے تھے اور اس میں مہاراجہ نے شاہ شجاع آباد کو سلطنت حاصل کرنے کے لیے امداد دینے کی کوئی واضح یقین دہانی نہ کرائی۔ جس پر شاہ شجاع مایوس ہو کر کوئی اور ذریعہ تلاش کرنے لگا۔ اسی اثناء میں اسے کشمیر کے گورنر عطا محمد خان نے پیغام بھیجا کہ وہ اس کی مدد کے لیے تیار ہے۔ عطا محمد خان، شاہ شجاع کے ایک سابق وزیر اعظم کا لڑکا تھا۔ چنانچہ اس نے قدیم روابط کا لحاظ رکھتے ہوئے شاہ شجاع کو فوج فراہم کی اور شاہ شجاع نے پشاور فتح کر لیا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد افغانستان کے وزیر اعظم فتح خان نے اپنے بھائی محمد عظیم خان کو بھاری لشکر دے کر بھیجا جس

نے شجاع کو پشاور سے بھی مار بھگایا۔

شاہ شجاع پشاور سے پسپا ہو کر اٹک پہنچا جہاں اس کے دوست عطا محمد، (حاکمِ کشمیر) کا بھائی جہانداد خان حاکم تھا۔ لیکن اس دوران میں شاہ شجاع اور جہانداد خان کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ جہانداد خان نے بجائے شاہ شجاع کی مدد کرنے کے اسے قید کر کے اپنے بھائی کے پاس کشمیر روانہ کر دیا۔ جہاں وہ تقریباً ایک سال تک محبوس رہا اس عرصہ میں اس کے اہلِ خانہ اور اس کا نابینا بھائی شاہ زمان راولپنڈی میں مقیم رہے۔

ان دنوں مہاراجہ رنجیت سنگھ بعض مہمات میں مصروف تھا۔ ان سے فارغ ہو کر وہ شاہ زمان سے ملاقات کے لیے راولپنڈی گیا۔ شہر سے باہر مہاراجہ کے خیمے نصب کر دیے گئے اور یہیں شاہ زمان کو بلوایا گیا۔ شاہ زمان آیا تو مہاراجہ نے بڑی اچھی طرح سے اس کا استقبال کیا۔ شاہ زمان کے دو پرانے درباری دیوان بھوانی داس اور دیوان داس ان دنوں مہاراجہ کے پاس ملازم تھے۔ مہاراجہ نے ان دونوں کو شاہ زمان کی مہمانداری کے انتظامات پر متعین کیا، جنہوں نے شاہ زمان کی بیش از بیش خاطر داری کی۔ مہاراجہ نے اس کے گزارے کے لیے ماہانہ مقرر کیا اور لاہور میں اس کے مستقل قیام کا بندوبست کرنے کا وعدہ کیا۔

اس ملاقات کے بعد شاہ زمان اپنے خاندان کے ساتھ نومبر 1811ء میں لاہور آ گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ شہر میں اس کی رہائش کا انتظام کیا۔ اس کے کچھ دن بعد شاہ شجاع کے اہلِ خانہ بھی لاہور آ گئے۔

ادھر کابل میں شاہ شجاع کے بعد دوبارہ شاہ محمود تخت پر بیٹھا۔ س کے عہد میں بارک زئی قبیلے نے بڑی ترقی کی۔ بارک زئی سردار فتح خان اس کا وزیر اعظم تھا۔ اس وقت تک افغانستان کے اکثر صوبے آزاد ہو چکے تھے۔ چنانچہ فتح خان نے ان کو دوبارہ مطیع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس ضمن میں اس نے سب سے پہلے کشمیر پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس لیے مشکل یہ تھی کہ کشمیر جانے والے تمام راستے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضے میں تھے۔ لہٰذا اس کی

رضا مندی کے بغیر کشمیر کی مہم کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اس مقصد کے لیے فتح خان نے اپنے ایک معتبر شخص گوڈرمل کو مہاراجہ کے پاس بھیجا۔ وہ دسمبر 1801ء میں لاہور پہنچا۔ اس نے افغان حکومت کی طرف سے متعدد گراں بہا تحائف مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے بعد اس نے اپنی آمد کا یہ مقصد بتایا کہ افغان حکومت کی خواہش ہے کہ مہاراجہ کے تعاون سے کشمیر کو زیر نگیں کیا جائے۔ مہاراجہ نے اس منصوبے کو پسند کیا لیکن وقتی طور پر اپنی کسی مصروفیت کی بنا پر اسے ٹال دیا اور افغان نمائندہ واپس چلا گیا۔

دراصل مہاراجہ خود بھی کشمیر کو فتح کرنا چاہتا تھا اور اب تو اسے ایک بہادر فوج کی اعانت بھی حاصل ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس نے اس موقع سے مکمل فائدہ اٹھانا چاہا۔ کیونکہ اس رفاقت کی وجہ سے مہاراجہ کی فوج کا کچھ زیادہ نقصان بھی نہ ہوتا اور بعد میں جب مہاراجہ دوبارہ تنہا کشمیر کی مکمل فتح کے لیے جاتا تو سابقہ مہم کا تجربہ اس کی فوج کے بہت کام آتا۔ لہٰذا مہاراجہ نے اس بڑی اور فیصلہ کن مہم کے لیے ابھی سے پیشگی تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے مہاراجہ نے کشمیر کو جانے والے راستوں پر قبضہ مستحکم کرنا چاہا۔ چنانچہ اس نے ایک فوج راجکمار کھڑک سنگھ کی قیادت میں روانہ کی۔ بھمبر کے حاکم سلطان خان اور راجوڑی کے حاکم اکبر خان نے زبردست مزاحمت کی اور کھڑک سنگھ کی فوج کامیاب نہ ہو سکی۔ اس پر مہاراجہ نے دیوان محکم چند کو کمک دے کر بھیجا۔ دیوان نے جا کر یہ ریاستیں فتح کیں اور مہاراجہ کی سلطنت سے اس کا الحاق کر دیا۔

شاہ محمود اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کشمیر پر حملے کی خبر جب شاہ شجاع کے اہل خانہ کو ہوئی تو وہ بہت فکر مند ہوئی۔ کیونکہ انہیں شاہ محمود کی سفاکی کا حال معلوم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شاہ محمود قبل ازیں اپنے بڑے بھائی شاہ زمان کی آنکھیں نکلوا چکا ہے اور اگر اب اس نے شجاع پر قابو حاصل کر لیا تو اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا۔ چنانچہ شاہ شجاع کی ملکہ وفا بیگم نے فقیر عزیز الدین اور دیوان بھوانی داس کی معرفت مہاراجہ کو پیغام بھجوایا کہ اگر مہاراجہ شاہ شجاع کو کشمیر سے رہا کر لائے تو وہ مشہور ہیرا ''کوہ نور'' مہاراجہ کی خدمت میں پیش کرے

گی۔ مہاراجہ نے جواب میں وفا بیگم کو یقین دلایا کہ وہ شاہ شجاع کو آزاد کرانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ دراصل مہاراجہ کے دل میں کوہ نور ہیرے کے لیے شدید لالچ پیدا ہو چکا تھا اور ہر حال میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جب وزیر اعظم افغانستان کا نمائندہ واپس پہنچا تو اس نے اسے ساری کیفیت جا بتائی۔ اس کے بعد مہاراجہ اور افغان وزیر اعظم فتح خان میں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوا۔ بالآخر ان میں یہ بات طے پائی کہ کشمیر پر مشترکہ حملہ کیا جائے۔ چنانچہ فتح خان نومبر 1816ء میں کابل سے روانہ ہوا، اور دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب میں آگے بڑھنے لگا۔ ادھر سے مہاراجہ بھی اپنی تمام فوجی طاقت کو لے کر چل دیا۔ مہاراجہ دریائے جہلم کے دوسرے کنارے پر واقع رہتاس کے قلعے میں فروکش ہوا۔ اس اثناء میں فتح خان بھی وہاں پہنچ گیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے آیا۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورے کے بعد کشمیر پر متحدہ چڑھائی کی تفصیلات طے کیں۔ مہاراجہ نے تجویز پیش کی کہ مظفر آباد کی بجائے بھمبر کے راستے پیش قدمی کی جائے کیونکہ یہ راستہ دوسرے راستے کی نسبت بہت سہل ہے۔ فتح خان نے مہاراجہ کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ یہ راستہ اختیار کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مظفر آباد والا راستہ ان دنوں برفباری کے باعث تقریباً ناقابلِ عبور ہو چکا تھا۔

تمام انتظام مکمل کرنے کے بعد لشکر کی روانگی کا مرحلہ آیا۔ مہاراجہ نے بارہ ہزار منتخب سکھ فوجیوں کا دستہ اس مہم کے لیے بھیجا۔ دیوان محکم چند اس فوج کا کمانڈار تھا۔ اس کے ماتحت اور بھی کئی نامور سردار بھیجے گئے۔ ان میں سے سردار دل سنگھ اور سردار جیون سنگھ پنڈی والا قابلِ ذکر ہیں۔ جسروٹہ، بسوہلی اور نور پر کی پہاڑی ریاستوں کے سردار بھی اس فوج میں شامل تھے۔ افغان اور سکھ فوج نے یکم دسمبر 1812ء کو جہلم سے کشمیر کے لیے کوچ کیا۔ فوج کے جانے کے بعد مہاراجہ واپس لاہور آ گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پہنچنے کے بعد فقیر عزیز الدین اور دیوان بھوانی داس کے

ذریعے شاہ شجاع کی ملکہ وفا بیگم کو پیغام بھیجا کہ اس نے سکھ سرداروں کو اچھی طرح تاکید کر دی ہے کہ وہ ہر صورت میں شاہ شجاع کو حاصل کریں اور سلامتی کے ساتھ لاہور پہنچا دیں۔ وفا بیگم نے اپنے خاص معتمدین میر ابوالحسن، ملا جعفر اور قاضی شیر محمد کی وساطت سے جوابی پیغام میں مہاراجہ کی کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے وعدے کا اعادہ کیا، کہ شاہ شجاع کی آمد پر کوہ نور ہیرا بلا تاخیر مہاراجہ کے سپرد کر دیا جائے گا۔

ادھر دونوں فوجیں نہایت سرعت کے ساتھ کشمیر میں پیش قدمی کر رہی تھیں۔ افغان فوج جو پہاڑی علاقوں میں سفر کی عادی تھی، سکھ فوج سے خاصی آگے نکل گئی اور سکھ فوج پیچھے رہ گئی اور یہ دیوان محکم چند کے وقار کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ اس نے چند ایک مقامی راجوں کو جاگیروں کا لالچ دے کر ساتھ ملایا اور انہیں کہا کہ کوئی ایسا قریبی راستہ بتاؤ جس سے ہم بھی افغان فوج کے ساتھ ہی منزل پر پہنچ سکیں۔ چنانچہ ان لوگوں کی راہبری کی وجہ سے سکھ فوج، افغان فوج سے پہلے ہی وادیٔ کشمیر میں داخل ہوگئی۔

ادھر جب کشمیر کے حاکم عطا محمد خان کو افغان سکھ یلغار کی اطلاع ملی تو اس نے بھی اپنی بساط کے مطابق اپنے دفاع کا انتظام کر لیا۔ اس نے شیر گڑھ کے قلعے میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیر گڑھ کا قلعہ بڑے دشوار گزار پہاڑی سلسلے میں واقع تھا۔ عطا محمد نے کچھ مزید تبدیلیاں کر کے اسے اور بھی مستحکم بنا دیا۔ علاوہ ازیں اس نے ارد گرد پہاڑی راستوں اور درّوں کو پتھروں اور درختوں سے بند کر دیا۔ اس طرح قلعے تک رسائی ہی تقریباً ناممکن ہوگئی لیکن سکھ اور افغان فوج نے ان دشواریوں کے باوجود تمام رکاوٹیں عبور کر کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ کئی دن تک محاصرہ جاری رہا۔ کشمیر فوج نے قابلِ داد مذمت کی لیکن مخالف فوج کی عددی برتری کی وجہ سے وہ شکست کھا گئی اور سکھ اور افغان سپاہیوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ دیوان محکم چند نے اپنے سپاہیوں کو شاہ شجاع کی بحفاظت بازیابی کا حکم دے رکھا تھا چنانچہ سکھ سرداروں نے قلعے پر قبضے کے بعد سب سے پہلے شاہ شجاع کو تلاش کیا۔ وہ قید خانے کے ایک حصے میں زنجیروں میں جکڑا ہوا مل گیا۔ فوراً اس کو زنجیروں سے آزاد

کر کے دیوان محکم چند کے پاس پہنچا دیا گیا دیوان نے شاہ شجاع کو اپنے کیمپ کے محفوظ ترین حصے میں ٹھہرایا اور اس کی حفاظت کے لیے زبردست پہرے کا بندوبست کیا۔

اسی اثناء میں افغان سرداروں نے بھی قلعے میں شاہ شجاع کو تلاش کیا لیکن وہ انہیں نہ مل سکا کیونکہ اسے تو پہلے ہی فوجی نکال کر لے گئے تھے۔ اس پر افغان فوج کے سرداروں کو شاہ شجاع کے بارے میں تشویش ہوئی اور وہ اس کے لیے سرگرداں ہوئے، لیکن تھوڑی دیر ہی بعد انہیں معلوم ہوا کہ شاہ شجاع تو دیوان محکم چند کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اس پر افغان وزیراعظم فتح محمد خان نے دیوان محکم چند کو کہا کہ شاہ شجاع کو میرے حوالے کر دیا جائے، لیکن دیون محکم چند نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ اس مسئلے پر فتح خان اور دیوان محکم چند کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی اور ان میں ایک دوسرے سے مزید تعاون کا امکان ختم ہو گیا۔ جب صورتحال یہ ہوئی تو دیوان محکم چند اپنی فوج شاہ شجاع اور مالِ غنیمت کو لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ وزیرآباد پہنچ کر اس نے خط کے ذریعے مہاراجہ کو تمام کیفیت سے آگاہ کیا اور دو دن بعد خود لاہور پہنچا۔ مہاراجہ نے شاہ شجاع کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور اس کی رہائش کے لیے اندرون اکبری دروازہ میں واقع مشہور مبارک حویلی میں انتظام کیا۔

جب شاہ شجاع کو لاہور آئے چند دن گزر گئے اور سفر کی کوفت دور ہو گئی تو مہاراجہ نے اس سے کوہ نور کے لیے تقاضا کیا۔ لیکن اتنی قیمتی چیز کو اپنے ہاتھوں سے کسی کو دینا ہر کسی کے لیے بہت مشکل اور امتحانی مرحلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ شجاع نے بھی لیت و لعل سے کام لیا۔ اس پر مہاراجہ نے بھائی رام سنگھ اور فقیر عزیزالدین کے ذریعے سختی سے مطالبہ کیا۔ جس کے جواب میں شاہ شجاع کی ملکہ وفا بیگم نے مہاراجہ کو کہا کوہ نور اس وقت ہمارے پاس نہیں ہے میں نے وہ ہیرا چھ کروڑ کے عوض قندھار کے ایک تاجر کے پاس رہن رکھا ہوا ہے اور یہ رقم شاہ نے اپنے تخت و تاج حاصل کرنے پر صرف کر دی ہے۔ مہاراجہ نے اسے عذر لنگ قرار دیا اور دھمکی دی کہ وہ بہر حال کوہ نور چاہتا ہے اور اگر یہ ہیرا حاصل کرنے کے لیے اسے کوئی

انتہائی قدم بھی اٹھانا پڑا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس نے کوتوال شہر شادی خان کو حکم دیا کہ فوراً مبارک حویلی پر سخت پہرہ بٹھا دیا جائے۔ کوئی شخص نہ تو حویلی میں داخل ہو اور نہ ہی حویلی سے باہر جانے پائے۔ علاوہ ازیں شاہ شجاع کو نفسیاتی قسم کی بدترین اذیتیں پہنچائی گئیں۔ جن کے باعث اس نے وعدہ کیا کہ وہ پچاس دن کے اندر کوہ نور مہاراجہ حوالے کر دے گا۔ چنانچہ جب یہ مدت ختم ہوئی تو مہاراجہ نے چند سرداروں اور ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ مبارک حویلی گیا۔ شاہ شجاع نے اس کا استقبال کیا اور بادل نخواستہ کوہِ نور مہاراجہ کے حوالے کر دیا۔

جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے کوہ نور چھین لیا تو شاہ کے دل میں مہاراجہ کے خلوص کے بارے میں جو تصور قائم تھا وہ یک لخت ختم ہو گیا۔ اب اس نے سوچا کہ مہاراجہ اسے صرف اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے ہی امداد دے گا۔ چنانچہ اس نے لاہور میں مزید ٹھہرنا مفید خیال نہ کرتے ہوئے یہاں سے چلے جانے کا ارادہ کیا۔ نومبر 1814ء میں ایک دن موقع پا کر شاہ شجاع کے اہلِ خانہ لاہور سے نکل گئے اور دریائے ستلج عبور کر کے انگریزوں کے پاس پناہ گزین ہو گئے۔ جب مہاراجہ کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت غضب ناک ہوا اور اس نے اپنے افسروں کو سخت حکم دیا کہ اب شاہ شجاع فرار نہ ہو پائے۔

شاہ شجاع کے مکان پر کڑا پہرہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن یہ تمام اہتمام بے کار ثابت ہوا اور اپریل 1815ء میں شاہ شجاع بھیس بدل کر مہاراجہ کے پنجۂ استبداد سے نکل گیا اور انگریزی حکومت سے سیاسی پناہ طلب کی اور ان کے وظیفے پر زندگی گزارنے لگا۔ انگریزوں نے اسے اپنی سلطنت حاصل کرنے کے لیے کئی بار فوج مہیا کی لیکن وہ ہر بار شکست کھا گیا۔ اس نے نہ صرف کابل بلکہ کشمیر پشاور حتیٰ کہ سندھ پر بھی قسمت آزمائی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر 1839ء میں شاہ شجاع انگریزوں کی مدد سے کابل پر قابض ہو گیا۔ لیکن صرف ایک ہی سال بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس کی پر آشوب زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

قلعہ ہائے کوچک کا خاتمہ:

مہاراجہ رنجیت سنگھ سے پہلے سرزمین پنجاب ایک طویل مدت تک بحرانی کیفیت سے دوچار رہی تھی۔ مغلوں کے بعد یہاں کسی کو استقلال نصیب نہ ہوا۔ جس کا جہاں بس چلتا اپنا اقتدار قائم کر لیتا۔ کوئی مرکزی انتظامیہ نہ تھی۔ ان دنوں ایک تو جا بجا سکھ مسلیں قائم ہو گئیں، دوسرے ان کے علاوہ بھی متعدد چھوٹے چھوٹے سرداروں نے جگہ جگہ اپنی ریاستیں بنا لیں۔

علاوہ ازیں پنجاب چونکہ کافی عرصے تک بدامنی کا شکار رہا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے آئے دن کا معمول تھے۔ احمد شاہ واپس جاتا تو سکھ کمین گاہوں سے نکل آتے اور قتل و غارت کرتے اس بدامنی کی بدولت پورا پنجاب چھوٹی چھوٹی خودمختار انتظامی اکائیوں میں منقسم تھا۔

جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر کے آس پاس کے علاقوں میں اپنا نظامِ حکومت قائم کرنا چاہا تو یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس کے عزائم کی راہ میں شدید رکاوٹ بنیں۔ جب مہاراجہ لاہور کے قرب و جوار کے علاقے فتح کر چکا تو اس نے چھوٹی قلعہ بندیوں کی طرف توجہ دی اور اپنے مختلف سرداروں کے ماتحت لشکر بھیجے تاکہ ہنگامی ضروریات کے تحت تعمیر کئے گئے ان قلعوں کو مسمار کر دیا جائے۔ ان مہمات میں ضلع شاہ پور، بھیرہ، خوشاب اور گجرات کے گردونواح میں موجود بہت سے قلعے زمین بوس کر دیئے گئے۔ ڈسکہ، منڈی، سکیت اور کسک کے سرداروں کو بھی لاہور کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کیا گیا اور ان مقامات پر مہاراجہ نے اپنے تھانے قائم کر دیئے۔ ان میں سے کسک کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور یہاں کے لوگ بہت جنگجو تھے۔ یہ قلعہ کھیوڑہ کی نمک کی کان کے قریب ہی ایک پہاڑی پر بنا ہوا تھا۔ مہاراجہ نے اس قلعے کو فتح کرنے کے لیے کئی زوردار حملے کئے، لیکن کامیاب نہ ہو سکا بالآخر اس نے قلعے میں جانے والی پانی کی نہر کو کاٹ دیا۔ اہلِ قلعہ پیاس

کی شدت کے باعث مغلوب ہو گئے اور قلعے پر مہاراجہ نے قبضہ کر لیا۔ مہاراجہ نے حسب وعدہ یہاں کے حکمران کو گزارے کے لیے کچھ جاگیر دے دی اور اسی جگہ اپنا تھانہ بنا دیا۔

اس کے بعد مہاراجہ قلعہ منگلا کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ قلعہ بھی بہت مستحکم تھا اور دریائے جہلم کے کنارے واقع تھا۔ اس کے قلعے کے آثار اب تک باقی ہیں۔ مہاراجہ کی فوج کو یہ قلعہ فتح کرنے میں خاصی دقت پیش آئی۔ لیکن بالآخر یہ فتح ہو گیا۔ یہاں بھی مہاراجہ نے اپنی چوکی بنا دی۔ اس قلعے کی فتح کے بعد تمام پہاڑی علاقہ مہاراجہ کے زیرِ تسلط آ گیا۔

سکھ مسلوں سے رنجیت سنگھ کا سلوک:

مہاراجہ راجیت سنگھ ایک ایسا حکمران تھا جو قدرت کی طرف سے بے شمار صلاحیتوں سے بہرہ مند تھا۔ باپ کے بعد اسے بہت معمولی قسم کا ترکہ ملا۔ لیکن اس نے اپنی فطری استعداد کے بل بوتے پر جلد ہی لاہور جیسے مرکزی شہر پر قبضہ کر لیا۔ وہ شروع ہی سے پورے پنجاب پر حکمرانی کا عزم رکھتا تھا۔ لاہور پر قبضے کے بعد اس کے اس جذبے کو مزید انگیخت ہوئی اور اس نے ہر لمحے انہی خطوط پر سوچا اور عمل کیا کہ بالآخر اسے پنجاب میں ایک عظیم تر سکھ ریاست قائم کرنی ہے۔ اسی کو اس نے اپنا مقصدِ حیات بنایا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جہاں صورتِ حال طاقت کے استعمال کی متقاضی تھی وہاں بلا پس و پیش طاقت استعمال کی اور جہاں صورت مختلف تھی وہاں اپنی مخصوص حکمتِ عملی سے کام نکالا۔

لاہور پر قبضے سے پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گوجرانوالہ میں اپنے آپ کو مستحکم کیا اور آس پاس کے علاقے فتح کیے۔ اس سے قبل رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ، رام گڑھیہ مسل کی مدد سے کنھیا مسل کو شکست دے چکا تھا۔ یہ واقعہ رنجیت سنگھ کی سیاسی زندگی میں بہت اہم ہے۔ اس واقعے کے بعد رنجیت سنگھ اور کنھیا مسل نے ایک دوسرے کی ضرورت محسوس کی اور مستقبل میں ایک دوسرے سے ٹھوس تعاون کرنے کا عہد کیا اور اسی تعاون کا نتیجہ لاہور پر

رنجیت سنگھ کے قبضے کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کنھیا مسل کے تعاون ہی سے رنجیت سنگھ لاہور کا حاکم بن سکا۔

رنجیت سنگھ اعلیٰ درجے کی سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک تھا۔ اس نے کنھیا مسل کے بعد نکئی مسل سے تعلقات بڑھائے۔ ان سے رشتہ داری استوار کی اور ان کے تعاون سے بہت سی مہمات سر کیں۔

یہ حقیقت بھی تاریخ کے اوراق میں موجود ہے کہ کنھیا اور نکئی مسلوں سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تعلقات محض خود غرضی کی بنیاد پر قائم تھے۔ اس نے اس وقت تک ان سے تعلقات قائم رکھے جب تک اسے ان کی ضرورت تھی۔ جب اس کا مشکل وقت گزر گیا تو اس نے ان مسلوں کو اپنی سلطنت میں ضم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ رنجیت سنگھ کی سب سے بڑی محسنہ رانی سدا کور کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ یہی سلوک اس نے نکئی مسل سے بھی کیا تھا۔

کنھیا اور نکئی مسلوں سے قریبی تعلقات قائم کرنے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی ایک طاقتور مسل اہلووالیہ کے سردار فتح سنگھ سے رشتۂ اخوت قائم کیا۔ مہاراجہ اور سردار فتح سنگھ نے گرنتھ صاحب کو گواہ بنا کر ایک دوسرے سے پرخلوص تعاون کا عہد کیا۔ انہوں نے آپس میں دستاریں بھی تبدیل کیں۔ ایک دوسرے سے پگڑیاں تبدیل کرنا، مخلصانہ دوستی کی اہم ترین علامت سمجھی جاتی ہے۔ سردار فتح سنگھ اہلووالیہ نے اس عزم کو عمر بھر نبھایا اور ہر مہم میں مہاراجہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ مہاراجہ بھی اس کا بہت احترام کرتا تھا۔

حاصلِ کلام یہ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب کی تین اہم مسلوں کو سیاست سے اپنے ساتھ ملایا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ان کے تمام وسائل کو مکمل طور پر استعمال کیا۔ مہاراجہ اپنی حدود کو وسیع کرنے کے لیے حتی الوسع حکمت عملی سے کام لیتا اور طاقت کے استعمال سے گریز کرتا، لیکن جہاں طاقت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا وہاں بلاتاخیر مسلح کارروائی کرتا۔ مہاراجہ نے ساری عمر اس طریق کار پر نہایت کامیابی سے عمل کیا اور اس کے

نتائج واضح طور پر مہاراجہ کے حق میں برآمد ہوئے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ جب وہ کسی مسل دار یا سردار کے علاقے کو زیر نگیں کرتا تو اس کے گزارے کے لیے معقول بندوبست کر دیتا اور اس کی فوج کو اپنی فوج میں شامل کر لیتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ شکست خوردہ سردار احساسِ محرومی کا شکار نہ ہوتے اور حالات سے مصالحت کر لیتے۔ اور اگر انہیں کچھ نہ دیا جاتا تو وہ مہاراجہ کے خلاف سازشیں کرتے، جو خواہ مخواہ کی سردردی کا باعث ہوتے۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کر کے مہاراجہ دوہرا مفاد حاصل کرتا۔ یعنی ایک تو ان سے علاقہ چھین لیتا اور دوسرے اُنہیں کچھ دے دلا کر اپنا ممنون بنا لیتا۔ ان سرداروں نے مہاراجہ کے لیے کافی خدمات انجام دیں۔ اسی طرح مہاراجہ ان سرداروں کی فوج کو منتشر کرنے کی بجائے اپنے پاس ملازم رکھ لیتا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ مہاراجہ کو تربیت یافتہ سپاہی مل جاتے۔ اگر مہاراجہ ان کو اپنے پاس جگہ نہ دیتا تو اس سے کئی قباحتیں جنم لیتیں۔ یا تو یہ لوگ جو پیشہ ور فوجی ہوتے تھے۔ بے کاری کی صورت میں عوام کے ذہنوں پر مہاراجہ کے کسی مخالف کے پاس ملازم ہو جاتے اور بعد میں انتقامی جذبے کے تحت مہاراجہ سے لڑتے اور مہاراجہ کے لیے زبردست پریشانی پیدا کرتے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد فوراً ہی سکھ مسلوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں بھنگی مسل سب سے زیادہ طاقتور سمجھی جاتی تھی۔ اس کے مقبوضات باقی مسلوں سے بہت زیادہ تھے۔ پنجاب کے دو اہم شہر یعنی امرتسر اور لاہور انہی کے تصرف میں تھے۔ اس مسل کی لڑاکا قوت بھی دوسری مسلوں پر بھاری تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور اسی مسل کے سرداروں سے چھینا تھا۔ جب لاہور پر مہاراجہ کا قبضہ ہو گیا تو امرتسر کے بھنگی سردار نے بعض دوسرے سرداروں کو ساتھ ملا کر مہاراجہ پر حملہ کیا، لیکن بھسین کے مقام پر ان کے لشکر تقریباً دو ماہ بے کار پڑے رہے اور بالآخر ان میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ بغیر لڑے واپس چلے گئے۔ اس واقعے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے

گجرات کے بھنگی حکمران، صاحب سنگھ کو زیر کیا، لیکن اس کا علاقہ ادائیگی خراج کے وعدے پر اسے دوبارہ بخش دیا۔

1805ء میں مہاراجہ نے امرتسر کو بھی فتح کر لیا۔ امرتسر کی فتح کے بعد بھنگی مسل کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کا تمام علاقہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ 1810ء میں مہاراجہ نے بھنگی مسل کے اہم گڑھ گجرات کا بھی اپنی سلطنت سے الحاق کر لیا۔ اس طرح پنجاب سے بھنگی مسل کا خاتمہ ہو گیا۔

1807ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ ریاست پٹیالہ کے مصالحتی مشن سے واپس آتے ہوئے، جالندھر میں ٹھہرا ہوا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ اس کا دوست سردار تارا سنگھ گھیبا مر گیا ہے۔ سردار تارا سنگھ گھیبا ڈلی والی مسل کا سربراہ تھا اور مہاراجہ کا حلیف تھا۔ اس کی مسل کی سالانہ آمدنی تقریباً سات لاکھ تھی۔ مہاراجہ یہ خبر ملنے پر اس کی تعزیت کے لیے گیا۔ مہاراجہ نے سردار تارا سنگھ کے لواحقین کے گزارے کے لیے مناسب انتظام کر دیا اور مسل کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرحوم سردار تارا سنگھ کی بیوہ نے مہاراجہ کے خلاف مزاحمت کی تھی اور راہوں کے مقام پر ان میں معمولی جھڑپ بھی ہوئی۔ لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور مہاراجہ نے مسل پر قبضہ کر لیا۔ اس سے راہوں، نکودر اور نوشہرہ وغیرہ کا علاقہ مہاراجہ کے ماتحت آ گیا۔

1809ء کے آخر میں ہریانہ کا حکمران سردار بگھیل سنگھ اہلووالیہ فوت ہو گیا۔ مہاراجہ نے اس کے پس ماندگان کو جاگیر دے کر یہ تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

اب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فضیل پوریہ مسل کی طرف توجہ کی۔ اس مسل کا علاقہ دریائے ستلج کے دونوں طرف تھا۔ ستلج پار تو مہاراجہ کا بس نہیں چلتا تھا، لہٰذا اس نے دریا کے اس طرف کے علاقے کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے گفتگو کے ذریعے کام نکالنا چاہا، لیکن اس مسل کا سربراہ سردار بدھ سنگھ بڑا دلیر انسان تھا۔ اس نے مہاراجہ کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مہاراجہ نے اپنے سپہ سالار دیوان محکم چند کو سردار بدھ سنگھ پر

حملے کا حکم دیا۔ جالندھر اس مسل کا اہم شہر تھا۔ دیوان محکم چند نے بہت سی فوجی قوت سے جالندھر کا محاصرہ کر لیا۔ سردار بدھ سنگھ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکا اور بھاگ کر ستلج پار انگریزوں کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔ لیکن اس کی فوج نے اس کے فرار کے بعد بھی مقابلہ جاری رکھا۔ آخر وہ بھی شکست کھا گئی۔ دیوان محکم چند نے جالندھر پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثناء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک دوسرے جرنیل غوثے خان نے سردار بدھ کے ایک دوسرے مضبوط قلعے کو فتح کر لیا۔ یہ قلعہ ترن تارن کے قریب پٹی کے مقام پر واقع تھا۔ ان کارروائیوں کی وجہ سے ستلج کی اس جانب واقع فضیل پوریہ مسل کے تمام مقبوضات سلطنتِ لاہور کا حصہ بن گئے۔ فضیل پوریہ مسل کی سالانہ آمدنی تقریباً تین لاکھ روپے تھی۔ مہاراجہ کو اس مسل کے قلعوں سے بھی بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔

فضیل پوریہ مسل پر مہاراجہ نے ستمبر 1811ء میں قبضہ کیا تھا۔

فضیل پوریہ مسل کے بعد نکئی مسل کی باری آئی۔ مہاراجہ کی دوسری شادی اسی مسل میں ہوئی تھی۔ مہاراجہ کا بڑا لڑکا کھڑک سنگھ اسی مسل کا نواسہ تھا۔ جب یہ شہزادہ کچھ بڑا ہوا تو مہاراجہ نے نکئی مسل کے تمام علاقے پر اسے حاکم بنا دیا اور اسے دیوان محکم چند کی معیت میں فوج دے کر بھیجا تاکہ وہ اس علاقے پر قبضہ کر سکے۔ اس وقت مہاراجہ کی رانی جے کور نکئی کا بھائی گیان سنگھ جو نکئی مسل کا سردار تھا، فوت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا دوسرا بھائی سردار کاہن سنگھ مسل کا سربراہ تھا۔ جس زمانے میں مہاراجہ نے نکئی مسل پر فوج کشی کی، سردار کاہن سنگھ مہاراجہ کی طرف سے ملتان کے حکمران نواب مظفر خان سے سالانہ خراج وصول کرنے گیا ہوا تھا۔ اس مسل کا صدر مقام چونیاں تھا۔ جب چونیاں میں سردار کاہن سنگھ کے دیوان حاکم رائے کو دربار لاہور کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی تو وہ بہت گھبرایا اور بھاگا بھاگا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس لاہور آ پہنچا اور عرض کی کہ سردار کاہن سنگھ کی عدم موجودگی میں اس قسم کی کارروائی کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ لیکن مہاراجہ نے اس کی عرضداشت محض ہنسی میں نظر انداز کر دی اور کہا کہ کھڑک سنگھ نکئیوں کا نواسہ ہے وہ جانے اور اس کا کام۔

مجھے تو اس معاملے میں کوئی دخل نہیں۔

چنانچہ شہزادہ کھڑک سنگھ نے پیش قدمی جاری رکھی اور نکئی مسل کے تمام اہم قلعوں پر قبضہ کرلیا جن میں چونیاں، دیپالپور اور ستگھرہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ جب سردار کاہن سنگھ کو ملتان میں یہ خبر پہنچی تو وہ فوراً واپس آیا، لیکن وہ بھی اپنی سرداری کے تحفظ کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ مہاراجہ نے اسے پرگنہ بھڑوال میں بیس ہزار سالانہ آمدنی کی جاگیر بخش دی، جہاں اس نے باقی عمر گزاری۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نکئی مسل کا الحاق اپنی سلطنت سے کر کے اس کے اہم شہروں میں اپنے تھانے قائم کر دیئے۔ اس مسل کی سالانہ آمدنی تقریباً نو لاکھ تھی۔ یہ مسل چونیاں، ستگھرہ، کوٹ کمالیہ، گوگیرہ، دیپالپور اور شرقپور کے قصبوں پر مشتمل تھی جو سارے کے سارے مہاراجہ کی سلطنت کا حصہ بن گئے۔

اب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کنھیا مسل کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ کیا۔ سردار جے سنگھ کی وفات کے بعد کنھیا مسل کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ بڑا حصہ مہاراجہ کی ساس رانی سدا کور کے تصرف میں آ گیا جبکہ مکیریاں کے گردونواح کا علاقہ سردار جے سنگھ کے دوسرے لڑکوں بھگت سنگھ اور ندھان سنگھ کو ملا۔ اس حصے کی آمدنی کچھ زیادہ نہ تھی اور بھگت سنگھ اور ندھان سنگھ اپنی والدہ رانی راج کور کے ساتھ وہاں محض گزارہ ہی کر رہے تھے۔ رانی سدا کور کا علاقہ تو بالواسطہ طور پر مہاراجہ ہی کے اختیار میں تھا اور وہ اس کے وسائل اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن دوسرا حصہ مہاراجہ کی دسترس سے باہر تھا۔ دسمبر 1811ء میں مہاراجہ کسی وجہ سے سردار ندھان سنگھ سے ناراض ہو گیا۔ اسے لاہور بلا کر قید کر دیا اور فوج بھیج کر اس کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ بعد میں اس کی والدہ اور دیگر اہلِ خاندان کے لئے گزارے کا بندوبست کر دیا۔ سردار ندھان سنگھ کا علاقہ دریائے بیاس کی دوسری سمت تھا اور اس میں حاجی پور اور سوہیاں کے قلعے تھے۔

رام گڑھیا مسل کا مسلدار سردار جودھ سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حلیف تھا۔ اس نے

مہاراجہ کے لیے کئی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ مہاراجہ بھی اس کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ مہاراجہ نے تمام سرداروں اور مسلداروں کے خلاف فوج کشی کی لیکن سردار جودھ سنگھ کو کبھی کچھ نہ کہا اور ہمیشہ اس کی علاقائی حدود کا احترام کرتا رہا۔ 1815ء میں سردار جودھ سنگھ مر گیا تو اس کے وارثوں میں سرداری کے لیے جھگڑے شروع ہو گئے۔ جب معاملہ بہت بڑھ گیا اور کسی طور طے نہ ہوا تو مہاراجہ نے سرداری کے دعویدار تمام افراد کو لاہور بلا کر نظر بند کر دیا۔ ان نظر بندوں میں دیوان سنگھ، ویر سنگھ اور کرم سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بعد مہاراجہ نے فوج بھیج کر رام گڑھیہ مسل کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس مسل کے پاس تقریباً ایک سو قلعے تھے اور اس کی سالانہ آمدنی چار لاکھ روپیہ تھی۔ مہاراجا نے مسل پر قبضہ کرنے کے بعد سردار جودھ سنگھ کے پس ماندگان کو تیس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر گزر بسر کے لیے دے دی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ 1821ء تک تمام مسلوں کو ختم کر چکا تھا۔ سارے سردار اس کے ماتحت آ چکے تھے۔ پورے پنجاب میں اس کی مکمل عملداری قائم ہو چکی تھی۔ صرف کنھیا مسل اب تک اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس مسل کی قیادت رانی سدا کور کے ہاتھ میں تھی جس نے ہر آڑے وقت میں مہاراجہ کی مدد کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ رانی سدا کور، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے ترقی کا زینہ ثابت ہوئی اور اسی کے تعاون کے باعث مہاراجہ بہت کم وقت میں پنجاب کے مطلق العنان فرمانروا کا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے رانی سدا کور اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باہمی تعلقات انتہائی خوشگوار تھے۔ مہاراجہ کو جب بھی رانی کی کسی امداد کی ضرورت درپیش ہوئی، رانی نے بلا پس و پیش مہاراجہ کو امداد فراہم کر دی۔ ان حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے مہاراجہ نے بھی رانی کے علاقے کی طرف طمع کی نظر نہ ڈالی۔

لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ فطرتاً خود غرض اور حریص واقع ہوا تھا۔ 1821ء میں اس نے رانی سدا کور سے کہا کہ اب تمہارے نواسے یعنی شیر سنگھ اور کھڑک سنگھ بڑے ہو گئے ہیں،

انہیں اپنے علاقے میں سے معتد بہ حصہ بطور تحفہ دے دو۔ رانی نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور اشارۃً کہلا بھیجا کہ اگر مہاراجہ نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو وہ انگریزوں کو اپنی مدد کے لیے بلا لے گی۔

اب مہاراجہ کی کوشش یہ تھی کہ ایسی صورت پیدا نہ ہو۔ چنانچہ اس نے رانی کو نہایت مصالحانہ لہجے میں خطوط لکھے اور اس واقعے کو بھول جانے کی درخواست کی۔ جب مہاراجہ نے محسوس کیا کہ رانی سدا کور کا دل اس کی جانب سے صاف ہو گیا ہے تو پھر اسے لاہور آنے کی دعوت دی۔ رانی صاف دلی سے کام لیتے ہوئے اکتوبر 1821ء میں لاہور آ گئی۔ جب رانی لاہور پہنچی تو مہاراجہ نے اسے قید کر دیا اور ستلج کے اس طرف واقع اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ رانی سدا کور کا کچھ علاقہ ستلج پار بھی تھا۔ جو 1809ء کے معاہدے کے تحت انگریزوں کی حدود اختیار میں آ چکا تھا۔ اس لیے مہاراجہ اس علاقے سے محروم ہی رہا۔

رانی سدا کور نے ایک دفعہ قید سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی لیکن قبل اس کے کہ وہ ستلج پار کرتی' مہاراجہ کو اطلاع ہو گئی اور اس نے اپنے آدمی دوڑا کر اسے دوبارہ قید کر لیا۔ اس کے بعد رانی ہمیشہ قید رہی اور قید ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ رانی سدا کور کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سلوک اس کے محسن کش ہونے کی واضح دلیل ہے۔

کنھیا مسل کے خاتمے کے بعد پنجاب مکمل طور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیر نگیں آ گیا۔ اور اب پورے پنجاب کے واحد حاکم کی حیثیت سے اس کا کردار شروع ہوا۔

اٹک کے قلعے پر مہاراجہ کا قبضہ:

دریائے سندھ کے کنارے پر واقع اٹک کا قلعہ اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔ شمالی سرحدوں سے آنے والے حملہ آوروں کے خلاف یہاں سے بڑی مؤثر مزاحمت کی جا سکتی تھی۔ اپنی اس اہمیت کے پیش نظر اس قلعہ کو برصغیر کا

شمالی دروازہ کہا جاتا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ مدت سے اس قلعے کو فتح کرنے کا خواہش مند تھا لیکن اس کام کے لیے خاصی قربانی کی ضرورت تھی۔ اس لیے مہاراجہ نے اس ارادے کو ملتوی ہی رکھا۔

ان دنوں اٹک پر جہانداد خان حاکم تھا۔ وہ دربار کابل کا نمائندہ ہونے کے علاوہ افغان وزیراعظم فتح خان کا بھائی بھی تھا لیکن اب اس نے کابل سے اپنا برائے نام تعلق بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کا دوسرا بھائی عطا محمد خان کشمیر کا حکمران تھا۔ جسے ماضی قریب میں افغان سنھ متحدہ لشکر نے شکست دی تھی۔ عطا محمد خان کے انجام کے بعد جہانداد خان کو اپنے بارے میں خطرہ پیدا ہو گیا' اور وہ محسوس کرنے لگا کہ اب میری باری آئے گی۔ یہ بات سوچ کر اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے راہ و رسم بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ مہاراجہ نے بڑی گرمجوشی سے اس کی دوستی کا جواب دیا۔ ان میں کافی خط و کتابت کے علاوہ براہِ راست مذاکرات بھی ہوئے۔ ان مذاکرات میں مہاراجہ کی نمائندگی فقیر عزیز الدین نے کی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ جہانداد خان قلعہ اٹک مہاراجہ کے حوالے کر دے اور مہاراجہ اس کے لیے کسی مناسب جاگیر کا انتظام کرے۔ چنانچہ مہاراجہ نے وزیر آباد کا علاقہ اسے دینے کا وعدہ کیا۔

آپس کے اس فیصلے کے بعد مہاراجہ نے اپنی فوج کا ایک مضبوط دستہ دیا سنگھ کے ماتحت اٹک کی طرف روانہ کیا تاکہ قلعہ کو اپنی تحویل میں لے لے' لیکن افغان فوج نے قلعہ خالی کرنے سے پیشتر ایک اور مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں کئی ماہ کی تنخواہ نہیں ملی لہٰذا بقایا جات سکھ حکومت ادا کرے۔ مہاراجہ کو جب اس معاملے کی اطلاع ملی تو اس نے فوجیوں کو تنخواہیں دینے کا حکم بھیجا۔ چنانچہ یہ مسئلہ طے ہونے کے بعد قلعہ خالی کر دیا گیا اور سکھ فوج نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

یہ ساری کارروائی انتہائی رازداری سے کی گئی اور حکومت افغانستان کو آخر وقت تک اس کی خبر نہ ہوئی۔ انہیں اس معاملے کی اطلاع اس وقت ملی جب قلعے پر سکھوں کو تصرف حاصل ہو گیا۔ اس پر افغان حکومت نے سخت غم و غصے کا اظہار کیا۔ خاص طور پر

افغان وزیر اعظم سردار فتح خان تو بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے ہر قیمت پر قلعہ واپس لینے کا تہیہ کرلیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے فوج تیاری کی اور پکھلی' دھمتور کے معروف راستے سے اچانک پشاور پہنچ گیا۔ اسی اثناء میں اس نے کشمیر پر اپنے بھائی محمد عظیم کو صوبیدار مقرر کر کے بھیجا۔

پشاور پہنچ کر سردار فتح خان نے مہاراجہ کو قلعہ خالی کرنے کے لیے کہا۔ مہاراجہ نے صاف انکار کو مصلحت کے خلاف سمجھتے ہوئے اسے گول مول سا جواب دیا۔ دراصل مہاراجہ اٹک میں اپنے قبضے کو مستحکم کرنے کے لیے وقت چاہتا تھا۔ فتح خان نے اس بات پر غور نہ کیا اور مہاراجہ سے نامہ و پیام کرتا رہا۔ اگر وہ پشاور پہنچنے کے فوراً بعد اٹک پر حملہ کر دیتا تو یقیناً فتح اسی کی تھی کیونکہ اس وقت تک قلعے میں سکھ فوج کی تعداد بہت کم تھی اور انہیں لاہور سے فوری کمک کی بھی توقع نہ تھی اور اگر فتح خان مسلح اقدام کرتا تو سکھ فوج زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکتی اور کمک پہنچنے سے پہلے ہتھیار ڈال دیتی۔ لیکن فتح خان مہاراجہ کی اس حکمتِ عملی کو سمجھ نہ سکا اور اس نے بہت سا وقت مہاراجہ سے گفت و شنید میں گزار دیا۔ اس اثناء میں مہاراجہ نے بڑی سرعت سے قلعہ اٹک کے محافظین کی معاونت کے لیے فوج روانہ کی۔ جب یہ فوج اٹک تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی اور وہاں کی صورتِ حال مہاراجہ کے حق میں ہوگئی تو مہاراجہ نے قلعہ خالی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب یہ صورت ہوئی تو فتح خان نے بڑھ کر قلعہ اٹک کا محاصرہ کر لیا۔ اس اثناء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنا توپخانہ اور فوج دیوان محکم چند کی سرکردگی میں اٹک کی جانب روانہ کر چکا تھا۔ اس فوج نے بھی جا کر فتح خان کی فوج کے بالمقابل ڈیرے ڈال دیئے۔

دونوں لشکر تقریباً تین ماہ تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے خیمہ زن رہے لیکن حملہ کرنے کی جرأت کوئی بھی نہ کر سکا۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر دیوان محکم چند نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے غنیم پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی جو مہاراجہ نے دے دی۔ اجازت ملنے کے بعد دیوان محکم چند نے اپنی فوج کو جارحانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی ہدایت

کی۔ اور سرداروں کو حکم دیا کہ افغان فوج کے قریب جا کر اس کی طاقت کا جائزہ لیں۔ 12 جولائی 1813ء کو سکھ فوج کا ایسا ہی ایک دستہ دشمن کے خیموں کے قریب گشت کر رہا تھا۔ اس وقت افغان فوج قدرے غافل تھی۔ سکھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اچانک افغانوں پر حملہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس جھڑپ نے شدت اختیار کر لی اور دونوں طرف کی تمام قوت تصادم میں شامل ہو گئی۔ لیکن شام تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے جنگ کو دوسرے دن صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

13 جولائی کو علی الصبح جنگ دوبارہ شروع ہوئی۔ اس دن جنگ کے آغاز سے قبل سکھ فوج کے سپہ سالار دیوان محکم چند نے اپنی فوج کی ترتیب میں کچھ تبدیلیاں کیں اور اس سے بہتر طور پر صف آراء کیا۔ اسی اثناء میں افغان فوج کے لیے کمک پہنچ گئی۔ دونوں فوجوں نے بڑی شدت سے ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ سخت معرکہ ہوا۔ دونوں طرف کی کثیر تعداد موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ بالآخر سخت مقابلے کے بعد سکھ فوج غالب آ گئی اور افغان فوج نے میدان چھوڑ دیا۔ سکھ فوج کو بہت سارا مالِ غنیمت ہاتھ آیا جس میں سات ہلکی توپیں بھی تھیں۔

یہ جنگ تاریخ میں جنگ خفرو کے نام سے موسوم ہے کیونکہ یہ خفرو کے مقام پر لڑی گئی تھی۔ سکھوں اور افغانوں کے درمیان یہ پہلا باقاعدہ تصادم تھا اور اس میں سکھوں کو فیصلہ کن برتری حاصل ہوئی۔ کئی دوسرے واقعات کی طرح یہ جنگ بھی پنجاب کی تاریخ میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس جنگ کی اہمیت بیان کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ اس وقت کی افغان قیادت کے بارے میں ضروری کوائف درج کر دیئے جائیں۔

ان دنوں افغانستان پر شاہ محمود بادشاہ تھا' جو عام سی قابلیت کا مالک تھا۔ لیکن اس کا وزیراعظم فتح خان غیر معمولی صلاحیتوں سے بہرہ مند تھا۔ وہ افغانستان کے سب سے طاقتور قبیلے بارکزئی کا سربراہ ہونے کی وجہ سے ملک کے قبائلی ماحول میں بہت محترم مقام رکھتا تھا۔ اس کے اٹھارہ بھائی تھے جن میں سے ایک دو کے سوا سب اس کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے۔

یعنی قبیلے اور ملک پر اسے مکمل گرفت حاصل تھی۔ افغان حکومت کو جو احمد شاہ ابدالی کے بعد سے مسل عدم استحکام کا شکار تھی اسے اب فتح خان کے عہد میں کچھ سنبھالا ملا تھا۔ اور وہ پھر سے بیرون ملک فوجی کارروائیوں کے قابل ہو گئے تھے۔ اس وقت کے سبھی افغان قائدین بھی انہی خطوط پر سوچ رہے تھے۔ خاص طور پر فتح خان تو برصغیر میں افغان مقبوضات کی بازیافت کے لیے بہت بے چین تھا۔

اب ہم یہاں جنگ خضرو کے علی الرغم نتائج پر تبصرہ کرتے ہیں۔ یعنی اس جنگ میں اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو فتح کی بجائے شکست ہو جاتی تو پھر کیا نتائج برآمد ہوتے؟ اس صورت میں سب سے پہلے تو یہ نتیجہ سامنے آتا کہ اٹک کے مستحکم قلعے پر فی الفور افغانوں کا قبضہ ہو جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ افغانوں کا اپنے اوپر اعتماد بحال ہو جاتا اور وہ جلد سے جلد اس بات کی کوشش کرتے کہ سندھ پار کے سابق افغان مقبوضات کو دوبارہ حاصل کیا جائے اور یہ حکومت پنجاب کے لیے ایک زبردست دشواری کا مسئلہ ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجیں افغانوں کو روک نہ سکتیں۔ کیونکہ جنگ خضرو میں افغان لشکر کے غالب آنے کی وجہ سے سکھ فوجی اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر افغانوں سے کمتر سمجھنے لگتے اور افغان حملے کا کامیاب دفاع نہ کر سکتے۔ دوسرے مہاراجہ ہزیمت کی صورت میں جھنگ' ساہیوال اور سندھ ساگر دوآب کے وہ مسلمان نواب جو حال ہی میں مغلوب ہوئے تھے' لیکن ذہنی طور پر وہ اب بھی اپنے آپ کو افغان تاج کے ماتحت سمجھتے تھے' مہاراجہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے' اس سے مہاراجہ کی مشکلات میں اضافہ ہوتا' اور یہ بات یقین آفرین ہے کہ مہاراجہ اس صورتحال سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا اور اس بات کا امکان پیدا ہو جاتا کہ اس کش مکش کے نتیجے میں افغانوں اور سکھوں کے درمیان ایک ایسے تصادم کی نوبت آ جاتی' جیسا کہ 1761ء میں افغانوں اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت میں ہوا تھا اور سکھ قوت تباہ ہو جاتی۔

لیکن صورت حالات نے اس کے بالکل برعکس رخ اختیار کیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو

فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی جس کے نتیجہ میں سکھ نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو افغانوں سے برتر سمجھنے لگے۔ بعد میں جتنی بھی افغان، سکھ جنگیں ہوئیں ان میں سکھ پہلے سے زیادہ بااعتماد ہو کر لڑے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد انہوں نے افغانوں سے پشاور بھی چھین لیا' بلکہ اس سے بھی آگے دریائے کابل تک انہیں اقتدار حاصل ہو گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اٹک کے قلعے کی اہمیت کے پیشِ نظر وہاں اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے لیے بڑی توجہ دی۔ وہاں اپنے نامور افسروں کو منتخب فوج کے ساتھ متعین کیا۔ ان میں گورمکھ سنگھ' سردھا سنگھ' دیوان سنگھ اور سر بلند خان قابلِ ذکر ہیں۔

کشمیر کی مہم:

عطا محمد خان کی شکست کے بعد فتح خان نے اپنے ایک دوسرے بھائی محمد عظیم خان کو کشمیر کا حاکم مقرر کیا۔ وہ بڑا صاحب تدبیر اور بہادر تھا۔ اس نے کشمیر میں اپنی حکومت کو اچھی طرح مضبوط کر لیا۔ اسی وجہ سے مہاراجہ اس کے بارے میں بہت متفکر ہوا اور اس نے جلد از جلد کشمیر فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ کشمیر میں افغان اقتدار کے استحکام سے اٹک کے قلعے کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ جبکہ مہاراجہ ہر قیمت پر اٹک کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے جنگ خضرو کے فوراً بعد کشمیر پر حملے کی تیاری شروع کر دی اور اکتوبر 1813ء میں روانہ ہوا۔ اس نے اپنے تمام سرداروں کو اپنی اپنی فوج کے ساتھ سیالکوٹ میں جمع ہونے کا حکم دیا اور خود بھی کانگڑہ میں جوالا مکھی کے مندر پر حاضری دینے کے بعد سیالکوٹ پہنچ گیا۔ لیکن مہاراجہ ابھی کشمیر میں داخل نہیں ہوا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ فتح خان بھاری فوج کے ساتھ پشاور پہنچ گیا ہے اور اس کا رخ ڈیرہ جات کی طرف ہے۔ اب مہاراجہ کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہ رہا۔ اسے دوسری خبر یہ دی گئی کہ وادیٔ کشمیر میں زبردست برفباری ہو رہی ہے اور تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ اس پر مہاراجہ نے فوراً واپسی اختیار کی لیکن دیوان محکم چند کے پوتے رام دیال کو فوج کے ایک دستے کے ہمراہ راجوڑی کی طرف جانے کا حکم دیا تاکہ

وہ راستوں پر قبضہ کرنے کے علاوہ سامانِ رسد فراہم کرلے' کیونکہ مہاراجہ نے کشمیر کی مہم محض ملتوی کی تھی' ترک نہ کی تھی۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ جونہی حالات سازگار ہوں وہ کشمیر پر حملہ کردے۔ یعنی مہاراجہ نے رام دیال کو اپنے آئندہ حملے کی پیش بندیوں کے لیے بھیجا تھا۔ یہ انتظام کرنے کے بعد مہاراجہ واپس روانہ ہوکر 26 دسمبر 1813ء کو لاہور پہنچا گیا۔

لاہور واپس پہنچ کر مہاراجہ فتح خان کے متوقع اقدام کا انتظام کرتا رہا۔ لیکن یہ حملہ نہ ہوا۔ اس دوران میں مہاراجہ نے لاہور میں سڑکوں وغیرہ کی مرمت پر توجہ دی۔ اس کے علاوہ شہر کی فصیل کی بھی مرمت کی گئی۔

ان اقدامات کے بعد اپریل 1814ء میں مہاراجہ نے دوبارہ کشمیر پر فوج کشی کا فیصلہ کیا۔ اپنے تمام افسروں اور باجگزار سرداروں کو فوراً اپنی اپنی افواج کے ساتھ وزیر آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ 4 جون تک تمام لشکر وزیر آباد میں جمع ہو چکا تھا۔ اس تاریخ کو مہاراجہ نے معائنے کے بعد فوج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کوچ کا اعلان کیا۔ لشکر یہاں سے روانہ ہوا۔ گجرات اور بھمبر کے راستے سے 11 جون کو راجوڑی پہنچا۔ اس جگہ تمام انتظامات کا آخری جائزہ لیا گیا۔ بھاری توپیں اور دوسرا غیر ضروری سامان یہیں چھوڑ دیا گیا۔ صرف چھوٹی توپوں کو آگے روانہ کیا گیا۔ یہ توپیں اونٹوں کی پشت پر رکھ کر استعمال کی جاتی تھیں۔

راجوڑی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لشکر کو دو بڑے حصوں میں منقسم کیا۔ ایک حصہ جس میں تیس ہزار سپاہی تھے' دیوان رام دیال کی قیادت میں بہران گلہ کے راستے بھیجا۔ اس دستے میں سردار دل سنگھ' غوثے خان' داروغہ' توپخانہ' سردار ہری سنگھ نلوہ اور سردار مت سنگھ پدھیانہ بھی شامل تھے۔ یہ دستہ شوپیاں کے مقام پر وادیٔ کشمیر میں داخل ہوا۔ لشکر کا دوسرا حصہ مہاراجہ نے اپنی کمان میں رکھا۔ یہ دستہ پہلے دستے سے نسبتاً بڑا تھا۔ اس دستے نے پونچھ کا راستہ اختیار کیا۔ اس دستے کو توشہ میدان کے درے سے ہوکر وادی میں پہنچنا تھا۔

دیوان رام دیال اپنے دستے کے ساتھ تیزی سے پہاڑی علاقہ عبور کرتے ہوئے 18

جون کو بہرام گلہ پہنچ گیا۔ اس نے پیر پنجال کے دروں اور دوسرے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں سکھوں کی افغانوں کے ساتھ چند ایک معمولی نوعیت کی جھڑپیں بھی ہوئیں جن میں سکھوں کا پلہ بھاری رہا اور ان کی پیش قدمی جاری رہی اور وہ سرائے وغیرہ سے گزر کر آماد پور تک پہنچ گئے۔ اس سے قریب ہی واقع ایک اہم جگہ ہمیر پور کو بھی فتح کر لیا گیا۔ اس جگہ 24 جون کو سکھ فوج اور عظیم خان کی فوج میں زبردست جھڑپ ہوئی۔ یہاں بھی سکھ کامیاب رہے اور افغان پسپا ہو گئے۔ سکھ فوج آگے بڑھی اور شوپیاں کے مقام پر اس کی پھر عظیم خان کی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ عظیم خان نے یہ فوج محمد شکر خان کی سرکردگی میں بھیجی تھی۔ اس کی تعداد اگرچہ کافی تھی۔ لیکن مہاراجہ کی فوج سے کم ہی تھی۔ دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ خونریز معرکے میں سکھ فوج کا ایک اہم سردار جیون مل ہلاک ہو گیا۔ اس کے مرتے ہی سکھ فوج میں بددلی پھیل گئی۔ افغانوں نے بھی زوردار حملے شروع کیے اور سکھوں کی شکست کے آثار نظر آنے لگے۔ اسی اثناء میں شدید بارش ہونے لگی۔ سکھ اس موسمی تبدیلی کی وجہ سے مزید پریشان ہوئے اور پسپا ہو کر سری نگر کی طرف بڑھ گئے اور وہاں مورچہ بندی کر کے دفاعی حالت میں بیٹھ گئے اور کمک کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن موسم کی مسلسل ناموافقت اور کمک لے کر آنے والے سردار بھائی رام سنگھ کے تساہل کی وجہ سے دیوان رام دیال کو عقب سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ اپنی اسی غفلت کے باعث بھائی رام سنگھ' مہاراجہ کی نظروں سے گر گیا اور کچھ عرصہ تک اپنے منصب سے بھی محروم رہا۔

دوسری طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ بارشوں کی شدت کی وجہ سے تقریباً پندرہ دن تک راجوڑی سے روانہ نہ ہو سکا۔ جب بارشیں ذرا رکیں تو مہاراجہ نے کوچ کیا اور بڑی مشکل سے 28 جون کو پونچھ پہنچا۔ یہاں بھی وہ پندرہ دن تک مقیم رہا کیونکہ پونچھ کا حاکم روح اللہ خان اس کے لیے رکاوٹ پیدا کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہاں سامانِ رسد حاصل کرنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ مہاراجہ نے یہ راستہ چھوڑ کر توشہ میدان والا راستہ اختیار کرنے

کا ارادہ کیا لیکن اس طرف بھی اسے وہی دقتیں پیش آئیں۔ اب مہاراجہ نے مونڈہ کی سمت سے پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ لیکن یہاں بھی اسے شدید مشکلات پیش آئیں کیونکہ روح اللہ خان اور عظیم خان نے اس کے خلاف چھاپہ مار سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ ان کے دستے اچانک پہاڑوں کی چوٹیوں پر نمودار ہوتے اور مہاراجہ کے وادیوں میں سے گزرتے ہوئے لشکر پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے اور فوراً غائب ہو جاتے۔ مہاراجہ اس صورتِ حالات سے زچ ہو گیا اور اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ادھر عظیم خان نے بھی کھلے تصادم کے لیے جارحانہ اقدامات شروع کر دیئے۔ اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے مہاراجہ کو گھیرے میں لینا چاہا۔ اس پر مہاراجہ نہایت سرعت سے واپس پلٹا اور پونچھ' کوٹلی اور میر پور کے راستے اگست 1814ء میں لاہور پہنچ گیا۔

اس عرصے میں دیوان رام دیال سری نگر کے پاس ہی مورچہ بند رہا۔ کبھی کبھار عظیم خان کی فوج سے اس کی جھڑپ بھی ہو جاتی۔ اس نے بڑی ثابت قدمی سے صورتِ حالات کا مقابلہ کیا اور باوجود عظیم خان کی برتری کے سپر انداز نہ ہوا۔

اس مقام پر مؤرخین دو مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ عظیم خان نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ رام دیال پر فتح حاصل نہیں کر سکتا' اس لیے اس نے رام دیال سے صلح کر لی اور رام دیال اپنی فوج سمیت کشمیر سے نکل آیا جبکہ اس کے برعکس رائے رکھنے والے دوسرے گروہ کا بیان یہ ہے کہ اس وقت عظیم خان کو خالصہ فوج پر واضح برتری حاصل تھی اور اس کا صلح کے لیے از خود سلسلہ جنبانی کرنا قرائن کے خلاف ہے۔ اس طبقہ مؤرخین کا دعویٰ یہ ہے کہ عظیم خان نے رام دیال سے اس کی اولوالعزمی اور بہادری کی وجہ سے جنگ بندی نہیں کی تھی بلکہ اس نے اس خیال کے تحت کہ رام دیال دیوان محکم چند کا پوتا ہے، اسے کشمیر سے فوج اور ساز و سامان سمیت چلے جانے کی اجازت دے دی کیونکہ عظیم خان اور محکم چند کے آپس میں نہایت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور عظیم خان نے اسی وجہ سے رام دیال کا لحاظ کیا۔

بہر حال 1904ء میں مہاراجہ کی کشمیر میں یہ مہم بری طرح ناکام رہی۔ مہاراجہ کو اس مہم میں دشمن کی نسبت ہر طرح سے بہت نقصان برداشت کرنا پڑا۔ وہ عظیم خان کی قوتِ مدافعت سے اس قدر خائف ہوا کہ مدت تک کشمیر کا رخ نہ کیا۔

1904ء کا سال مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے بہت ناخوشگوار ثابت ہوا۔ ایک تو اس سال اسے کشمیر میں شکست ہوئی اور دوسرے اس سال اس کا مایہ ناز سپہ سالار دیوار محکم چند اکتوبر 1904ء میں طویل علالت کے بعد مر گیا۔ مہاراجہ اس کی موت پر بہت غمگین ہوا۔ اس کا سوگ سرکاری طور پر منایا گیا اور اس کی آخری رسوم بھی سرکاری اعزاز سے ادا کی گئیں۔ کیونکہ خالصہ دربار کا یہ پہلا غیر سکھ عہدہ دار تھا' جس نے سکھ اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے بیش از بیش خدمات انجام دی تھیں۔ مہاراجہ اس کی خدمات کا تہہِ دل سے معترف تھا۔ اس نے دیوان محکم چند کے لڑکے موتی رام کو دیوان کا منصب عطا کیا جبکہ دیوان محکم چند کا پوتا' رام دیال پہلے ہی خالصہ فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اسے بھی دیوان کا عہدہ دیا جا چکا تھا۔

بھمبر اور راجوڑی میں فوجی کارروائی:

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کشمیر میں فوجی ناکامی کے بعد کشمیر کے قرب و جوار کی ریاستوں نے دربارِ لاہور کی اطلاعت سے گریز کا رویہ اختیار کر لیا۔ مہاراجہ نے اس صورتِ حالات سے فوری طور پر نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ اکتوبر 1915ء میں جب بارشوں کا موسم گزر گیا تو مہاراجہ نے اپنے تمام سرداروں کو سیالکوٹ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب راجوڑی کے حکمران' راجا اگر خان کو مہاراجہ کے ارادے کا علم ہوا تو اس نے بھی اپنے تحفظ کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے پہاڑی راستوں اور دروں میں بڑے بڑے پتھر اور کٹے ہوئے درخت ڈلوا کر انہیں مزید دشوار گزار بنا دیا اور اہم مقامات پر چھوٹے چھوٹے دستے مقرر کر دیئے راجہ اگر خان خود راجوڑی کے مستحکم قلعے میں محصور ہو کر بیٹھ گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فوج کو مذکورہ ریاستوں پر حملے کا حکم دیا۔ مہاراجہ کی فوج رکاوٹیں عبور کر کے راجوڑی کے قلعے تک جا پہنچی لیکن یہ قلعہ ایک بلند پہاڑی پر بنا ہوا تھا' اس لیے کئی کوششوں کے باوجود بھی فتح نہ ہو سکا۔ بھاری توپخانہ وہاں لے جایا نہیں جا سکتا تھا اور اس کے بغیر قلعہ فتح کرنا ناممکن تھا۔ بالآخر چھوٹی آٹھ توپوں کو ہاتھیوں پر لاد کر قلعے کے سامنے لایا گیا اور ان کی گولہ باری سے دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ راجا اگر خان وہاں سے بھاگ کر کوٹلی میں اپنے دوسرے قلعے میں چلا گیا۔ خالصہ فوج نے رام دیال' بھولا سنگھ اکالی اور ہری سنگھ نلوہ کی قیادت میں اس کا تعاقب کیا۔ راجا اگر خان یہاں سے بھی بھاگ نکلا۔
اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نور پور اور جوان کے راجوں کو بھی ان کے غیر وفادارانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اقتدار سے محروم کیا۔ ان کی ریاستوں میں اپنے حاکم مقرر کر کے ان کو گزارے کے لیے کچھ جاگیر دے دی۔ یوں مہاراجہ نے ان پہاڑی ریاستوں پر اپنا اقتدار پھر سے بحال کر دیا۔

کشمیر پر حملہ:

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے 1814ء میں کشمیر پر پہلا بڑا حملہ کیا تھا جس میں اسے ناکامی ہوئی تھی۔ مہاراجہ کو اس ناکامی کا بہت افسوس تھا۔ وہ کشمیر کے حاکم عظیم خان کے مستحکم دفاع کی وجہ سے کشمیر پر دوسرا حملہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کے دل سے کشمیر کی فتح کا خیال نکل نہ سکا۔ وہ مناسب موقعہ کا منتظر رہا۔ اسے یہ موقع 1819ء میں مل گیا۔

ہوا یوں کہ 1818ء میں افغانستان کا مردِ آہن وزیرِ اعظم فتح خان ایک سازش کا شکار ہو کر اقتدار سے محروم ہو گیا۔ پہلے اس کی آنکھیں نکال دی گئیں اور پھر اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت کی وجہ سے افغانستان پھر سے زبردست سیاسی خلفشار میں مبتلا ہو گیا۔ بارکزئی قبیلہ حکومت سے بغاوت پر تل گیا اور قریب تھا کہ خانہ جنگی شروع ہو جائے' لیکن فتح خان کے چھوٹے بھائی عظیم خان، گورنرِ کشمیر نے اس موقع پر انتہائی تدبر کا ثبوت دیا۔ بھائی کی

موت کی خبر سنتے ہی وہ کابل پہنچا اور اپنے قبیلے والوں کو سمجھایا کہ اس موقع پر حکومت سے ٹکرانا ناقابلِ تلافی قومی سانحے کے مترادف ہو گیا اور اس سے ملک کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔ قبیلے نے اس کی بات مان لی' کیونکہ فتح خان کے بعد قبیلے کا سربراہ بھی وہی تھا۔ شاہ کابل نے عظیم خان کو اس کی خدمات اور قابلیت کی وجہ سے اپنا وزیراعظم مقرر کر لیا اور اس طرح افغانستان کا سیاسی بحران ختم ہو گیا۔

عظیم خان کے کابل چلے جانے سے اگرچہ افغانستان میں تو خانہ جنگی کا خطرہ ٹل گیا لیکن اس کی عدم موجودگی کے باعث کشمیر میں افغان اقتدار کو شدید ضعف پہنچا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اتنی مدت تک کشمیر پر محض اس لیے حملہ نہ کیا کہ عظیم خان کے ہوتے ہوئے اسے کامیابی کی توقع نہ تھی۔ لیکن جب عظیم خان کو مجبوراً کابل جانا پڑا اور وہ اپنے ساتھ فوج کو بھی لے گیا تو مہاراجہ نے سوچا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کے لیے اس نے طویل انتظار کیا تھا۔ مہاراجہ نے فیصلہ کیا کہ اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام فوج کو جلد وزیرآباد پہنچنے کا حکم دیا۔ مئی 1819ء تک مہاراجہ کی تمام قوت وزیرآباد پہنچ چکی تھی۔ مہاراجہ نے لشکر کے تین حصے کیے ہراول دستہ مصر دیوان چند اور سردار شام سنگھ اٹاری والے کی قیادت میں بھیجا۔ دوسرا دستہ شہزادہ کھڑک سنگھ کی سربراہی میں روانہ ہوا بقیہ فوج مہاراجہ کی اپنی کمان میں تھی۔ مہاراجہ اس کو محفوظ قوت کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ اگر محاذ پر لڑنے والے دستوں کو کمک کی ضرورت پیش آ جائے تو ان کی ضرورت یہاں سے پوری کی جا سکے۔ مہاراجہ نے اس مہم کے لیے رسد وغیرہ کا فراواں انتظام کیا۔ محاذِ جنگ سے رابطے کے لیے ہرکاروں کا بھی معقول بندوبست کیا گیا تاکہ لڑائی کے بارے میں مہاراجہ ہر لمحے آگاہ رہ سکے۔

جب لشکر روانہ ہونے لگے تو مہاراجہ نے سیاسی تدبر سے کام لیتے ہوئے بھمبر کے معزول حکمران' سلطان خان کو بھی لشکر کے ہمراہ بھیج دیا۔ سلطان خان سات سال سے مہاراجہ کی قید میں تھا۔ مہاراجہ نے اس موقع پر اسے رہا کیا اور لیپاپوتی کر کے اسے بھی اس

مہم میں فوج کے ساتھ کر دیا۔ بعد کے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مہاراجہ کی یہ تدبیر بہت کامیاب رہی اور سلطان خان نے اپنے تجربے اور علاقائی معلومات سے مہاراجہ کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔

خالصہ لشکر نے سب سے پہلے راجوڑی کا محاصرہ کیا کیونکہ وہاں کا حاکم راجا اگر خان دربارِ لاہور کی اطاعت سے گریزاں تھا۔ اس نے جب سکھ فوج کے عزائم دیکھے تو وہ قلعہ چھوڑ کر رات کے وقت بھاگ گیا۔ دوسرے دن اگر خان کا بھائی رحیم اللہ خان خالصہ لشکر میں حاضر ہوا اور امان طلب کی۔ شہزادہ کھڑک سنگھ نے فوراً رحیم اللہ خان کو وزیر آباد میں مہاراجہ کے پاس بھیج دیا۔ مہاراجہ نے اپنی حکمتِ عملی کے تحت اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اسے راجوڑی کا حاکم مقرر کیا اور خلعت وغیرہ دی۔ رحیم اللہ خان نے کشمیر کے پر پیچ پہاڑی راستوں میں خالصہ لشکر کی رہنمائی کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ مہاراجہ نے اس کے ساتھ مزید حسنِ سلوک کیا اور اپنی فوج کو اس کے مشوروں پر عمل کرنے کی ہدایت کی۔ یہ شخص بھی مہاراجہ کے مقاصد کے لیے از حد مفید ثابت ہوا۔

راجوڑی کی فتح کے بعد مصر دیوان چند اور شہزادہ کھڑک سنگھ کے دستے متحد ہو کر آگے بڑھے۔ اس ساری فوج کا سربراہ کھڑک سنگھ تھا۔ اس سے قبل مصر دیوان چند اپنا بھاری توپخانہ اور غیر ضروری ساز و سامان بھمبر میں چھوڑ چکا تھا۔ ایک تو اس علاقے کے راستے ہی بڑے دشوار گزار تھے۔ دوسرے اس موسم میں دریاؤں اور ندی نالوں میں سیلاب کا زور تھا۔ ان حالات میں خالصہ فوج کے لیے آگے بڑھنے میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ جب گھوڑوں پر سفر ممکن نہ رہا تو سپاہی گھوڑوں سے اتر آئے اور پیدل پیش قدمی شروع کر دی۔ شہزادہ کھڑک سنگھ پوشانہ سے ہوتا ہوا بہرام گلہ پہنچا۔ اس جگہ سلطان خان کی کوششوں سے شوپیاں کے حکمران نے خالصہ فوج کے خلاف مزاحمت ترک کر دی اور شہزادہ کھڑک سنگھ سے ملنے اس کے پاس آیا۔ کھڑک سنگھ نے بڑے احترام سے اس کا استقبال کیا۔ اسی جگہ اطلاع ملی کہ پونچھ کا حاکم زبردست خان آمادہ پیکار ہے۔ اس نے بڑی تعداد میں فوج اور

سامانِ حرب مہیا کر رکھا ہے۔ اس نے اپنے علاقے کی گھاٹیوں' دروں اور قلعوں کو دفاعی اعتبار سے بہت مستحکم بنا لیا ہے۔ یہ اطلاع ملنے پر سکھ فوج نے کوچ کیا۔ معمولی جدوجہد کے بعد پونچھ کے تقریباً اہم مقامات اس کے قبضے میں آ گئے۔ یہ حالت دیکھ کر زبردست خان نے مزید مقابلہ بے کار سمجھا اور ہتھیار ڈال دیئے۔

اسی اثناء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اپنے محفوظ دستوں کے ساتھ راجوڑی سے آگے شاہ آباد پہنچ چکا تھا۔ برسرِ پیکار خالصہ فوج پونچھ کو فتح کرنے کے بعد دو حصوں میں بٹ کر پیر پنجال کی جانب بڑھی۔ مہاراجہ نے بھی دس ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ کمک کے لیے بھیجا جو مصر دیوان چند سے پیر پنجال میں آ کر ملا۔ اس مقام پر بھی سکھوں اور افغانوں میں شدید جنگ ہوئی۔ افغان یہاں بھی شکست کھا گئے اور سکھ لشکر پیش قدمی کرتا ہوا سرائے علیہ آباد پہنچ گیا۔ اس جگہ مصر دیوان چند کو معلوم ہوا کہ عظیم خان کا بھائی اور نائب جبار خان بارہ ہزار جنگجو افغان سپاہیوں کے ساتھ مقابلے کے لیے قریب ہی موجود ہے۔ اس پر سکھ لشکر علیہ آباد میں اتر پڑا' تاکہ مسلسل سفر کی کلفت دور ہو جائے اور پھر سے تازہ دم ہو کر کارروائی شروع کی جا سکے۔ چنانچہ ایک دو دن آرام کر کے جولائی کو سکھوں نے اچانک بڑھ کر جبار خان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ علی الصبح کیا گیا۔ خونریز معرکہ ہوا اگرچہ سکھوں کو پہل کی افادیت حاصل تھی لیکن افغانوں نے اس بے جگری سے دفاعی جنگ لڑی کہ ایک موقع پر سکھ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور افغانوں کی فتح کے آثار نظر آنے لگے۔ اس صورتِ حالات سے سکھ لشکر میں پریشانی پھیل گئی کیونکہ افغانوں کے دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس موقعے پر کسی طرح پھولا سنگھ اکالی کا نہنگ دستہ آگے بڑھا اور زبردست دوبدو جنگ کے بعد افغانوں کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ سکھ لشکر بھی سنبھلا اور دوبارہ منظم ہو کر حملے میں شریک ہو گیا۔ اب سکھ بتدریج غالب آنے لگے۔ بالآخر افغان فوج کے پاؤں میدان سے اکھڑ گئے اور سکھ کامیاب رہے۔ افغانوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ ان کا بے شمار ساز و سامان سکھوں کے ہاتھ لگا۔ جس میں بہت سی چھوٹی توپیں اور بڑی تعداد میں گھوڑے بھی تھے۔

جبار خان یہاں سے بھاگ کر پہلے سری نگر گیا اور وہاں سے بارہ مولا کے راستے پشاور چلا گیا۔ 4 جولائی 1819ء کو سکھ لشکر سری نگر میں داخل ہوا۔ کھڑک سنگھ نے اپنے مشیروں کے کہنے پر اپنی فوج کو سختی سے ہدایت کی کہ شہریوں کی جان و مال کو کسی طرح نقصان نہ پہنچایا جائے۔ شہر میں منادی کرادی گئی کہ عوام کو مکمل امان دی جاتی ہے اور ان کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس اعلان کا اہلِ شہر پر بہت اچھا اثر ہوا اور انہوں نے بھی سکھ اقتدار قبول کر لیا۔

اس فتح کی خبر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو شاہ آباد میں پہنچائی گئی۔ لشکر گاہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مہاراجہ نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ مہاراجہ ہاتھی پر سوار ہوا' سارے لشکر میں گھوما اور سپاہیوں میں روپیہ تقسیم کیا۔ چراغاں ہوا اور غرباء میں کھانا بانٹا گیا۔ مہاراجہ نے کافی سونا چاندی بطور نذر دربار صاحب امرتسر بھیجا۔ تین دن کے جشنِ فتح کے بعد مہاراجہ لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ مہاراجہ کے لاہور پہنچنے پر یہاں ایک اور جشن منایا گیا اور عوام کے تمام طبقوں نے اس موقع پر تقریبات منعقد کیں۔

اگرچہ مہاراجہ کی فوج نے کشمیر کے صدر مقام سرینگر کو فتح کر لیا تھا لیکن ابھی کئی دوسرے اہم مقامات افغانوں ہی کے قبضے میں تھے۔ مہاراجہ نے دیوان رام دیال کو حکم دیا کہ وہ بھمبر میں اپنا مستقر قائم کرے۔ جبکہ مصر دیوان چند کو حکم دیا گیا کہ وہ کشمیر فتح کو مکمل کرے۔ سردار شام سنگھ اٹاری والا اور سردار جوالا سنگھ بھڑانیہ بھی مصر دیوان چند کے ہمراہ تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دیوان رام دیال کے والد دیوان موتی رام کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا اور بیس ہزار فوج اس کے ماتحت کشمیر میں تعینات کی۔ پنڈت بیربر کو ترپن لاکھ روپے کے عوض کشمیر کا مالیہ وصول کرنے کا اختیار دیا گیا جبکہ کشمیر کی کل آمدنی تقریباً انہتر لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ مصر دیوان چند نے کشمیر کی مہم کے سلسلے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے۔ اس سے قبل وہ ملتان کی فتح میں بھی اہم کردار ادا کر چکا تھا۔ پہلے اسے 'ظفر جنگ' اور

اب 'فتح ونصرت نصیب' کا اعزاز دیا گیا۔ اس کے علاوہ اسے پچاس ہزار کی جاگیر بھی ملی۔ کیونکہ کشمیر جیسے وسیع اور مالدار صوبے کو خالصہ سلطنت کا حصہ بنانے میں اس کی کوششوں کو بہت دخل تھا۔

پشاور پر قبضہ:

سردار فتح خان کے مرنے کے بعد افغانستان میں وہی پہلا سا سیاسی عدم استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اس موقعے کو غنیمت خیال کرتے ہوئے اکتوبر 1818ء میں کشمیر کی مہم سے قبل پشاور پر چڑھائی کا فیصلہ کیا۔ وہ بہت سی فوج کے ساتھ خضرو کے میدان میں ٹھہرا۔ یہاں سے اس نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک دستہ دریا کے پار بھیجا۔ ادھر پٹھانوں کو بھی سکھ فوج کی آمد کی خبر ہو چکی تھی اور وہ بھی مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس علاقے میں اکثر خٹک قبیلے کے لوگ آباد تھے۔ یہ قبیلہ بڑا دلیر اور جنگجو ہے۔ چنانچہ اس قبیلے کے ساتھ ہزار افراد نے اپنے سردار فیروز خان خٹک کی قیادت میں سکھ جارحیت کو روکنے کے عزم کا اظہار کیا۔ جب سکھوں کے گشتی دستے نے دریائے سندھ عبور کیا تو پٹھانوں کو بھی علم ہو گیا۔ چنانچہ وہ ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ سکھوں کو اس صورتِ حالات کی خبر نہ تھی۔ لہٰذا وہ بے خطر بڑھتے چلے آئے۔ جب وہ پوری طرح افغانوں کے نرغے میں آگئے تو ان پر اچانک حملہ کر دیا گیا۔ سکھ مقابلے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے فوراً ہی مغلوب ہو گئے۔ افغانوں نے تمام سکھوں کو قتل کر دیا۔ صرف چند سکھ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے جا کر سارا واقعہ بیان کیا۔ مہاراجہ کو جب اپنے فوجیوں کی ہلاکت کی خبر ملی تو بہت غضبناک ہوا اور اسی وقت افغانوں پر جوابی حملہ کرنے کا حکم دیا۔ ان دنوں دریا میں پانی کا بہاؤ معمول سے قدرے تیز تھا۔ رنجیت سنگھ نے ملاحوں کو حکم دیا کہ ایسی جگہ تلاش کریں جہاں پانی کی گہرائی کم ہو۔ جلد ہی ایک جگہ مل گئی۔ مہاراجہ نے یہیں سے دریا عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے فوج کی ہمت بڑھانے کے لیے سب سے پہلے اپنا ہاتھی

پانی میں ڈالا اور سونے کے سکوں سے بھرا ہوا طشت خواجہ خضر کی نذر کے طور پر دریا کے سپرد کیا۔ حسنِ اتفاق سے سیلاب کی شدت میں اسی وقت کمی واقع ہوگئی اس لیے مہاراجہ کا لشکر بغیر کسی تکلیف کے دریا پار اتر گیا۔

دوسری طرف افغان بھی منظم ہو کر میدانِ کارزار میں آ موجود ہوئے۔ دونوں فوجوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ افغانوں نے اگرچہ اپنی روایتی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مدافعت کی لیکن سکھ اپنی عددی برتری کی وجہ سے غالب آ گئے اور افغانوں کو صلح کی درخواست کرنی پڑی۔ اس فتح کے نتیجے کے طور پر خیر آباد اور جہانگیرہ کے قلعوں پر مہاراجہ کا تسلط ہو گیا۔ اس نے یہاں اپنی کچھ فوج تعینات کی اور باقی فوج کے ساتھ پشاور کی جانب پیش قدمی کی۔ مہاراجہ اس سے قبل سردار شام سنگھ اٹاری والے کو پشاور کی طرف بھیج چکا تھا۔ اس نے اطلاع دی۔ جہانگیرہ اور خیر آباد پر مہاراجہ کے قبضے کی خبر جونہی پشاور میں دوست محمد خان کو ملی تو وہ فوراً شہر خالی کر کے ہشت نگر کی جانب پسپا ہو گیا ہے۔ مہاراجہ اس خبر سے بہت خوش ہوا اور بڑھ کر پشاور کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ سپاہیوں کو ہدایت کی کہ شہریوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے اور شہریوں کو بھی کہا جائے کہ انتظامیہ کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ مہاراجہ چند دن پشاور میں مقیم رہا۔ پھر اس نے جہانداد کو پشاور کا حاکم مقرر کیا۔ یہ جہانداد خان وہی ہے جس نے اٹک کا قلعہ مہاراجہ کے سپرد کیا تھا۔ اور سردار شام سنگھ کو بھی وہیں چھوڑا اور خود واپسی اختیار کی لیکن مہاراجہ نے نہ تو پشاور میں زیادہ فوج ہی چھوڑی اور نہ کسی ہنگامی صورت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہیں کچھ روپیہ دیا چنانچہ وہی شہر پر حملہ آور ہوا اور جہانداد خان اسے روک نہ سکا۔ اس نے جہانداد خان اور سردار شام سنگھ کو پشاور سے بھگا دیا اور خود اختیارات سنبھال لیے۔

پشاور پر دوبارہ قبضہ کرنے کے فوراً بعد سردار دوست محمد خان نے اپنی اس حرکت کی صفائی پیش کرنے کے لیے اپنے دو معتمد افراد دیوان امور درمل اور حافظ روح اللہ خان کو مہاراجہ کی خدمت میں روانہ کیا اور درخواست کی کہ اگر آپ مجھے پشاور میں اپنا نائب مقرر کر

دیں تو میں آپ کے اقتدار کا وفادار اور آپ کے احکام کا پابند رہوں گا۔ علاوہ ازیں سالانہ ایک لاکھ روپیہ بطور خراج بھی ادا کروں گا۔ جب مہاراجہ کو اس امر کی اطلاع ملی تو اس نے حالات کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ کیونکہ دوبارہ اٹک پار کی مہم پر جانا فی الوقت اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

اٹک کی طرح پشاور پر قبضہ بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فتوحات میں منفرد مقام رکھتا ہے کیونکہ تاریخ کے محض سرسری مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمیشہ غیر ملکی فاتحین اسی راستے سے برصغیر پر حملہ آور ہوتے رہے۔ اٹھارہویں صدی میں تو افغان حکمرانوں کے حملے روز کا معمول تھے۔ اٹک پر قبضے سے ایک طرح وہ دروازہ بند ہو گیا جہاں سے یہ فاتحین گزر کر آتے تھے اور پشاور پر تسلط سے ان مہم جو افراد کو برصغیر میں کارروائیاں کرنے کے عزائم سے قطعاً دستبردار ہونا پڑا۔ ادھر سے ان کا رخ تبدیل ہو گیا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پشاور فتح کرنے کے بعد شمال کی جانب سے برصغیر پر کوئی حملہ نہ ہوا۔

شمال مغربی سرحدی صوبے اور کشمیر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کامیابیوں کا ایک اور اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اہلِ پنجاب پر افغانوں کی کئی صدیوں کی ذہنی برتری ختم ہو گئی۔ اہلِ پنجاب کو یہ اعتماد حاصل ہو گیا کہ وہ بھی اس قابل ہیں کہ شمالی حملہ آوروں کو روک سکیں اور افغانوں کو یہ احساس ہو گیا کہ اب پنجاب ان کی جولانگاہ نہیں رہا۔

ہزارہ:

پشاور فتح کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے کشمیر فتح کیا جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ ان علاقوں میں مہاراجہ کی پے در پے مہموں کی وجہ سے ہزارہ کے قبائل کو تشویش ہوئی اور انہوں نے سوچا کہ اب عنقریب مہاراجہ ان پر بھی فوج کشی کرنے والا ہے۔ چنانچہ بہت سے سرداروں نے آپس میں مشورے کے بعد حکومتِ لاہور کے خلاف بغاوت کر دی۔ مہاراجہ کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے بھاری فوج سردار فتح سنگھ اہلووالیہ' سردار

شام سنگھ اٹاری والا اور دیوان رام دیال کی قیادت میں روانہ کی۔ اس فوج کا سپہ سالار اعلیٰ مہاراجہ کا لڑکا شیر سنگھ تھا۔ شیر سنگھ کی نانی رانی سدا کور بھی اپنے دستے کے ساتھ اس فوج کے ہمراہ گئی۔

مختلف مقامات پر سکھوں اور افغانوں میں جھڑپیں ہوئیں اور خالصہ فوج کامیابی سے پیش قدمی کرتی گئی اور ہزارہ کے سرداروں کو ہر جگہ شکست ہوئی۔ ایسے ہی ایک معرکے میں جو سارا دن جاری رہا' افغانوں کو بڑی ہزیمت ہوئی اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ دیوان رام دیال نے ان کا تعاقب کیا اور بڑھتے بڑھتے تنگ پہاڑی گھاٹیوں میں جا پہنچا۔ اس وقت تک اندھیرا بھی گہرا ہو چکا تھا۔ بھاگتے ہوئے افغانوں نے اچانک پلٹ کر حملہ کر دیا اور سکھوں پر زبردست گولہ باری کی جس سے کافی سکھ فوج ہلاک و زخمی ہوئی۔ ان ہلاک شدگان میں سکھوں کا ممتاز جرنیل دیوان رام دیال بھی تھا۔ سکھ فوج اپنے سپہ سالار کی موت پر سخت مشتعل ہوئی اور اس نے شدید غیظ و غضب کے عالم میں افغان فوج پر دھاوا کیا۔ دونوں طرف کے بیشمار سپاہی موت کے گھاٹ اترے۔ بالآخر سکھوں نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔ اس کے بعد اور بھی کئی جنگیں ہوئیں جو سکھ فوج نے جیتیں۔ اس طرح ہزارہ کا تمام علاقہ مہاراجہ کے ماتحت آ گیا۔ لیکن اس کے عوض مہاراجہ کو اپنے ایک ہونہار افسر سے ہاتھ دھونے پڑے۔

رام دیال کے ماتحت فوجی اس سے بہت انس رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کی موت پر بہت رنج کا اظہار کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی دیوان رام دیال کی وفات پر بے حد رنجیدہ ہوا۔ مہاراجہ کو اس کی صلاحیتوں کا بڑا اعتراف تھا اور اس کا خیال تھا کہ رام دیال اپنے دادا دیوان محکم چند کی طرح اپنے وقت کا سب سے بڑا فوجی دماغ ثابت ہوگا اور محکم چند کی موت کی وجہ سے سکھوں کی فوجی قیادت میں جو خلا ہوا ہے وہ رام دیال پورا کرے گا۔ لیکن اس کی یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں اور دیوان رام دیال عین جوانی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

دیوان رام دیال کے والد دیوان موتی رام کو جوان سال بیٹے کی موت سے شدید ذہنی صدمہ پہنچا۔ وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے عملی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں وہ کشمیر کی گورنری پر فائز تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ لاہور آیا اور اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ فرائضِ منصبی کی ادائیگی سے معذور ہے لہٰذا اس کی جگہ کسی دوسرے شخص کو کشمیر کا حاکم مقرر کر دیا جائے۔ اس نے کہا میں اب گوشہ نشین ہونا چاہتا ہوں۔ مہاراجہ نے اس کی درخواست کا پہلا حصہ تو منظور کر لیا' یعنی سردار ہری سنگھ نلوہ کو کشمیر کا گورنر بنا کر بھیج دیا لیکن گوشہ نشینی کے متعلق یہ کہا کہ دربار میں آ جایا کرو' اس سے تمہارا دل بھی بہلا رہے گا اور ہم بھی تمہاری خدمات سے محروم نہیں رہیں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ یہ معمول رہا اور جب سردار ہری سنگھ نلوہ کشمیر میں کامیاب نہ ہو سکا تو پھر مہاراجہ نے دیوان موتی رام ہی سے کشمیر کی انتظامی ذمہ داری سنبھالنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے اس نے قبول کر لیا۔

منکیرہ:

اپریل 1816ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ منکیرہ کے علاقے کی جانب گیا تاکہ وہاں سے بھی خراج وصول کر سکے۔ ابھی مہاراجہ منکیرہ میں وارد نہیں ہوا تھا کہ وہاں کا حاکم نواب محمد خان قضائے الٰہی سے وفات پا گیا۔ شیر محمد خان اس کا جانشین ہوا۔ اس نے مہاراجہ سے مذاکرات کئے۔ مہاراجہ نے ایک لاکھ بیس ہزار کا مطالبہ کیا۔ اس نے اس قدر دینے سے معذوری ظاہر کی اور صرف بیس ہزار پیش کیا۔ اس پر مہاراجہ نے طاقت آزمانے کی دھمکی دی اور آس پاس کے علاقوں میں تخت و تاراج شروع کر دی۔ خان گڑھ' محمود کوٹ' لیہ' بھکر اور محمود پور کے قلعوں پر یلغار کی گئی۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر شیر محمد خان نے پچاس ہزار روپے کی پیش کش کی جو مہاراجہ نے قبول کر لی اور واپس آ گیا۔

اگلے سال یعنی 1817ء میں مہاراجہ پھر خراج لینے کے لیے منکیرہ گیا۔ اس دفعہ نواب

شیر محمد نے ستر ہزار روپے مہاراجہ کو دیئے۔ علاوہ ازیں اس نے دو اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور کئی اونٹ بھی مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر کے اپنی جان چھڑائی۔

1821ء میں مہاراجہ پھر منکیرہ پر حملہ آور ہوا۔ اب کی بار اس کی نیت اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی تھی۔ جب مہاراجہ منکیرہ کی طرف جا رہا تھا تو مصر دیوان چند جو رانی سدا کور کے علاقے پر قبضہ کرنے گیا ہوا تھا' بھی مہاراجہ سے آملا۔ اسی اثناء میں کشمیر کا حاکم ہری سنگھ نلوہ بھی مہاراجہ کے پاس پہنچ گیا۔ سب سے پہلے مہاراجہ نے مختصر محاصرے کے بعد بھکر کا قلعہ فتح کیا۔ کچھ فوج تو یہیں تعینات کی اور کچھ سردار دل سنگھ اور جمعدار خوشحال خان سنگھ کی قیادت میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کو فتح کرنے کے لیے بھیجی۔ یہاں کے حاکم دیوان مالک رائے نے معمولی مقابلے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ اسی دوران مہاراجہ کی فوج کا ایک اور دستہ لیہ' خان گڑھ اور مانخ گڑھ کے قلعے فتح کر چکا تھا۔

منکیرہ کے گردونواح میں اپنا تسلط جمانے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے منکیرہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس شہر کے چاروں طرف ریگستان تھا اور پانی کی شدید قلت تھی۔ مہاراجہ نے بہت سے افراد کو پانی کی فراہمی پر مامور کیا اور تین دن میں پانی کا خاطر خواہ ذخیرہ اکٹھا ہو گیا۔ جنگ شروع ہوئی۔ مقامی فوجوں نے پندرہ دن تک خوب مزاحمت کی' لیکن جب ان کے بہت سے قابلِ ذکر افسر لالچ میں آ کر مہاراجہ سے مل گئے اور کچھ زخمی اور ہلاک ہو گئے تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ ان حالات کے پیشِ نظر نواب نے صلح کی درخواست کی اور کچھ شرائط کے ساتھ قلعے اور شہر سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ مہاراجہ نے اس کی شرطیں مان لیں اور اسے اپنے تمام سامان کے ساتھ بحفاظت شہر سے نکل جانے کی اجازت دے دی۔ نواب شہر سے باہر آیا۔ مہاراجہ نے اس کا استقبال کیا اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کا علاقہ اسے گزر بسر کے لیے عطا کیا۔ مہاراجہ نے منکیرہ کا الحاق سلطنتِ پنجاب کے ساتھ کر لیا۔ اس علاقے کی آمدنی تقریباً دس لاکھ روپے سالانہ تھی۔

پشاور پر دوبارہ حملہ:

1818ء میں مہاراجہ نے پہلی بار پشاور کو فتح کیا تھا۔ جہاں اس نے بعدازاں دوست محمد خان کا تقرر بطور حاکمِ اعلیٰ منظور کر لیا تھا۔ دوست محمد خان مہاراجہ کے پرانے حریف محمد عظیم خان کا بھائی تھا جو ان دنوں افغانستان کا وزیراعظم تھا۔ محمد عظیم خان مہاراجہ کے خلاف شدید انتقامی جذبات رکھتا تھا' کیونکہ مہاراجہ نے اس کے ایک بھائی جہانداد خان سے اٹک کا قلعہ لے لیا تھا اور دوسرے بھائی جبار خان کو کشمیر سے نکال باہر کیا تھا۔ اب مہاراجہ نے اس کے ایک اور شہر یعنی پشاور کو بھی فتح کر لیا تھا۔ ان واقعات کی وجہ سے محمد عظیم خان' مہاراجہ سے اپنے خاندان کی شکستوں کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور مہاراجہ سے جنگ کے لیے موقع کا منتظر تھا۔ یہ موقعہ اسے 1824ء میں مل گیا۔

دسمبر 1823ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دوست محمد خان کو سالانہ خراج ادا کرنے کا حکم دیا۔ خراج کے علاوہ مہاراجہ نے اس سے وہ خاص گھوڑا بھی طلب کیا جس کی اس نے بہت تعریف سنی تھی۔ اس مرحلے پر محمد عظیم خان اپنے بھائی کو مہاراجہ کی ماتحتی سے نکالنے کے لیے 13 جنوری 1824ء کو کابل سے پشاور پر چڑھائی کے لیے روانہ ہوا۔ دوست محمد خان کے ساتھ بھی اس نے سازباز کر لی اور دوست محمد خان مقابلے کے بغیر ہی شہر خالی کر کے یوسف زئی علاقے کے پہاڑوں میں پناہ گزین ہو گیا اور محمد عظیم خان نے شہر پر قبضہ کر لیا۔

پشاور پر قابض ہونے کے بعد اس نے جہاد کا اعلان کر کے عام بھرتی شروع کر دی اور چند ہی دنوں میں مختلف قبیلوں کے ہزاروں پٹھان اس کے پاس جمع ہو گئے اور زوروشور سے جنگ کی تیاری ہونے لگی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو جب ان تمام حالات کی اطلاع ملی تو اس نے بھی جوابی کارروائی کا ارادہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے شہزادہ شیر سنگھ کو دو ہزار سواروں کے ساتھ ہراول کے طور پر روانہ کیا۔ اس کے ہمراہ دیوان کرپارام' سردار دھنا سنگھ اور سردار عطر سنگھ بھی تھے۔ اس

کے فوراً بعد مہاراجہ نے ایک اور دستہ سردار ہری سنگھ نلوہ کی قیادت میں بھیجا۔ ان دو دستوں کے بعد مہاراجہ خود کثیر فوج لے کر روانہ ہوا۔ سردار دیسا سنگھ مجیٹھیہ، سردار فتح سنگھ اہلو والیہ، سردار پھولا سنگھ اکالی بھی اسی کی جمعیت میں تھے۔ جب مہاراجہ اٹک پہنچا تو شہزادہ شیر سنگھ اور سردار ہری سنگھ نلوہ جہانگیرہ کا قلعہ فتح کر چکے تھے۔ محمد عظیم خان کو جب جہانگیرہ میں سکھوں کی کامیابی کی خبر ملی تو اس نے پشاور سے کوچ کیا اور نوشہرہ کے قریب آ کر ڈیرے ڈال دیئے۔ یہاں سے اس نے دوست محمد خان اور جبار خان کو فوج دے کر روانہ کیا تا کہ وہ سکھوں کو جہانگیرہ سے نکال دیں۔ جب افغانوں کا لشکر جہانگیرہ پہنچا تو محمد عظیم خان کے ایک دوسرے بھائی محمد زمان خان۔ شہزادہ شیر سنگھ کا دریائے سندھ پر تعمیر کردہ کشتیوں کا پل توڑ دیا تا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کمک نہ بھیج سکے۔ مہاراجہ اس وقت دریا کی دوسری جانب پہنچ چکا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو جب پل کے ٹوٹنے کا علم ہوا تو اس نے فوراً نئے سرے سے پل بنانے کا حکم دیا، لیکن اس دوران میں دریا پار سے مہاراجہ کو ایک مخبر کے ذریعے اطلاع ملی کہ افغان، سکھوں پر بتدریج غالب آ رہے ہیں، اگر فوراً انہیں کمک نہ پہنچائی گئی تو شائد ان میں سے کوئی بھی نہ بچ سکے۔ اس پر مہاراجہ نے پل بنانے کا ارادہ ترک کیا اور فوج کو براہِ راست تیر کر دریا عبور کرنے کا حکم دیا اور فوراً ہی اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ سکھ فوج قدرے نقصان کے بعد دریا عبور کر گئی۔ جب افغانوں کو مہاراجہ کے دریا پار کرنے کی خبر ملی تو انہوں نے مزید لڑائی بیکار سمجھ کر واپس نوشہرہ کی راہ لی اور وہاں فیصلہ کن جنگ کی تیاری شروع ہو گئی۔ مہاراجہ یہاں سے آگے بڑھا اور اکوڑہ کے میدان میں جا کر خیمہ زن ہو گیا۔ اسی جگہ سردار جے سنگھ اٹاری والا بھی مہاراجہ کے لشکر میں شامل ہو گیا۔ یہ شخص مہاراجہ کی فوج کا ایک اہم افسر تھا۔ 1821ء میں مہاراجہ کسی بات پر اس سے ناراض ہو گیا تھا اور یہ سزا کے خوف سے بھاگ کر کابل چلا گیا تھا۔ اب وہ افغانوں کی طرف سے سکھوں کے ساتھ لڑنے آیا تھا لیکن جب اس جنگ نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا تو اس کے مذہبی احساسات بھی بیدار ہوئے اور اس

نے مسلمانوں اور سکھوں کی اس لڑائی میں سکھوں کی جانب سے لڑنے کا فیصلہ کیا اور مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مہاراجہ نے اسے معاف کر کے اس کے سابقہ عہدے پر بھی بحال کر دیا۔

ادھر افغان غازیوں کے لشکر نے بھی پیش قدمی کی اور رنجیت سنگھ کی فوج کے قریب آ پہنچے۔ اسی اثناء میں مہاراجہ کو اطلاع ملی کہ محمد عظیم خان ایک بڑے لشکر کے ہمراہ آ رہا ہے اور دریائے لنڈہ عبور کرنے والا ہے۔ اس پر مہاراجہ نے اپنے افسروں سے مشورہ کیا۔ اکثر نے یہ رائے دی کہ اگلے دن صبح حملہ کیا جائے لیکن جنرل ونٹورہ نے کہا کہ فی الفور حملہ کرنا چاہیے' کیونکہ اگر محمد عظیم خان آ پہنچا تو جنگ جیتنی محال ہو جائے گی۔ خاصی ردّ وکد کے بعد مہاراجہ نے یہ تجویز منظور کر لی اور حملے کی تیاری شروع ہو گئی۔

رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے دستے کے آٹھ سو سوار اور سات سو پیادہ سپاہی سردار پھولا سنگھ اکالی کی قیادت میں ایک جانب مقرر کئے اور انہیں ہی حملے کا آغاز کرنا تھا۔ سردار دیسا سنگھ مجیٹھیہ اور سردار فتح سنگھ اہلووالیہ کی سربراہی میں دوسرا دستہ ایک الگ سمت میں تعینات کیا تاکہ پہلے دستے کے بعد یہ جنگ میں شامل ہو اور حملے میں شدت پیدا کرے۔ لشکر کا بڑا حصہ مہاراجہ نے اپنی کمان میں رکھا تاکہ جس طرف سے بھی کمک کی ضرورت ہو وہاں فوراً فوج بھیجی جا سکے۔ ان انتظامات کے بعد مہاراجہ نے ایک بڑا دستہ شہزادہ کھڑک سنگھ' سردار ہر سنگھ نلوہ جنرل الارڈ اور جنرل ونٹورہ کی سرکردگی میں اس مقصد پر متعین کیا کہ اگر محمد عظیم خان دریا عبور کرے تو اسے روکیں اور میدانِ جنگ تک نہ پہنچنے دیں۔

جب فوج نے نقل و حرکت شروع کی تو رنجیت سنگھ نے بڑے جوش و خروش سے انہیں رخصت کیا۔ مہاراجہ ایک اونچے چبوترے پر کھڑا فوجوں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ سپاہی اس کے سامنے سے گزرتے اور نعرے لگاتے تو مہاراجہ بھی گرمجوشی سے بآوازِ بلند ان کے نعروں کا جواب دیتا۔

ادھر سے سکھ بڑھے اور ادھر سے افغان آمنا سامنا ہوتے ہی دونوں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ اکالی پھولا سنگھ کا نہنگ دستہ روایتی جنون کے ساتھ نبرد آزما ہوا۔ افغانوں نے بھی بہادری کے جوہر دکھائے اور پھولا سنگھ کو اپنے حملے کا مرکز بنا لیا۔ پھولا سنگھ ایک ہاتھی پر سوار تھا۔ افغانوں نے ہر طرف سے اس پر گولیوں کی بارش کر دی' اسے کئی گولیاں لگیں اور تھوڑی دیر بعد وہ ہودے ہی میں مر گیا۔

پھولا سنگھ کے مرنے کے بعد سکھوں نے زیادہ شدید حملہ کیا۔ افغانوں نے بھی قابلِ فخر مزاحمت کی' لیکن بالآخران کی صفوں میں کمزوری رونما ہو گئی۔ سکھوں نے ایک زوردار حملہ کر کے جنگ جیت لی اور افغان بھاگ گئے۔

محمد عظیم خان دریا کی دوسری طرف یہ صورتحال دیکھ رہا تھا' لیکن خالصہ فوج کی مکمل ناکہ بندی کی وجہ سے دریا عبور نہ کر سکتا تھا۔ جنرل ونٹورہ نے اپنا توپخانہ اس عمدگی سے استعمال کیا کہ محمد عظیم خان آخر وقت تک اپنے لشکر کی امداد کے لیے پہنچ نہ سکا۔ حتیٰ کہ اس کا لشکر شکست کھا گیا۔ اس پر محمد عظیم خان بھی مزید تصادم کا خیال ترک کر کے واپس روانہ ہوا۔ اس ہزیمت سے اس پر دل شکستگی کا عالم طاری ہو گیا اور اس نے آئندہ سکھوں سے لڑائی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ حالات سے اس قدر دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ کابل بھی نہ پہنچ سکا اور راستے ہی میں دم توڑ گیا۔

اس جنگ میں سکھوں کو کثیر مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ انہوں نے بھاگتے ہوئے افغانوں کا تعاقب کیا اور ان سے رہا سہا ساز و سامان بھی چھین لیا۔ اس فتح کے نتیجے کے طور پر شمال مغربی سرحدی صوبے میں سکھوں کے مخالف عناصر کا مکمل خاتمہ ہو گیا اور پورے صوبے پر ان کا تسلط قائم ہو گیا۔ جمرود سے مالاکنڈ تک اور بنیر سے کھٹک تک کا علاقہ خالصہ حکومت کے تصرف میں آ گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ 17 مارچ 1824ء کو بڑے تزک و احتشام سے پشاور میں داخل ہوا۔ اس نے عوام کو عام امان دی۔ جس کے جواب میں عوام نے مہاراجہ کا خیر مقدم کیا عمائدینِ شہر نے نذرانے پیش کیے۔ دوست محمد خان اور یار محمد خان

بھی معذرت خواہاں ہو کر مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اطاعت گزاری کا عہد کیا۔ پچاس گھوڑے بطور نذر پیش کیے۔ جن میں مہاراجہ کا مطلوبہ گھوڑا 'گہر بار' بھی تھا۔ مہاراجہ نے ان کے سابق طرزِ عمل سے صرف نظر کرتے ہوئے یار محمد خان کو دوبارہ حاکم پشاور مقرر کر دیا۔ اس نے سالانہ ایک لاکھ دس ہزار روپیہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

ان انتظامات کے بعد مہاراجہ پشاور سے واپس روانہ ہوا اور 27 اپریل 1824ء کو لاہور پہنچا۔ مہاراجہ کے پہنچنے پر لاہور کے باشندوں نے خوب خوشی منائی۔ فتح پشاور کا جشن منعقد ہوا اور سارے شہر میں چراغاں کیا گیا۔

تحریکِ جہاد:

پشاور پر قبضے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دورِ عروج شروع ہوتا ہے۔ پنجاب کے تمام علاقے پر اسے مکمل اقتدار حاصل ہو چکا تھا اور اپنے مقبوضات پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ انہی دنوں میں سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف شمال مغربی سرحدی صوبے میں جہاد کا آغاز کیا۔ ان کی یہ تحریک اس قدر تیزی سے مقبول ہوئی اور اتنی بڑی تعداد میں مسلمان ان کے گرد اکٹھے ہو گئے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اپنی حکومت خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ مہاراجہ نے اپنی پوری قوت سے اس تحریک کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصے میں یہ تحریک بظاہر تو ختم ہو گئی لیکن اس کے اثرات بہت بعد تک باقی رہے۔

سید احمد شہید:

سید احمد شہید رائے بریلی میں 29 نومبر 1796ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید محمد عرفان تھا۔ چار سال کی عمر میں ان کی تعلیم شروع ہوئی لیکن وہ باوجود کوشش کے کچھ زیادہ نہ پڑھ سکے۔ بچپن میں انہیں صرف جسمانی ورزش کا شوق تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق

بڑھتا گیا اور اس کے نتیجے میں سید صاحب اپنی عمر کی نسبت خاصے صحت مند اور قوی نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کبڈی اور پیرا کی وغیرہ میں بھی معمولی دلچسپی لیتے تھے اور ہر وقت انہی مشاغل میں مصروف رہتے۔

سید احمد صاحب جب جوان ہوئے تو تلاشِ معاش، کے سلسلے میں اپنے کچھ عزیزوں کے ہمراہ لکھنؤ گئے اور وہاں تقریباً چار ماہ تک مقیم رہے لیکن ملازمت کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ چنانچہ ایک دن سید احمد صاحب اپنے ہمراہیوں کو اطلاع دیئے بغیر ہی لکھنؤ سے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ دہلی میں انہوں نے اس وقت کے سب سے بڑے علمی اور مذہبی خاندان، یعنی شاہ ولی اللہ کے خاندان کے ہاں قیام کیا۔ اس وقت شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز اس خاندان کے سربراہ تھے۔ سید احمد شہید انہی کے پاس حاضر ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز نے انہیں تعلیم وتربیت کے لیے اپنے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کے سپرد کیا۔ چنانچہ سید صاحب' شاہ عبدالقادر کے پاس اکبر آبادی مسجد میں رہنے لگے۔ سید صاحب کئی سال دہلی میں مقیم رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے کافی حد تک اپنی علمی کمی کو دور کیا کیونکہ شاہ ولی اللہ کے خاندان کے تمام افراد صاحب علم وفضل تھے اور سید صاحب ہمہ وقت ان لوگوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ اس ماحول سے انہوں نے کافی استفادہ کیا۔ یہیں ان کا تعارف اس خاندان کے دو اہم افراد یعنی شاہ اسمٰعیل اور شاہ عبدالحئی سے ہوا جو بعد ازاں سکھوں کے خلاف تحریک میں ان کے دست وبازو ثابت ہوئے۔

سید احمد صاحب دہلی میں کافی مدت قیام کے بعد 1807ء میں واپس رائے بریلی آئے اور دو سال تک یہیں رہے۔ اس عرصے میں ان کی شادی ہوئی۔ بعد ازاں وہ ملازمت کے لیے ٹونک چلے گئے۔ وہاں کے حکمران نواب امیر خان نے انہیں اپنے سوار دستے میں ملازم رکھ لیا۔ سید احمد صاحب سات برس تک ٹونک میں رہے۔ جب وہاں کے حالات بھی ان کی طبیعت کے موافق نہ رہے تو مئی 1818ء میں انہوں نے اس جگہ کو بھی چھوڑ دیا اور دہلی چلے گئے اور اکبر آبادی مسجد ہی میں ٹھہرے۔ یہاں انہوں نے تبلیغ کا

سلسلہ شروع کیا۔ اس سے ان کی شہرت گردونواح میں پھیلنے لگی۔ تھوڑے ہی عرصے میں بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ اب انہوں نے تبلیغی دوروں کے سلسلے کا آغاز شروع کیا جس کے باعث ان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی ان دوروں میں انہوں نے مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل کرنے کی تلقین کے علاوہ جہاد پر خصوصی توجہ دینے کی تاکید کی۔ سید صاحب دس برس تک دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں تبلیغ کرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے وطن واپس جانے کا فیصلہ کیا۔

اس دفعہ سید احمد صاحب دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ رائے بریلی میں رہے۔ بہت سے مرید بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سید صاحب اب انہیں ہر وقت یہی ہدایت کرتے تھے کہ وہ مراقبوں میں کم اور جنگی تربیت حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کریں۔ یہاں بھی ان کے تبلیغی مشاغل جاری رہے اور وہ اس سلسلے میں قرب و جوار کے دورے بھی کرتے تھے۔ ایک دن اچانک ہی انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ ہم حج پر جا رہے ہیں۔ جسے ساتھ چلنے کی خواہش ہو تیار ہو جائے۔ اس اعلان کے بعد تقریباً چار سو افراد سفرِ حج کے لیے جمع ہو گئے اور یہ قافلہ 30 جولائی 1812ء کو بے سروسامانی کے ساتھ رائے بریلی سے روانہ ہوا۔ سید صاحب مختلف مقامات پر قیام کرتے ہوئے نومبر 1821ء کو کلکتہ پہنچے۔ راستے میں کافی لوگ سفر میں شریک ہو گئے۔ کلکتہ سے بھی کچھ لوگ قافلے میں شامل ہوئے۔ اس طرح جب یہ قافلہ کلکتہ سے روانہ ہوا تو اس کی تعداد ساڑھے سات سو تھی۔ سید صاحب کا یہ سفر تقریباً تین سال میں مکمل ہوا اور وہ 1824ء میں واپس ہندوستان پہنچے۔

سفرِ حجاز مقدس سے پہلے اور بعد سید احمد صاحب کو ہندوستان کے مختلف حصوں سے مسلمانوں کی زبوں حالی کی اطلاعات ملیں۔ خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی دگرگوں حالت کے بارے میں خبریں زیادہ تواتر سے ملیں اور وہ تہیہ کر چکے تھے کہ پنجاب کے مسلمانوں کو ان حالات سے اور مشکلات سے آزاد کرانے کے لیے اپنی تحریک جہاد کا آغاز اسی سرزمین

سے کریں گے۔ حج سے واپس آ کر سید صاحب دو سال تک رائے بریلی میں مقیم رہے۔ یہ عرصہ انہوں نے لوگوں کو جہاد کی طرف ترغیب دینے اور اس سلسلے کی ابتدائی تیاریوں میں گزارا۔ اس دوران میں بہت سے لوگ ان کے ساتھ جہاد میں شرکت پر آمادہ ہو گئے۔ اس مرحلے پر سید صاحب نے پنجاب کے صحیح صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے خاص معتمد شاہ اسمٰعیل کو یہاں بھیجا۔ انہوں نے پنجاب کے طول و عرض میں پھر کر حالات کا جائزہ لیا اور واپس جا کر سید صاحب کو اپنے دورے کے تاثرات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بھی سکھوں کے ظلم و ستم اور مسلمانوں کی بے کسی و بے بسی کے بارے میں خبروں کی تصدیق کی۔ چنانچہ سید صاحب نے فی الفور اقدام کا فیصلہ کیا اور 17 جنوری 1826ء کو رائے بریلی سے عزمِ جہاد لے کر نکلے۔ روانگی کے وقت ان کے ساتھ پانچ سو افراد تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں پہنچ کر افغان قبائل کے تعاون سے عملی قدم اٹھایا جائے۔ وہاں حکومت افغانستان کی طرف سے امداد کی بھی توقع تھی۔ افغانستان جانے والا عام راستہ پنجاب سے ہو کر گزرتا ہے۔ جسے اندریں حالات اختیار کرنا سید صاحب کے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس مختصر لیکن پرخطر راستے کو چھوڑ کر سندھ' بلوچستان' قندھار' کابل والا طویل لیکن محفوظ راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کابل میں وہاں کے حاکم سلطان محمد خان نے ان کا استقبال کیا' جس کی حکومت اپنے ہی بھائیوں کی مخالفت کی وجہ سے دن بدن کمزور ہو رہی تھی۔ سید صاحب ڈیڑھ ماہ تک کابل میں رہ کر ان بھائیوں میں مفاہمت کی کوشش کرتے رہے لیکن جب انہیں اس ضمن میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تو وہ وہاں سے روانہ ہوئے اور پشاور سے ہوتے ہوئے چارسدہ پہنچ گئے۔

جب سید احمد صاحب چارسدہ پہنچے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بھی ان کے عزائم کی خبر ہو گئی۔ چنانچہ اس نے سردار بدھ سنگھ کی قیادت میں دس ہزار سکھوں پر مشتمل لشکر بھیجا جو سید صاحب کی جائے قیام سے کچھ دور اکھوڑہ خٹک کے مقام پر آ کر خیمہ زن ہو گیا۔ سید صاحب کو اس صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد خود ہی

بڑھ کر سکھ فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ حملہ اس قدر تیز تھا کہ لشکر کو پسپا ہونا پڑا۔ کئی توپیں اور بہت سا دوسرا سامان مجاہدین کے ہاتھ لگا۔ مجاہدین چونکہ سب کے سب غیر تربیت یافتہ تھے اس لیے انہوں نے سکھوں کے بھاگتے ہی انتہائی غیر منظم طریقے سے مالِ غنیمت سمیٹنا شروع کر دیا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر سکھ لشکر نے ان پر پلٹ کر حملہ کر دیا جس سے مسلمانوں کا بہت سا جانی نقصان ہوا لیکن اس جھڑپ میں ابتدائی کامیابی سے مسلمانوں میں خود اعتمادی سی پیدا ہو گئی جس کی بنا پر وہ بعدازاں کئی سال تک سکھوں سے نبرد آزما رہے۔

اکھوڑہ خٹک کی جنگ کے بعد سید احمد صاحب اور سکھوں کے درمیان خضر اور شیدو کے مقام پر جھڑپیں ہوئیں جن میں سکھ غالب رہے۔ اب سید صاحب کی آزمائش کا دور شروع ہوا۔ مالی لحاظ سے بھی ان کی حالت بہت کمزور ہو گئی' جس کی وجہ سے کچھ عرصہ ان کی سرگرمیاں معطل رہیں' لیکن بعد میں جب ان کے نائب کمک لے کر آئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے افغان قبائل میں تبلیغ کر کے بھی اپنی جمعیت خاصی بڑھا لی تو پھر سے اپنی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس دوران میں سکھ' پشاور کے بارکزئی سرداروں کو سید صاحب کی اعانت سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب سید صاحب کو دو محاذوں پر لڑنا تھا۔ اس صورت میں انہوں نے پہلے پشاور کی طرف توجہ کی۔ اس وقت پشاور کی فوج اتمان زئی میں مقیم رہی۔ سید صاحب نے شاہ اسمٰعیل کو اس پر شب خون مارنے کے لیے بھیجا۔ حملہ اگرچہ اچانک کیا گیا تھا لیکن پٹھانوں نے پامردی سے مزاحمت شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد سید صاحب بھی معرکے میں شریک ہو گئے' لیکن وہ افغان فوج پر مکمل فتح حاصل نہ کر سکے اور کچھ دیر کے بعد میدانِ جنگ سے ہٹ گئے۔ دونوں طرف کا کافی جانی نقصان ہوا۔ اس کے بعد بھی سکھوں اور افغانوں سے سید صاحب کی کئی نتیجہ خیز جھڑپیں ہوئیں۔ آخر 1830ء میں ایک بڑی لڑائی ہوئی جس میں سید صاحب غالب رہے اور انہوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ پشاور کے سابق حاکم سلطان محمد نے اپنے گذشتہ طرزِ عمل پر اظہارِ ندامت کی اور آئندہ سید صاحب کا وفادار رہنے کا عہد کیا تو سید صاحب نے اسے ہی دوبارہ پشاور کی

حکومت دے دی۔

پشاور پر قبضے کے بعد سید احمد صاحب نے ایک ایسا حکم جاری کیا جس سے افغان عوام مجموعی طور پر ان کے خلاف ہو گئے۔ سید صاحب نے اعلان کیا کہ تمام بیوہ عورتیں فوراً دوسری شادی کر لیں۔ دوسرے وہ تمام لڑکیاں جو سنِ بلوغت کو پہنچ چکی ہیں ان کے ماں باپ کو چاہئے کہ جلد از جلد کسی جگہ ان کی شادی طے کر دیں۔ اگر آبادی میں سے رشتے نہ مل سکیں تو ہمارے ساتھیوں ہی سے ان کی شادی کر دی جائے۔ جو لوگ ایک خاص مدت کے اندر اس حکم پر عمل نہ کر سکے ان کے گھر جلا دیئے جائیں گے۔ اس حکم کا افغان معاشرے میں شدید ردِ عمل ہوا۔

سید صاحب اس کے بعد پشاور اور گردو نواح کے علاقے میں اپنے نائب مقرر کر کے ہزارہ کی جانب چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سلطان محمد خان نے دوسرے خوانین ساز باز کر کے سید صاحب کے نائبین کو ایک دن اچانک قتل کرا دیا اور پھر خود مختار ہو گیا۔ یہ خبر سید صاحب کو راستے میں ملی۔ اس انقلاب سے سید صاحب کی تحریک کے بہت سے قیمتی افراد ضائع ہو گئے جس کا انہیں بہت افسوس ہوا اور وہ دل شکستہ ہو گئے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کہیں اور چلے جائیں گے کیونکہ وہ اس علاقے کی کثیر آبادی کی ہمدردیوں سے محروم ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ ہزارہ ہی کی طرف بڑھتے رہے۔ اسی اثناء میں سید صاحب کو کشمیر کے مسلمانوں نے پیغام بھیجا کہ ہم پر سکھ سخت ظلم و ستم کر رہے ہیں' آپ آ کر ہمیں نجات دلائیں۔

اس پیغام کے جواب میں سید صاحب نے کشمیر جانے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے ہراول دستے کو کشمیر بھیج دیا اور وہ مظفر آباد تک پہنچ گیا۔ سید صاحب نے بھی کشمیر کی جانب کوچ کیا لیکن اس دوران میں کنور شیر سنگھ' سید صاحب کے ساتھ فیصلہ کن معرکے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ ہزارہ کے ایک مقام بالاکوٹ میں دونوں فوجوں کا مئی 1831ء میں آمنا سامنا ہوا۔ اس جنگ میں سید صاحب کے ہمراہیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار اور سکھوں کی تعداد

آٹھ ہزار تھی۔ 6 مئی کو علی الصبح دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سید صاحب کے ہمراہی بڑی بہادری سے لڑے لیکن ایک تو ان کی نفری سکھوں سے بہت کم تھی اور دوسرے وہ نشیب میں تھے اور سکھ لشکر بلندی پر یعنی سکھوں کو عدد اور جغرافیائی لحاظ سے واضح برتری حاصل تھی۔ پھر بھی سید صاحب کے ساتھیوں نے خوب مقابلہ کیا' لیکن تھوڑی دیر بعد سکھ غالب آ گئے۔ سید صاحب' شاہ اسمٰعیل اور ان کے تقریباً چار سو ہمراہی میدان میں کام آئے۔ باقی ماندہ منتشر ہو گئے۔ اس فتح کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پورے صوبہ سرحد پر مکمل تصرف ہو گیا۔ سید صاحب کی تحریک کے بعد اس صوبے میں سکھ حکومت کے خلاف کوئی تحریک نہ اٹھی اور اس کے باقی عہد میں اس صوبے میں بالکل امن امان رہا۔

مہاراجہ اور گورنر جنرل کی ملاقات:

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری دور کے اہم واقعات میں سے ایک مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل سے ملاقات ہے۔ گورنر جنرل ولیم بنٹنگ ان دنوں اپنے گرمائی صدر مقام شملہ میں مقیم تھا۔ پہلے اس کا نمائندہ لارڈ ایمرسٹ لاہور آیا اور مہاراجہ کی خدمت میں شاہِ برطانیہ اور گورنر جنرل کی جانب سے بیش از بیش تحفے پیش کئے۔ مہاراجہ نے بھی جواباً گراں قدر تحائف ارسال کئے۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ برنز لاہور آیا۔ اس کا بھی بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ وہ جب واپس گورنر جنرل کے پاس پہنچا تو اس نے مہاراجہ کے دربار کا احوال کچھ اس پیرائے میں بیان کیا کہ گورنر جنرل کے دل میں مہاراجہ سے ملاقات کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے کیپٹن ویڈ کو لاہور بھیجا۔ ویڈ نے اپنی سفارتی کاوشوں سے مہاراجہ کو گورنر جنرل سے ملاقات پر آمادہ کر لیا چنانچہ مہاراجہ نے لاہور دربار کی جانب سے ایک دعوت نامہ گورنر جنرل کو بھیجا' جسے گورنر جنرل نے قبول کیا۔ بعد میں طے ہوا کہ ملاقات 25 اکتوبر کو دریائے ستلج کے کنارے واقع ایک قصبے روپڑ میں ہو۔ اس فیصلے کے بعد دونوں طرف سے ابتدائی انتظامات ہونے شروع ہو گئے۔ مقررہ تاریخ پر

دونوں سربراہ روپڑ پہنچ گئے۔ پہلے دن انگریز سرکار کے اعلیٰ افسران مہاراجہ کی مزاج پرسی کے لیے آئے۔ اسی طرح شہزادہ کھڑک سنگھ اور کئی نامور سردار، گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مہاراجہ کی طرف سے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ دوسرے دن یعنی 26 اکتوبر کو مہاراجہ رنجیت سنگھ، گورنر جنرل سے ملنے کے لیے اس کی فرودگاہ میں گیا۔ انگریزی افواج کے سپہ سالار اور دیگر اعلیٰ افسران کی معیت میں گورنر جنرل نے مہاراجہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ گورنر جنرل نے مہاراجہ کو شاہانہ تحائف پیش کیے اس سے اگلے دن گورنر جنرل مہاراجہ کے مستقر میں آیا۔ مہاراجہ نے پورے اعزاز سے اسے خوش آمدید کہا۔ کچھ دیر گورنر جنرل نے مہاراجہ کو تحفے پیش کیے اور درباریوں نے نذریں گزاریں۔ تیسرے دن مہاراجہ نے گورنر جنرل کے اعزاز میں ضیافت دی اور اس سے دوسرے دن گورنر جنرل نے جوابی ضیافت دی۔ اگلے دن انگریز اور سکھ فوجوں نے اپنے جنگی کرتبوں کا مظاہرہ کیا۔ آخری دن یعنی 31 جولائی کو دونوں سربراہوں کی الوداعی ملاقات ہوئی۔ اور دوسرے دن دونوں اپنے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس ملاقات میں دونوں حکمرانوں نے باہمی دلچسپی کے تمام مسائل پر مذاکرات کیے انہوں نے آپس میں دوستی کا ایک معاہدہ بھی کیا۔

آخری عہد کے چند اہم واقعات:

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی کے آخری آٹھ نو برس مہمات سے خالی ہیں۔ اس دور میں کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی۔ سوائے لداخ کی فتح کے جو 1834ء میں راجا گلاب سنگھ کی سرکردگی میں ہوئی۔ یہ عرصہ محض مفتوحہ علاقوں کا انتظام بہتر بنانے میں صرف ہوا۔ مہاراجہ پنجاب کے تمام علاقوں کو فتح کر چکا تھا۔ پنجاب اور سرحد میں کوئی ایسی جگہ نہیں رہ گئی تھی جہاں فوج کشی کی جاتی۔ صرف سندھ باقی رہ گیا تھا جسے اگرچہ مہاراجہ فتح کرنا چاہتا تھا، لیکن وہاں انگریزی مفادات کی وجہ سے مہاراجہ اپنے ارادے سے باز رہا۔

1834ء تک مہاراجہ رنجیت سنگھ پشاور کے بارکزئی سرداروں ہی کو اس صوبے کا گورنر مقرر کرتا رہا لیکن انہوں نے کئی بار اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ اس لیے اس نے مئی 1834ء میں اپنے پوتے کنور نونہال سنگھ کو کشمیر کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا۔ سردار ہری سنگھ نلوہ کو بھی اس کے ہمراہ کیا۔ سکھ فوج نے بلا مزاحمت شہر پر قبضہ کر لیا۔ سردار سلطان محمد خان اور اس کا بھائی پیر محمد خان شہر سے دستبردار ہو گئے اور کنور نونہال سنگھ نے کشمیر کے پہلے سکھ گورنر کی حیثیت سے اختیارات سنبھال لیے۔ کابل کے حکمران سردار دوست محمد خان کو جب اپنے بھائیوں کی جبری علیحدگی کی اطلاع ملی تو اس نے کشمیر پر فوج کشی کی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ خود کمک لے کر کشمیر گیا۔ اس کی آمد کا سن کر سردار دوست محمد خان واپس چلا گیا۔ مہاراجہ نے سلطان محمد خان اور پیر محمد خان کو کوہاٹ کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا جس کی سالانہ آمدنی تین لاکھ تھی۔ اس کے علاوہ انہیں دوآبہ میں بھی پچیس ہزار کا تعلقہ دیا۔

مارچ 1837ء میں کنور نونہال سنگھ کی شادی ہوئی۔ جس سج دھج سے یہ شادی ہوئی وہ پنجاب کے عوام میں کافی عرصے تک بھلائی نہ جا سکی۔ اعلیٰ انگریزی حکام کو بھی دعوت نامے جاری کیے گئے۔ چنانچہ انگریزی افواج کے کمانڈر انچیف سر ہنری فین اور اس کی لیڈی نے اس شادی میں شرکت کی۔ بہت سی ریاستوں کے حکمران بھی شریک تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اس شادی پر دل کھول کر خرچ کیا۔ برات سردار شام سنگھ اٹاری والے کے ہاں گئی۔ اس نے بھی شایانِ شان طریقے سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ خوب تزک و احتشام سے یہ تقریب انجام پذیر ہوئی۔

1834ء میں سردار دوست محمد خان نے کنور نونہال سنگھ کو پشاور سے بےدخل کرنے کی کوشش کی تھی؛ جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اپریل 1837ء میں اس نے پھر پشاور پر چڑھائی کی۔ سردار ہری سنگھ نلوہ نے درہ خیبر کے دہانے پر افغان لشکر کو روکا جس کے نتیجے میں جمرود کے مقام پر دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی۔ سردار ہری سنگھ نلوہ اگلی صفوں میں اپنی فوج کی قیادت کر رہا تھا۔ اچانک اسے کئی

گولیاں لگیں اور وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کی موت کا سکھ فوج پر بہت برا اثر ا ہوا اور وہ پسپا ہو کر جمرود کے قلعے میں محصور ہو گئے۔ مہاراجہ کو جب اس ہزیمت کی اطلاع ملی تو اس نے سردار دھیان سنگھ کو بھاری کمک دے کر بھیجا۔ مہاراجہ خود بھی ساتھ گیا اور جہلم کے قریب رہتاس کے مقام پر جا کر مقیم ہو گیا۔ جب افغانوں کو معلوم ہوا کہ سکھوں کی کمک پہنچ گئی ہے تو وہ بغیر مزید جنگ کے واپس چلے گئے۔ یہ جنگ تاریخ میں 'جنگ جمرود' کے نام سے موسوم ہے۔

1838ء میں انگریزوں' سکھوں اور کابل کے سابق بادشاہ شاہ شجاع نے مل کر افغان پر حملہ کیا۔ اس حملے کا مقصد شاہ شجاع کو تختِ کابل پر بحال کرنا تھا۔ مہاراجہ اگرچہ جنگ میں انگریزوں کا اتحادی تھا' لیکن پھر بھی اس نے انگریز فوجوں کو اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ انگریز فوج بہاول پور' سندھ' درہ بولان اور قندھار کے راستے کابل پہنچی۔ شاہ شجاع دوبارہ تخت پر متمکن ہوا' لیکن ایک ہی برس بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ مہاراجہ اس مہم کی کامیابی کی خبر سننے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ یہ جنگ تاریخ میں جنگِ افغانستان کے نام سے معروف ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات:

مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک بڑے مضبوط اور توانا جسم کا مالک تھا' لیکن اس نے اپنی زندگی اس قدر مصروفیت میں بسر کی اور اتنا زیادہ کام کیا کہ وہ وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا۔ اس کے قوی اعضاء مضحل ہو گئے۔

1834ء میں مہاراجہ کو پہلی بار فالج ہوا' لیکن فقیر نور الدین اور عزیز الدین کے علاج کی وجہ سے وہ مرنے سے بچ گیا۔ اس حملے کا اثر اس کے ناطقے پر ہوا' یعنی وہ تسلسل سے گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ مکمل صحت یاب نہ ہو سکا۔ سلطنت کے کام بھی اس نے بیشتر اپنے وزیر اعظم سردار دھیان سنگھ کے سپرد کر رکھے تھے۔

اپریل 1839ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا۔ یہ انتہائی شدید حملہ

تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے محسوس کر لیا کہ اب وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا چنانچہ اس نے اپنے بڑے لڑکے کھڑک سنگھ کو اپنا جانشین نامزد کر کے تمام درباریوں کو اس کے ساتھ وفادار رہنے کی ہدایت کی۔ مہاراجہ نے اپنی مملکت کے تمام حصوں میں اس کی ولی عہدی کی اطلاع بھجوا دی' تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ مہاراجہ نے سردار دھیان سنگھ کو کھڑک سنگھ کا سرپرست اور وزیر اعظم مقرر کیا۔

روز بروز مہاراجہ کی حالت بگڑتی گئی۔ بالآخر وہ 20 جون 1839ء کو فوت ہو گیا۔ دوسرے دن مہاراجہ کی آخری رسومات نہایت شاہانہ طریقے سے ادا کی گئیں۔ ارتھی کا جلوس شہر کے بازاروں سے گزرا۔ تمام خالصہ دربار اور عمائدینِ شہر کے علاوہ عوام کی بہت بڑی تعداد ساتھ تھی۔ میت دریائے راوی کے کنارے چتا کے سپرد کی گئی۔ مہاراجہ کے ساتھ اس کی چار رانیاں اور متعدد داسیاں بھی ستی ہوئیں۔ گیارہ دن تک مہاراجہ کا سرکاری سطح پر سوگ منایا گیا۔

مہاراجہ کی شخصیت اور کردار:

مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک ہمہ گیر اور پہلو دار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ایک بیدار مغز حکمران اور سخت کوش سپاہی تھا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے درباریوں پر اس کا دبدبہ رہتا تھا۔ مہاراجہ اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن قدرت نے اسے مثالی حافظہ عطا کیا تھا۔ اپنے حافظے کی بدولت اس نے اپنی اس کمی کو پورا کیا۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت کا ایک خاص پہلو ہر وقت تحقیق و جستجو میں لگے رہنا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ملاقات کرنے والے ہر ملکی و غیر ملکی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا۔ غیر ملکی سیاحوں سے وہ ان کے وطن اور راستے میں واقع مختلف ملکوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور پھر ان معلومات کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا۔ مہاراجہ بنفس نفیس ہر وقت مصروف رہتا۔ سلطنت کے معمولی معمولی کاموں میں ذاتی دلچسپی لیتا اور [illegible] ہی کے لیے ذاتی طور پر نگرانی کرتا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو سیر و شکار سے بے حد رغبت تھی۔ سپاہیانہ مشاغل اس کی فطرت میں داخل تھے۔ اعلیٰ نسل کے گھوڑے جمع کرنا اس کا پسندیدہ شغل تھا۔ وہ قدرتی مناظر کا دلدادہ تھا لیکن رہن سہن اور لباس کے معاملے میں بہت سادہ تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کو مذہب سے بیحد لگاؤ تھا۔ لاہور کے قلعے میں شیش محل کے اوپر دو ایک کمرے مہاراجہ نے بنوائے تھے۔ ان میں سے ایک کمرہ اس نے مذہبی امور کی ادائیگی کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ یہاں وہ ہر روز علی الصبح با قاعدگی سے گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنتا تھا۔ اس جگہ اس نے گورو گوبند سنگھ سے منسوب ایک 'کلغی' رکھی ہوئی تھی گرنتھ صاحب سننے کے بعد وہ اس کلغی کی زیارت کرتا اور اسے اپنے آنکھوں سے لگاتا۔ اس کے بعد مملکت کے کاموں میں مصروف ہو جاتا۔ مہاراجہ عموماً دربار صاحب امرتسر اور ترنتارن میں نذرانے پیش کیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اسے کانگڑہ کے جوالا مکھی مندر سے بہت عقیدت تھی۔ اس طرح وہ مسلمان صوفیاء کے مزاروں پر بھی حاضری دیتا۔ اس نے حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت موج دریا بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کی مرمت کے لیے ایک دفعہ بہت سا روپیہ دیا تھا۔ عام سکھوں کے برعکس اس میں تعصب بہت کم تھا اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا سلوک قابلِ تعریف تھا۔ اگر رنجیت سنگھ کے مسلمانوں سے رویہ کو اٹھارہویں صدی کے عمومی حالات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عہد مسلمانوں کے لیے آرام و آسائش کا عہد تھا۔ اگرچہ سکھ معاشرے کی طرف سے جو اب حکمران بھی تھا' مسلم آزاد حرکات ہوتی رہتی تھیں لیکن مجموعی حیثیت سے اس زمانے میں مسلمانوں کو کافی سہولتیں حاصل رہیں۔ دربار اور فوج میں سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ کئی مسلمان بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ان میں فقیر عزیز الدین کا مہاراجہ پر بہت اثر تھا۔ مہاراجہ بھی اس کا بہت احترام کرتا اور ہر داخلی و خارجی معاملے میں اسی سے مشورہ کرتا تھا۔ حاصلِ کلام یہ کہ مہاراجہ ہر قابل شخص کو اپنے دربار کی زینت بناتا تھا۔ اس بات کی تفریق کیے بغیر کہ اس کی کس مذہب سے وابستگی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مہاراجہ کے دربار میں سکھ' مسلمان' ہندو

اور عیسائی سب موجود تھے اور مہاراجہ ہر ایک کو اس کی اہلیت کے مطابق فرائض سونپتا تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر مہاراجہ کی سلطنت کو آج کل کی سیاسی اصطلاح میں لادینی ریاست کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا' مہاراجہ رنجیت سنگھ اگرچہ تعلیم یافتہ نہ تھا لیکن وہ صاحبانِ علم کا قدردان تھا۔ قدرت کی طرف سے اسے بہت اچھا ذہن ودیعت ہوا تھا۔ اس میں حکمرانی کا وصف قدرتاً تھا اور اس میں رہنمائی کی صلاحت خداداد تھی۔ وہ ایک باریک بین سیاستدان تھا۔ اہم اور نازک سیاسی امور میں اس کی رائے قابلِ عمل ہوتی تھی۔ وہ حالات کے رخ کو پہچانتا تھا۔ پہلے تو اس کی کوشش یہ ہوتی کہ حالات کو اپنے موافق بنا لے اور اگر حالات اس کے موافق نہ ہوتے تو وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتا تھا۔ حتی الوسع تصادم سے گریز کرتا لیکن جب اسے یہ احساس ہو جاتا کہ اب تصادم ناگزیر ہے تو پھر بلا تاخیر اقدام کر گزرتا۔ یعنی مہاراجہ بہت بڑا وقت شناس تھا۔

ایک بلند پائے کا مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ میں سپاہیانہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ وہ دلیر اور سخت کوش سپاہی تھا۔ معرکہ کارزار میں ہمیشہ اگلی صفوں میں رہ کر فوجوں کی قیادت کرتا جس سے اس کی فوج پر بہت اچھا اثر پڑتا تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کا سپہ سالار تھا۔ اس کے سپاہی دل و جان سے اس کا احترام کرتے تھے۔ وہ خود بھی ان کی نفسیات کو بخوبی سمجھتا تھا۔

مہاراجہ کا فوجی نظام:

مہاراجہ رنجیت سنگھ فوجی امور کا بہت ماہر تھا۔ اسے فوجی نظم و نسق کے متعلق وسیع معلومات اور تجربہ حاصل تھا۔ شروع ہی سے وہ فوج پر خصوصی توجہ دیتا تھا' کیونکہ اس زمانے میں حالات ہی ایسے تھے کہ فوجی طاقت ہی سیاسی اقتدار کے استحکام کی ضمانت تھی۔ چنانچہ مہاراجہ نے فوج کی تعمیر و ترقی پر بہت توجہ دی۔ اسے وراثت میں ایک نہایت معمولی فوج ملی

تھی لیکن اس نے اپنی ذاتی کوششوں کی بنا پر ایک عظیم فوج تیار کر لی۔ اس کے سپاہی پرانے روایتی انداز میں جنگ کرتے تھے۔ 1809ء میں مہاراجہ نے امرتسر میں انگریزی قواعد دان فوج کے دستے اور نہنگ اکالیوں کے درمیان ایک معرکہ دیکھا جس کے بعد مہاراجہ اس نتیجے پر پہنچا کہ انگریزی تربیت یافتہ فوج کی کارکردگی پرانی روش کی حامل فوجوں کی نسبت بہت عمدہ ہے۔ اسی دن سے مہاراجہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسے بھی اپنی فوج میں حرب و ضرب کے اس نئے طریق کو ضرور رائج کرنا چاہیئے۔ دوسرے مہاراجہ کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر خالصہ فوج کو انگریزوں سے جنگ آزما ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اس متوقع صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ سکھ فوج بھی ویسی ہی تربیت یافتہ ہو جیسی کہ انگریزی فوج ہے تا کہ برابر کی صلاحیتوں میں مقابلہ ہو۔ چنانچہ اس نے انگریزی فوج کے کچھ ایسے ہندوستانی سپاہیوں کو جواب ملازمت سے سبکدوش یا فرار ہو چکے تھے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا تا کہ وہ مہاراجہ کی فوج کو جدید طریقے سے تربیت دیں۔ مقامی سپاہی ان کو تربیت دینے والوں کو 'پوربیے' کہتے تھے۔

ابتداء میں مہاراجہ کو بہت دشواریاں پیش آئیں۔ سکھ سپاہی گھوڑے پر سوار ہو کر لڑنے کے عادی تھے اور ایک صدی کے سیاسی عمل اور ردِ عمل کی وجہ سے بہت آزاد منش ہو چکے تھے۔ ان کے لیے کسی حکم کا ماننا ناممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ وہ ہر روز گھنٹوں پابندی سے قواعد کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے فوج کے اس نئے شعبے میں شامل ہونے سے انکار کر دیا لیکن مہاراجہ بھی مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ وہ جدید فوج تیار کر کے ہی دم لے گا۔ چنانچہ اس نے اعلان کیا کہ جو سپاہی اس نئی فوج میں شامل ہو گا اسے تنخواہ اور دیگر مراعات کے علاوہ جاگیر بھی دی جائے گی۔ اس طرح کے لالچ دے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فوج کی تنظیمِ نو کا ڈول ڈال دیا اور آخر کار وہ جدید فنونِ جنگ سے آراستہ ایک بڑی فوج تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہلے تو یہ پوربیے ہی سکھ فوج کو تربیت دیتے رہے لیکن بعد میں مہاراجہ نے اطالوی اور

فرانسیسی افسروں کو بھی ملازم رکھا اور ان سے فوج کو تربیت دلائی۔ ان افسروں میں جنرل ونٹورا، جنرل ایلارڈ، جنرل ایوی ٹیبل وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جنرل ونٹورا اور جنرل ایلارڈ مارچ 1822ء میں لاہور آئے۔ جنرل ونٹورا اطالوی باشندہ تھا جبکہ ایلارڈ کا تعلق فرانس سے تھا۔ یہ دونوں نپولین کی فوج میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ جب 1800ء میں نپولین کو شکست ہوئی اور اس کی فوج منتشر ہوگئی تو یہ دونوں پھرتے پھراتے ایران اور افغانستان کے راستے پنجاب میں آ گئے۔ یہاں یہ فقیر عزیز الدین کے توسط سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس حاضر ہوئے۔ مہاراجہ ان کے ساتھ التفات سے پیش آیا اور سرکاری طور پر ان کی رہائش وغیرہ کا بندوبست کیا۔ کچھ دن بعد انہوں نے سکھ فوج میں نوکری کی درخواست کی۔ مہاراجہ کو چونکہ ان کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں لہٰذا مہاراجہ نے کچھ عرصہ ان کی درخواست کو التواء میں رکھا لیکن بعد میں جب مہاراجہ کو ان کے متعلق یقین ہوگیا کہ ان کی درخواست خلوصِ نیت پر مبنی ہے تو اس نے شرائط نامے کے تحت انہیں اپنی فوج میں شامل کرلیا۔ ان دونوں اور ان کے بعد آنے والے اور بہت سے غیر ملکی باشندوں کو بھی یہی شرائط نامہ قبول کرنے کی صورت میں ملازمتیں دی گئیں۔ اس شرائط نامے کے اہم نکات یہ تھے:

1- اگر کبھی لاہور دربار اور کسی مغربی طاقت میں جنگ کی نوبت آ گئی تو ان لوگوں کو لاہور دربار کا وفادار رہنا ہوگا۔
2- ان لوگوں کو مغربی ممالک میں مقیم اپنے اعزاء واقرباء سے براہِ راست خط و کتابت کی اجازت نہ ہوگی۔ ان کے تمام خطوط حکومت کی وساطت سے آیا جایا کریں گے۔
3- ان لوگوں کو لازماً داڑھی بڑھانا ہوگی۔
4- گائے کا گوشت کھانے اور تمباکو استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے۔
5- اگر یہ لوگ کسی ہندوستانی خاتون سے شادی کرلیں تو یہ حکومت کے نزدیک ایک مستحسن فعل ہوگا۔

جنرل ونٹورا کو پیدل فوج میں اور جنرل ایلاڈ کو گھوڑ اسوار فوج میں متعین کیا گیا۔ ان کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ خالصہ فوج کے دونوں شعبوں کو جدید خطوط پر منظم کریں۔ جنرل ونٹورا کو رہائش کے لیے انارکلی مقبرہ دیا گیا۔ اس کے آس پاس بیرکیں بنا دی گئیں جس میں اس کا ڈویژن مقیم ہوا۔ اس جگہ آج کل پنجاب کا سول سیکرٹریٹ ہے اور انارکلی کے مقبرے کو حکومت پنجاب کا ریکارڈ آفس بنایا گیا ہے۔ جنرل ایلارڈ کا ڈویژن اس سے کچھ فاصلے پر پرانی انارکلی میں تھا ان یورپی ماہرینِ جنگ نے بڑی محنت سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کو نئے انداز سے آراستہ کیا۔ چنانچہ 1839ء میں مہاراجہ کی وفات کے وقت اس جدید قواعد دان پیدل فوج کی تعداد ستائیس ہزار تھی اور گھوڑ سوار فوج کی تعداد پانچ ہزار تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے توپخانے کی ترقی پر بھی مساوی توجہ دی۔ لاہور پر قبضے کے وقت اس کے پاس چار معمولی قسم کی توپیں تھیں۔ مہاراجہ کو احساس تھا کہ اس جدید ہتھیار کے بغیر کوئی بھی لڑائی جیتنا ناممکن ہے لہٰذا اس نے اطراف و جواب سے لائق کاریگر بلائے۔ بھاری رقوم سے توپ سازی کے کارخانے قائم کیے۔ جن میں چھوٹی بڑی ہر جسامت کی توپیں تیار کی جاتی تھیں اور یہ توپیں اپنی کارکردگی کے لحاظ سے ولایتی توپوں سے کسی صورت میں بھی کمتر نہ تھی۔ 1939ء میں چھوٹی بڑی توپوں کی مجموعی تعداد چار سو ستر تھی جبکہ ان توپوں کا عملہ پانچ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ توپخانے میں بہت سے مقامی اور بیرونی اعلیٰ افسر تھے۔ ان میں جنرل الٰہی بخش، غوثے خان، سردار لہنا سنگھ مجیٹھیہ اور جنرل کورٹ خصوصیت سے معروف ہیں۔ سردار لہنا سنگھ مجیٹھیہ فنِ توپ سازی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس نے سکھ توپخانے کو بہت ترقی دی۔

جدید رسالہ اور پیدل فوج کے علاوہ قدیم فوج کا ایک حصہ قدیم گھوڑ اسوار سپاہیوں پر مشتمل تھا اس میں اکثریت ان سپاہیوں کی تھی جو پہلے مختلف ریاستوں کے ماتحت تھے، لیکن مہاراجہ نے ان ریاستوں کو فتح کیا تو ان لوگوں کو اس نے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ اس فوج کی تعداد گیارہ ہزار تھی۔

یہ تو باقاعدہ فوج تھی جسے سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ بے قاعدہ فوج بھی خالصہ دربار کے ماتحت تھی جسے سرکاری اصطلاح میں 'فوجِ بے آئین' کہا جاتا تھا۔ اصل میں یہ ان جاگیرداروں اور نوابوں کی فوج تھی جو مہاراجہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر چکے تھے اور لاہور دربار کو خراج ادا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو کچھ فوج رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ جس کا ایک حصہ ان کو بوقتِ ضرورت مہاراجہ کی تحویل میں دینا پڑتا تھا لیکن ان کی تنخواہ ان کی ریاست ہی کے ذمہ ہوتی تھی۔ اس قسم کی فوج کی تعداد اندازاً چھ ہزار تھی۔

علاوہ ازیں فوج کا ایک بڑا حصہ مملکت کے مختلف قلعوں میں مستقبلاً رہتا تھا۔ یہ کل فوج ملا کر دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کل فوجی طاقت قریباً ستر ہزار تھی۔ جس کی تنخواہ پر سالانہ ایک کروڑ روپیہ خرچ آتا تھا جبکہ ہر سال تقریباً آٹھ لاکھ روپیہ دیگر فوجی ضروریات یعنی وردی اور گولہ بارود پر صرف کیا جاتا تھا۔ یہ سارا خرچ مہاراجہ کی آمدنی کا چالیس فیصد تھا۔

مہاراجہ کا سیاسی نظام:

اٹھارہویں صدی کا نصف آخر پنجاب میں مکمل سیاسی خلفشار سے عبارت ہے۔ یہ سرزمین ان دنوں حقیقتاً بے آئین تھی۔ اس دور میں یہ خطہ اندرونی اور طالع آزماؤں کی ہوسناکیوں کے لیے موزوں ترین جولانگاہ تھی۔ سکھوں کے جنگجو جتھوں نے تقریباً پورے پنجاب پر اپنا تسلط جمالیا اور ایک منظم سکھ گردی کا آغاز ہو گیا۔ عوام خصوصاً مسلمانوں پر اس زمانے میں بہت ظلم و تشدد ہوا' کیونکہ سکھ مسلمانوں کے بارے میں بیحد مذہبی تعصب رکھتے تھے۔

ان حالات میں رنجیت سنگھ نے اقتدار سنبھالا۔ وہ خود اسی نظام کی پیداوار تھا۔ وہ گوجرانوالہ کا مسلدار تھا۔ لیکن مختلف ذہنیت رکھتا تھا۔ اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد روایتی تنگ نظری اور مسلم دشمنی کی بجائے رواداری اور باہمی مفاہمت کو اپنی حکمتِ عملی کی

بنیاد بنایا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے ہم عصروں کے طرزِ فکر میں دوسرا اہم اختلاف یہ تھا کہ مہاراجہ بالکل ابتداء ہی سے عزم کر چکا تھا کہ وہ پورے پنجاب کو اپنے زیرِ نگیں کرے گا جبکہ اس کے معاصرین اپنے دائرہ اقتدار کو وسیع کرنے کے لیے کچھ زیادہ سنجیدہ نہ تھے۔ ایک اور اہم فرق یہ ہے کہ مہاراجہ ایک مستعد انسان تھا جبکہ دوسرے سکھ سردار پرلے درجے کے تساہل کش واقع ہو۔ اس لیے مہاراجہ کو اپنے عزائم پورے کرنے میں بہت کم وقت لگا۔ اس کے علاوہ مہاراجہ میں قوتِ فیصلہ کی فروانی تھی وہ حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیتا اور پھر فوراً اقدام کرتا۔ یعنی جب کوئی فیصلہ کر لیتا تو پھر اس پر بلا تاخیر عمل کرتا اور سیاسی طالع آزماؤں کی طرح اپنا مقصد حاصل کرنے میں کسی قسم کی اخلاقی اقتدار کا لحاظ بھی نہ کرتا تھا۔ اس بات کی تائید اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ جب اس کی عظیم محسنہ رانی سدا کور نے اس کے لیے خطرہ پیدا کرنا چاہا تو مہاراجہ نے اس کے تمام احسانات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کی وہ یقیناً مستحق نہ تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ایک ایسا سیاسی نظام قائم کیا جس کا عنوان اس کی اپنی ذات تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک جاندار شخصیت اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اگرچہ اس کے دربار میں قابل مشیر اور وزیر موجود تھے لیکن مہاراجہ نے ہمیشہ اپنی ذات پر ہی بھروسہ کیا۔ اس وجہ سے نظامِ حکومت میں 'مرکزیت' کا رجحان ترقی پاتا گیا۔ معمولی معمولی کاموں میں مہاراجہ کی ذاتی مداخلت کے باعث اعیانِ سلطنت کا اپنے آپ پر اعتماد نہ رہا اور مہاراجہ کی ذات ہی ملک کے پورے سیاسی نظام کی روحِ رواں بن گئی۔ مہاراجہ کی زندگی تک تو یہ طرزِ حکومت بڑی کامیابی سے بروئے کار رہا لیکن اس کے بعد اس کے جانشینوں میں کوئی بھی اس جیسی خصوصیات کا حامل نہ تھا لہٰذا 'مرکز گریز' رجحانات تیزی سے پھلے پھولے اور دو تین برس میں سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا' یعنی خالصہ سلطنت کی بنیاد مکمل طور پر ایک شخصیت پر منحصر تھی اور جب شخصیت نہ رہی تو سلطنت

بھی نہ رہی۔ سکھ حکومت کے زوال کے اسباب میں سب سے اہم سبب یہ ہی تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے متبادل قیادت کی تربیت پر قطعاً توجہ نہ دی جس کا نتیجہ ایک سیاسی خلاء کی صورت میں سامنے آیا اور اس خلاء کو پورا کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قائم کردہ سیاسی نظام میں اس کی سفارتی کاوشیں اہم مقام رکھتی تھیں۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ اوّلیت مہاراجہ ہی کو حاصل ہے۔ اس نے ہمسایہ ریاستوں میں اپنے مستقل سفیر بھیجے۔ انگریزوں کے ہاں بھی لدھیانے میں اس کا سفیر موجود تھا اور کابل میں بھی اس کا سفارت خانہ قائم تھا۔ اس طرح انگریزوں کا ایک نمائندہ بھی خالصہ دربار میں رہتا تھا۔ یہ سفیر مہاراجہ کو تمام واقعات و حالات کی اطلاع دیتے رہتے۔ اپنی انہی کوششوں کی وجہ سے مہاراجہ ایک بہت باخبر حکمران تھا۔ مہاراجہ کی حکومت کے استحکام میں اس کے سفارت خانوں کا کافی حصہ ہے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد

کھڑک سنگھ:

مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے لڑکے کھڑک سنگھ کو اپنا جانشین نامزد کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کی مرگ پر آخری رسومات ادا کرنے کے بعد تمام خالصہ دربار نے کھڑک سنگھ کو 'مہاراجہ' کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ کھڑک سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے متضاد خصائل رکھتا تھا۔ اس میں انتظامی صلاحیتیں نام کو بھی نہ تھی وہ ہر وقت افیون اور شراب کے نشے میں دنیا و مافیھا سے لاتعلق پڑا رہتا۔ اسے کاروبارِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ سردار دھیان سنگھ کو وزیر اعظم بنایا جائے۔ لیکن کھڑک سنگھ نے اس وصیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اپنے ایک نااہل خوشامدی دوست چیت سنگھ کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس وجہ سے خالصہ دربار کے تمام سربرآوردہ افراد اس کے خلاف ہو گئے۔ اس مخالفت میں پیش پیش سندھیانوالہ سرداران دھیان سنگھ' گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ کھڑک سنگھ کی جگہ اس کے بیٹے نونہال سنگھ کو سربراہِ حکومت بنایا جائے۔ انہوں نے اس ضمن میں کھڑک سنگھ کی بیوی اور نونہال کی ماں رانی چاند کور کو بھی ساتھ ملایا اور بالآخر 18 اکتوبر 1839ء کو کھڑک سنگھ کا تختہ الٹ دیا گیا۔ رانی چاند کور کو سفارش پر اس کی تو جان بخشی کر دی گئی۔ لیکن اس کے وزیر اعظم چیت سنگھ کو قتل کر دیا گیا۔

نونہال سنگھ:

دھیان سنگھ نے نونہال سنگھ کو مہاراجہ بنا دیا۔ اس وقت نونہال سنگھ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اس سے قبل وہ پشاور کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس میں بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی جانشینی کی کما حقہ استعداد نہ تھی لیکن پھر بھی نظامِ حکومت جیسے تیسے چلتا رہا۔ اس کے ایک سالہ عہد میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہ ہوا۔ 5 نومبر 1840ء کو اس کا باپ طویل علالت کے بعد مر گیا۔ نونہال سنگھ باپ کا کریا کرم کر کے واپس آ رہا تھا کہ ایک بوسیدہ عمارت اس پر آ گری۔ اس حادثے کے نتیجے میں نونہال سنگھ اور اس کے کئی ساتھی ہلاک ہو گئے۔ یوں باپ بیٹا ایک ہی دن اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔

رانی چاند کور:

اب راجہ دھیان سنگھ نے نونہال سنگھ کی ماں رانی چاند کور کے مقتدر ہونے کا اعلان کر دیا، لیکن دربار کے اکثر سرداروں نے اس کی حمایت سے پہلوتہی کی۔ یہ لوگ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک دوسرے لڑکے کنور شیر سنگھ کو خالصہ تخت و تاج کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ بعد ازاں راجہ دھیان سنگھ بھی مہارانی کی حمایت سے دستکش ہو گیا اور اس نے مہارانی سے کہا کہ حالات چونکہ اس کے موافق نہیں ہیں اس لیے وہ اقتدار چھوڑ دے۔ لیکن اس نے اپنے وزیر اعظم عطر سنگھ، اجیت سنگھ اور گلاب سنگھ کی شہ پر اس مشورے کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ بالآخر خالصہ دربار کے مخالف عناصر نے راجا دھیان سنگھ کی قیادت میں نئی حکومت سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا اور شیر سنگھ کو بٹالے سے بلا بھیجا، جہاں وہ اپنی جاگیر میں مقیم تھا۔ شیر سنگھ اپنی فوج کے ساتھ لاہور پہنچا اور بُدھو کے آوے، پر چھاؤنی ڈال دی۔ اس وقت دھیان سنگھ جموں گیا ہوا تھا۔ شیر سنگھ نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اس سے سکھوں کے درمیان پہلی خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ شیر سنگھ نے اپنی ہلکی توپیں بادشاہی مسجد کے میناروں پر چڑھا دیں اور وہاں سے قلعے کی

اندرونی تنصیبات پر گولہ باری شروع کر دی۔

جب رانا دھیان سنگھ کو جموں میں اس خانہ جنگی کی اطلاع ملی تو وہ فوراً لاہور آیا اور اس نے شیر سنگھ کو مشورہ دیا کہ آپس میں کشت و خون مناسب نہیں ہے لہٰذا بات چیت سے معاملے کو طے کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اس نے قلعے میں اپنے بھائی گلاب سنگھ کو بھی اسی قسم کا پیغام بھیجا۔ چنانچہ جنگ رک گئی اور مذاکرات ہونے لگے۔ انجام کار فریقین میں یہ طے پایا کہ مہارانی چاند کور تخت سے دستبردار ہو جائے لیکن اس کے ساتھ شایانِ شان سلوک کیا جانا چاہیے۔ شیر سنگھ نے یہ شرط منظور کر لی اور اسے گزر بسر کے لیے ایک بڑی جاگیر دے دی۔

شیر سنگھ:

18 جنوری 1841ء کو شیر سنگھ نے اختیارات سنبھال لیے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اولاد میں سے یہ شہزادہ' اپنے پیش روؤں کی نسبت صاحبِ تدبیر تھا۔ فوج اور عوام میں بھی ہر دلعزیز تھا۔ اس نے لدھیانے کے انگریزی سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ سکھ فوج کے یورپین افسروں سے بھی اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سیاسی عناصر اور فوج کی قوت تقریباً برابر تھی اور حالات مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شخصیت کی موجودگی کی وجہ سے متوازن تھے' لیکن اس کے بعد سیاسی عناصر آہستہ آہستہ کمزور ہوتے گئے۔ اور فوج قوت پکڑتی گئی۔ مہاراجہ شیر سنگھ مسلح افواج ہی کے تعاون سے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اس کے بعد فوج پر نہ صرف دربار کے سیاسی عناصر کا اثر بالکل ختم ہو گیا بلکہ انہوں نے اپنے سرداروں کا حکم ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ جب شیر سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تو حکام کے منع کرنے کے باوجود سکھ فوج نے شہر میں لوٹ مار اور غارت گری شروع کر دی۔

سکھا شاہی:

یہاں سے پنجاب میں 'سکھا شاہی' کی ابتداء ہوتی ہے۔ سکھ فوج سمجھتی تھی کہ موجودہ حکومت اسی کے بل بوتے پر قائم ہے' لہٰذا اب وہ جو جی چاہیں کریں کسی کو ان کی غیر آئینی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ چنانچہ یہی ہوا انہوں نے اپنے کئی یورپین افسروں کو گولی ماردی۔ ان سے ڈر کر بہت سے یورپی افسر یا تو ستلج پار چلے گئے یا افغانستان کی طرف بھاگ گئے۔ جن میں جنرل ایوے ٹیبل کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے' جو فوجی سپہ سالار ہونے کے علاوہ پشاور کا گورنر بھی تھا۔ ہلاک شدگان میں کئی مقامی سردار بھی شامل تھے۔ غرضیکہ شیر سنگھ کے عہد میں پنجاب میں ایسے حالات پیدا ہو گئے جن میں غیر سکھ رعایا کی جان' مال اور آبرو محفوظ نہ رہی۔ سکھ فوجی جس کو چاہتے لوٹ لیتے۔ مزاحمت کرنے والے کو قتل کر دیتے' کوئی داد فریاد نہ تھی۔ مختصر یہ کہ پنجاب کی سرزمین ایک بار پھر مکمل بدنظمی اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گئی۔ عام سپاہیوں نے اعلان کر دیا کہ اب وہ دربار کے کسی نمائندے تو کیا اپنے افسروں کی برتری بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ انہوں نے اپنے میں سے کچھ سیانے سپاہیوں کو اپنا پنچ مقرر کر لیا۔ سپاہی اپنے آپ کو صرف انہی کے حکم کا پابند سمجھتے تھے۔ حکومت ان پنچوں کے سامنے بے بس تھی۔ سپاہیوں نے از خود ایک پنچایت بھی تشکیل دی' جس کی حیثیت ڈیفنس کونسل کی سی تھی۔ حکومت کو اگر کوئی فوجی کارروائی کرنا ہوتی تو وہ براہِ راست فوج استعمال نہیں کر سکتی تھی بلکہ اس کے لیے اسے پنچایت سے درخواست کرنا پڑتی اس طرح نہ تو رازداری قائم رہ سکتی اور نہ ہی اقدام بروقت ہوتا۔ پنچایت عموماً اس وقت اجازت دیتی جب اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔

ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے تو مملکت کا سیاسی نظام ہی مفلوج ہوا تھا' اب فوج کا اندرونی نظم وضبط بھی مفقود ہو گیا جس کی وجہ سے خالصہ سلطنت روز بروز زوال سے قریب ہوتی گئی۔

شیر سنگھ کے عہد میں سندھیانوالہ سرداروں کو دربار میں بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل تھا۔ شیر سنگھ کے لیے انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح گلاب سنگھ اور لہنا سنگھ اور اجیت سنگھ کو حسب دل خواہ مرتبے دیئے گئے لیکن اجیت سنگھ اور لہنا سنگھ وغیرہ پھر بھی دل سے شیر سنگھ کے ساتھ مخلص نہ تھے۔ چنانچہ ایک دن جب مہاراجہ شیر سنگھ بارہ دری شاہ بلاول کے نزدیک فوج کو مشقیں کرتے دیکھ رہا تھا تو سردار اجیت سنگھ اس کے پاس آیا اور اس نے مہاراجہ کو یہ کہتے ہوئے ایک بندوق پیش کی کہ یہ جدید ترین رائفل حال ہی میں انگلستان سے تیار ہو کے آئی ہے۔ شیر سنگھ نے اپنے ہاتھ میں لیے بغیر ہی اس کا معائنہ کیا جب شیر سنگھ بندوق دیکھنے میں منہمک تھا تو اجیت سنگھ نے اس کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے بندوق چلادی، جس سے شیر سنگھ موقع پر ہی مر گیا۔ یہ واقعہ 15 ستمبر 1843ء کو پیش آیا۔

دلیپ سنگھ:

شیر سنگھ کو قتل کرنے کے بعد باغیوں نے اس کے کمسن لڑکے پرتاب سنگھ کو بھی گولی مار دی اور پھر بڑی چالاکی سے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ وہاں انہوں نے راجا دھیان سنگھ کو ہلاک کیا۔ جب دھیان سنگھ کے لڑکے راجا ہیرا سنگھ کو اس شورش کا علم ہوا تو وہ اپنی فوج کے ساتھ میدان میں آ گیا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے چھوٹی توپیں شاہی مسجد کے میناروں پر چڑھا کر قلعہ کے اندر گولہ باری شروع کر دی۔ باغیوں نے اپنے آپ کو مقابلے کے ناقابل پایا اور ہتھیار ڈال دیے۔ اسی اثناء میں باغیوں کے سرغنے لہنا سنگھ اور اجیت سنگھ مارے گئے اور قلعہ پر ہیرا سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ 18 ستمبر 1834ء کو ہیرا سنگھ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے لڑکے دلیپ سنگھ کو تخت نشین کیا اور خود وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ اس وقت دلیپ سنگھ کی عمر چھ سال تھی۔

ہیرا سنگھ نے فوج کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھا دیں، لیکن بدنظمی اور امراء کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے خزانہ خالی تھا اور اتنی رقم بھی نہ تھی جس سے فوج کی

تنخواہ ادا ہو سکتی۔ اس مسئلے کو اس نے اپنے ایک مشیر پنڈت جھلا کی مدد سے اس طرح حل کیا کہ تمام علاقہ داروں کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کی جائے اور جس کے ذمے جو کچھ واجب الادا ہو اس سے سختی کے ساتھ وصول کیا جائے۔ پنڈت جھلا نے ان احکامات پر پوری طرح عمل کر کے مالیاتی بحران پر تو قابو پا لیا، لیکن اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے تمام سربرآوردہ سردار اس کے خلاف ہو گئے اور اس سے انتقام لینے کے لیے آپس میں صلاح مشورے کرنے لگے۔ دربار کا ایک مقتدر سردار سچیت سنگھ ناراض ہو کر جموں چلا گیا۔

مملکت کے تمام اختیارات وزیر اعظم ہیرا سنگ کے ہاتھ میں تھے۔ وہ جو چاہتا تھا کرتا۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی تھی۔ ہیرا سنگھ نے کئی ایسے اقدامات کئے جن کی وجہ سے اس کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوا۔ اس نے مہاراجہ گلاب سنگھ کے ذریعے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دو لڑکوں کشمیرا سنگھ اور پشاورا سنگھ کے خلاف کارروائی کی، جس کے باعث ان دونوں کو سیالکوٹ سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہ علاقہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہی ان کو بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ اس حرکت کی وجہ سے عوام کی اکثریت ہیرا سنگھ سے بدظن ہو گئی۔ انگریز بھی ہیرا سنگھ کو پسندیدہ آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے مخالفین کی ہمت افزائی کی اور انہیں اس کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا۔ اس کی اطلاع ہیرا سنگھ کو بھی مل گئی۔ ایک دن جب اس گروہ کے کئی سرکردہ افراد بھائی ویر سنگھ کے ہاں بیٹھے آپس میں مشورہ کر رہے تھے تو ہیرا سنگھ نے فوج بھیج کر اس مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ان لوگوں نے مزاحمت کی تو فوج نے گولہ باری کر کے مکان تباہ کر دیا، جس کے نتیجے میں شہزادہ کشمیرا سنگھ، بھائی ویر سنگھ اور عطر سنگھ سندھیانوالہ کے علاوہ بہت سے آدمی ہلاک ہوئے۔ ہیرا سنگھ کے اس اقدام کا بھی سکھ معاشرے نے برا منایا، کیونکہ سکھ بھائی ویر سنگھ کا بہت احترام کرتے تھے۔

اس واقعے کے بعد عوام نے کھلم کھلا حکومت پر تنقید شروع کر دی۔ ان کی نفرت کا خاص نشانہ ہیرا سنگھ اور اس کا مشیر پنڈت جھلا تھے۔ ہیرا سنگھ نے محسوس کیا کہ اب وہ مزید

حکومت نہیں کر سکتا۔

ایک دن اس نے اپنے گروہ سے مشورہ کیا اور تمام خزانہ وغیرہ سمیٹ کر رات کے وقت ٹکسالی دروازے کے راستے سے نکلے اور دریا عبور کر گئے۔ جلد ہی ان کے مخالف عنصر کو بھی ان کے فرار کا علم ہو گیا۔ انہوں نے تعاقب کیا اور شہر سے بارہ میل دور انہیں جا لیا۔ اس تعاقب میں آنے والے دستے کی قیادت مہاراجہ دلیپ سنگھ کا معاون جواہر سنگھ اور خالصہ دربار کا ایک اہم فرد سردار شام سنگھ اٹاری والا کر رہے تھے۔ جب یہ لوگ ہیرا سنگھ وغیرہ تک پہنچے تو انہوں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو تو وہیں قتل کر دیا لیکن مال اسباب قابو نہ کر سکے۔ یہ مال سپاہیوں نے لوٹ لیا، جس کی وجہ سے خزانے کا بہت کم حصہ واپس لایا جا سکا۔ یہ واقعہ اکیس دسمبر 1844ء کی رات کو رونما ہوا۔

ہیرا سنگھ کے بعد دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ نے وزارتِ عظمیٰ سنبھالی اور اس نے لال سنگھ کو خالصہ افواج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ دلیپ سنگھ کی عمر چونکہ بہت کم تھی، لہٰذا اس کے تمام اختیارات اس کی ماں رانی جنداں ہی استعمال کرتی تھی اور نظامِ حکومت میں اسے ہی مرکزی اہمیت حاصل تھی۔

نئی حکومت نے فوراً کشمیر پر چڑھائی کا فیصلہ کیا کیونکہ راجا گلاب سنگھ باغیانہ روش اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس سے قبل جواہر سنگھ فوج کو انعام واکرام سے اپنے ڈھب پر لا رہا تھا۔ فوج کے پنچ اس کے حامی بن چکے تھے۔ اس لیے اسے اپنے اس فیصلے پر عمل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ چنانچہ ایک بڑی فوج سردار شام سنگھ، سردار میوہ سنگھ مجیٹھیہ، سلطان محمد خان اور فتح سنگھ مان کی قیادت میں کشمیر کی طرف روانہ ہوئی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ گلاب سنگھ تین کروڑ روپیہ ادا کرے۔ راجا گلاب سنگھ نے اپنی فوج مقابلے کے لیے بھیجی۔ جموں کے نواح میں جنگ ہوئی، جس میں سرکاری فوج کا ایک اہم افسر فتح سنگھ مان ہلاک ہو گیا اس پر سکھ برافروختہ ہو گئے۔ جب گلاب سنگھ نے محسوس کیا کہ وہ مزید مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور خود کو خالصہ فوج کے پنچوں کے سامنے پیش کر دیا کہ وہ

فتح سنگھ مان کے قتل کے جرم میں جو سزا مناسب سمجھیں دیں۔ اس نے فتح سنگھ کی ہلاکت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا کہ وہ لاہور دربار کا سچا خیر خواہ ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنا کافی سارا روپیہ سکھ سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اپریل 1845ء میں وہ خود لاہور آیا۔ یہاں اس کا اچھی طرح سے استقبال کیا گیا۔ رانی جنداں نے اسے شرف باریابی بخشا اور اس کی پچھلی خطاؤں کو معاف کر دیا۔

10 جولائی 1845ء کو مہاراجہ دلیپ سنگھ کی نسبت سردار چتر سنگھ اٹاری والے کی لڑکی سے طے پائی۔ ملتان کا قابل گورنر سوان مل انہی دنوں میں فوت ہوا۔ اس کے عہد میں ملتان کے صوبے میں مکمل طور پر امن رہا اور خوب ترقی ہوئی۔ اب اس کے لڑکے مولراج کو ملتان کا حاکم بنایا گیا۔ دربار کی طرف سے اسے بھی بھاری نذرانہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا اور انکار پر اس کے خلاف فوج کشی کی گئی لیکن مولراج نے لڑائی مناسب نہ سمجھی اور ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ ادا کر کے تصادم کو ٹال دیا۔ اس پر لاہور دربار نے اسے ہی گورنر رہنے دیا۔ لیکن اس کے صوبے کی حدود میں کمی کر دی۔

اسی اثناء میں راجا گلاب سنگھ واپس جموں جا چکا تھا۔ اسے پانچ لاکھ روپے کی ادائیگی کے بعد جانے کی اجازت ملی تھی۔ ظاہری طور پر تو وہ لاہور دربار کو اپنی وفاداری کا یقین دلا گیا تھا، لیکن وہ اس بارے میں مخلص نہ تھا۔ چنانچہ اب اس نے شہزادہ پشاورا سنگھ کو حکومت کے خلاف ابھارا کہ تخت پر اس کا حق فائق ہے۔ اس ضمن میں اپنی مکمل حمایت کا وعدہ کیا۔ دوسری جانب اس نے خود کو وفادار ظاہر کرنے کے لیے لاہور دربار کو شہزادہ پشاورا سنگھ کے باغیانہ ارادوں سے خبردار کر دیا۔ ان دنوں پشاورا سنگھ لاہور میں رہتا تھا۔ وہ ایک دن موقع پا کر یہاں سے بھاگ نکلا اور اپنے ساتھ چند سپاہی ملا لیے۔ وہ ادھر ادھر ہوتا ہوا اٹک جا پہنچا۔ اتفاق سے اسے قلعے پر بھی قبضہ حاصل ہو گیا۔ جب اس صورتِ حال کی اطلاع لاہور پہنچی تو جواہر سنگھ نے چتر سنگھ اٹاری والے اور فتح خان ٹوانہ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ انہوں نے جا کر اٹک کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے پشاورا سنگھ کو

مذاکرات کے بہانے قلعے سے باہر اپنے کیمپ میں بلایا۔ رنجیت سنگھ کا یہ لڑکا بڑا سادہ لوح تھا۔ لہٰذا وہ ان کی چال میں آ گیا۔ انہوں نے اسے قید کر کے دوبارہ اٹک قلعے پر قبضہ کر لیا۔ پھر 12 ستمبر 1845ء کو پشاورا سنگھ کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔

جب شہزادہ پشاورا سنگھ کے اس بہیمانہ قتل کی داستان سکھ افواج تک پہنچی تو وہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ فوج کی پنچایت نے وزیر اعظم سردار جواہر سنگھ کو اپنے روبرو طلب کیا۔ جب وہ رانی جنداں اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی معیت میں ان کے سامنے حاضر ہوا تو انہوں نے اس جرم میں اسے موت کی سزا دی اور فوراً ہی اس فیصلے پر عمل درآمد بھی ہو گیا۔ یہ واقعہ 21 ستمبر 1845ء کو وقوع پذیر ہوا۔

طوائف الملوکی:

جب اس انتہاء کو پہنچ گئی اور فوج کی خودسری کا یہ عالم ہو گیا، تو ان حالات میں ہر شخص کو اپنی جان، مال اور آبرو خطرے میں نظر آنے لگی۔ ایسے میں سیاسی عمل جاری رکھنے میں کسے دلچسپی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ تقریباً ایک ماہ تک وزیر اعظم کا منصب خالی رہا، اور کسی کو یہ عہدہ قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس دوران میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد کے تین امراء جن کو اب تک عوام اور فوج میں احترام سے دیکھا جاتا تھا، سلطنت کے نظام چلاتے رہے۔ یعنی دیوان دینا ناتھ، بخشی بھگت رام اور فقیر عزیز الدین۔ بالآخر 8 نومبر 1845ء کو مسر لال سنگھ نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا، جبکہ مسر تیجا سنگھ خالصہ افواج کا سربراہ بنا۔ دونوں جمعدار خوشحال سنگھ کے رشتہ دار تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں لاہور آئے تھے۔ اس کے کہنے پر انہوں نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر سکھ مت اپنایا تھا۔ جس کے بدلے میں مہاراجہ نے انہیں دربار میں قابلِ قدر مراتب عطا کئے تھے۔ پہلے تو فوج کے پنچوں نے ان تقررات کی منظوری نہ دی لیکن بعد میں وہ راضی ہو گئے تھے۔

مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کا آخری سکھ حکمران تھا۔ اس کے عہد میں سکھوں اور

انگریزوں کے درمیان جنگیں ہوئیں جس کے نتیجے میں انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ پنجاب برطانوی ہند کا ایک حصہ بن گیا اور اس کی خودمختار حیثیت ختم ہوگئی۔

انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ:

انگریزوں اور سکھوں کے درمیان پہلی جنگ 1845ء میں ہوئی۔ یہ جنگ کسی اچانک واقعہ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ انگریزوں کی طویل المعیاد حکمتِ عملی کا ردِعمل تھی۔ انگریزوں کا منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان پر بتدریج قبضہ کیا جائے اور مقبوضہ علاقوں میں ایسی اصلاحات کی جائیں، جس سے اس علاقے کے باشندوں کی ہمدردیاں انہیں حاصل ہو جائیں۔ اس سے انگریزوں کو دو فائدے پہنچتے تھے ایک تو اس علاقے میں ان کا قبضہ بہت جلد مستحکم ہو جاتا اور دوسرے اس علاقے کے باشندے انگریزی حکومت کے محاسن ان علاقوں کے باشندوں سے بیان کرتے، جو ابھی انگریز عملداری میں نہیں آئے تھے۔ اس سے انگریزوں کو پیش قدمی کرنے میں بہت سہولت ہوتی۔ انگریزوں کی جاسوسی سرگرمیاں بھی ان کی حکمتِ عملی کا خاص حصہ تھیں۔ وہ قوت کو کم از کم اور تدبیر کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے۔ یہ ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ انگریزوں کو اس ملک کے ہر حصے میں وطن دشمن افراد با افراط مل گئے جس سے ان کا کام آسان ہوتا چلا گیا اور وہ ایک علاقے کے بعد دوسرا علاقہ فتح کرتے ہوئے 1803ء میں دہلی پر قابض ہوگئے۔ یہاں سے انہیں آگے بڑھنا تھا جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے 1809ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ امرتسر میں ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے انہیں دریائے ستلج کا اقتدار حاصل ہوگیا۔ فریقین نے یہ بھی طے کیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں پر قناعت کریں گے اور ایک دوسرے کے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ تو ساری عمر اس معاہدے پر خلوصِ نیت سے قائم رہا لیکن انگریزوں نے نہایت رازداری سے اس قسم کے اقدامات شروع کر دیئے جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ صرف مناسب وقت ہی کے منتظر تھے۔

انگریزوں نے اپنے کئی جاسوسوں کو سیاحوں کے بھیس میں پنجاب بھیجا جنہوں نے سارے پنجاب میں گھوم پھر کر فوجی نقطہ نظر سے یہاں کی زمین کے بارے میں تفصیلی معلومات جمع کیں۔ اسی طرح ایک مشن دریائے سندھ کے راستے پنجاب آیا۔ انہوں نے بھی بظاہر اپنا مقصد سیاحت ہی بتایا لیکن درحقیقت ان کا مقصد دریائے سندھ اور پنجاب کے دوسرے دریاؤں کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھا۔ یعنی اگر مستقبل میں دریائی راستوں کے ذریعے پنجاب پر حملہ کرنا پڑے تو کوئی دقت پیش نہ آئے انگریزوں نے پنجاب پر حملہ کرنے کے لیے تمام متوقع امکانات کا مفصل جائزہ لیا اور اس کے مطابق تیاریاں کرتے رہے۔

1809ء میں جب انگریزوں اور سکھوں کے درمیان معاہدہ ہوا تھا تو دریائے ستلج کی دوسری جانب صرف ایک جگہ یعنی لدھیانے میں انگریزی چھاؤنی تھی، جس میں تین ہزار سپاہی بارہ توپوں کے ساتھ متعین تھے۔ 1838ء تک یہی صورت رہی۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ اب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زندگی ختم ہونے کے قریب ہے اور اس کے بعد پنجاب دربار میں قیادت کا بحران پیدا ہوگا اور اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ انگریز اس سے قبل 1838ء میں سندھ کا اپنی سلطنت سے الحاق کر چکے تھے جس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے کسی شدید ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ اس بناء پر انگریزوں کی ہمت اور بھی بڑھ گئی اور انہوں نے پنجاب پر قبضہ کرنے کے لیے تیزی سے تیاریاں شروع کر دیں۔ 1838ء میں انہوں نے سکھ مملکت کی سرحد پر فیروز پور میں ایک اور فوجی اڈہ بنایا۔ یہاں پانچ ہزار سپاہی اور بارہ توپیں تھیں۔ اگلے سال انہوں نے کسولی، شملہ اور ابنالہ میں بھی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ سات سال تک انگریز بتدریج اپنی اس سرحد کو مستحکم کرتے رہے، حتیٰ کہ 1845ء میں یہاں انگریزوں کی کل فوجی طاقت چوالیس ہزار سپاہی اور ایک سو توپوں پر مشتمل تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے فوج کو دریا پار اتارنے کے لیے بڑی کشتیاں بھی خاصی تعداد میں بمبئی سے فیروز پور منگوالی تھیں سب انتظامات مکمل کرنے کے بعد وہ

مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔

دوسری جانب لاہور دربار بھی عجیب صورتحال سے دوچار تھا۔ فوج بالکل آزاد منش ہو چکی تھی اور اس پر کسی کا اثر باقی نہ رہا تھا۔ چنانچہ فوج کو پھر سے اپنے قابو میں لانے کے لیے اس وقت کی سکھ قیادت نے یہ حل سوچا کہ فوج کو انگریزوں سے پٹوایا جائے۔ یعنی کسی مسئلے کی آڑ لے کر انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے۔ داخلی انتشار اور کچھ دوسری وجوہات کی بناء پر سکھ فوج، انگریز فوج کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ نتیجتاً اس کی خودسری دور ہو جائے گی۔ شکست کے بعد انگریزوں سے مذاکرات کی کوشش کی جائے گی اور انہیں کچھ دے دلا کر صلح کر لی جائے گی۔ لیکن سکھ قیادت نے یہ نہ سوچا کہ اگر ایک بار میدانِ جنگ میں انگریزوں کا پلہ بھاری ہو گیا تو پھر ان کے لیے یہ امر ناممکن ہوگا کہ وہ انگریزوں کو زیادہ دیر تک پنجاب پر مکمل قبضہ کرنے سے باز رکھ سکیں۔ اب تک اگر انگریزوں نے پیش دستی نہیں کی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز ابھی تک سکھوں کی زبردست لڑاکا صلاحیت سے خائف تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ پنجاب میں قوت کی بجائے تدبر سے کام لیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے متوقع تصادم سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تمام احتیاطی تدابیر تو اختیار کر لیں مگر پہل کی جرأت نہ کی۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ پنجاب پر حملہ اس وقت کیا جائے جبکہ سکھ فوج اپنے اندرونی خلفشار کے باعث محض ریت کی دیوار ہی رہ گئی ہو۔

وزیراعظم جواہر سنگھ کو قتل کرنے کے بعد ملک کے سیاسی نظام میں سکھ فوج کی مداخلت انتہا کو پہنچ گئی۔ رانی جنداں نے مسر لال سنگھ کو اپنا وزیراعظم مقرر کرنا چاہا۔ لیکن فوج کی پنچایت نے اس قرارداد کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے تمام انتظامی ذمہ داری رانی کے کندھوں پر آ پڑی جو اب مادرِ ملکہ ہونے کی وجہ سے ولی شاہ (ریجنٹ) کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ مسر لال سنگھ کو امورِ مملکت میں شریک کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ نومبر 1845ء میں وہ وزیراعظم کے تمام اختیارات سنبھال چکا تھا۔

اسی اثناء میں سکھ قیادت انگریزوں سے جنگ چھیڑنے کی نہج پر سوچتی رہی۔ انہی

دنوں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے باعث رانی جنداں کو فوراً ہی جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ سکھ فوج میں بعض عناصر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دلیپ سنگھ کو برطرف کر کے شیر سنگھ کے کمسن لڑکے کو مہاراجہ بنایا جائے۔ لیکن رانی جنداں نے فوج کے کچھ پنچوں کو اس بات کا قائل کیا کہ انگریزوں سے جنگ کرنا بہت ضروری ہے، کیونکہ وہ ہماری سرحد پر بڑی تعداد میں فوجیں جمع کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے حملہ نہ کیا تو وہ یقیناً ہم پر حملہ کر دیں گے، لہٰذا انہیں پہل کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ دوسرے انگریز، سکھوں کے مقابلے میں بہت کمتر ہیں، کیونکہ افغانوں نے حال ہی میں انگریزوں کو ذلت آمیز شکست دی ہے جبکہ سکھ بارہا افغانوں کو عبرتناک شکستیں دے چکے ہیں۔ لہٰذا اب اگر ہم انگریزوں پر حملہ کریں تو ہماری فتح یقینی ہے۔ پنچ اس کی ان باتوں میں آ گئے اور انہوں نے زور وشور سے انگریزوں کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی مشہور کرنا شروع کر دیا کہ انگریز حکام ستلج پار کی سکھ رعایا کو طرح طرح سے تنگ کر رہے ہیں اور ان سے ناجائز ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں۔ اس طرح سکھ فوج میں انگریزوں کے خلاف جوش وخروش پھیل گیا۔ جب اس مسئلے پر فوج نے اپنے ردعمل کا اظہار کر دیا یعنی حکومت جنگ شروع کرے تو فوج پوری طرح اس کا ساتھ دے گی تو رانی جنداں نے تمام سرداروں، امیروں اور پنچوں کا ایک اجلاس شالا مار باغ میں طلب کیا جس سے رانی جنداں کی طرف سے دیوان دینا ناتھ نے خطاب کیا۔ دیوان نے اتنی مؤثر تقریر کی کہ وہاں موجود تمام حاضرین نے بیک زبان جنگ شروع کرنے کے حق میں رائے دی۔ انہوں نے مہاراجہ دلیپ سنگھ پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار بھی کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسر لال سنگھ کو وزیر اعظم اور سردار تیجا سنگھ کو سپہ سالار کی حیثیت سے بھی قبول کر لیا۔

اس کے چند دن بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ پر سکھوں نے ایک اور اعلیٰ سطح کا اجلاس منعقد کیا، جس میں انگریزوں کے خلاف باقاعدہ اعلانِ جنگ کیا گیا اور اپنے اقدام کے اسباب کی سرکاری طور پر وضاحت بھی کی جس میں چند اہم امور مندرجہ ذیل ہیں۔

1- انگریز ستلج پار زبردست فوجی نقل و حرکت کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہماری آزادی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

2- انگریزوں نے سردار سچیت سنگھ کے مرنے کے بعد اس کی ستلج پار کی جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے اور باوجود کئی یاددہانیوں کے اسے لاہور دربار کے حوالے نہیں کیا۔ اس جائیداد کی کل مالیت اٹھارہ لاکھ تھی۔

3- سکھ حکومت نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے ستلج پار کے سکھ علاقوں تک رسد و رسائل کی سہولتیں مہیا کرے، لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

4- انگریزوں نے راجا نابھ کا کچھ علاقہ چھین لیا اور جسے وہ واپس کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ انگریز دریائے ستلج پر پل بنانے کے لیے بمبئی میں تیار کردہ خاص کشتیاں فیروز پور منتقل کر رہے ہیں تاکہ سکھ علاقے پر چڑھائی کی جا سکے۔ مزید براں سکھوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ انگریز سندھ میں بڑے پیمانے پر فوجیں جمع کر رہے ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ اطراف سے پیش قدمی کر کے ملتان پر قبضہ کر لیا جائے۔

اس اجلاس میں ہر سکھ سردار نے فرداً فرداً گرنتھ صاحب پر ہاتھ رکھ کر مہاراجہ دلیپ سنگھ کے ساتھ اپنی وفاداری کا عہد کیا۔

اس دوران میں انگریز ان تمام حالات سے مکمل باخبر رہے۔ گورنر جنرل سر ہنری ہارڈنگ نے اپنی کونسل سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہم صرف دفاعی تدابیر ہی اختیار کریں گے اور کسی قسم کا جارحانہ اقدام نہیں کریں گے۔ اسے یقین تھا کہ سکھ ہرگز دریا عبور کر کے برطانوی علاقے پر حملہ آور ہونے کی حماقت نہیں کریں گے، لیکن جب حالات تیزی سے بگڑنے لگے اور سکھ فوجوں نے برطانوی سرحد کی جانب بڑھنا شروع کر دیا تو گورنر جنرل نے 8 دسمبر کو لاہور دربار سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ساتھ ہی لدھیانے میں مقیم انگریز فوج بھی آگے روانہ کر دی۔ 8 دسمبر کو سکھوں نے بڑی

تعداد میں دریائے ستلج پار کیا اور فیروز پور شہر اور ہری کا پتن کے درمیان ڈیرے ڈال دیے۔
اس صورتحال پر گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ اور کمانڈر انچیف سر ہیگ گف نے کرنال میں ان معاملات پر غور کیا اور پھر اپنی فوج کو حکم دیا کہ سکھوں کی جارحیت کو روکیں۔ 13 دسمبر کو اس نے ایک اعلان جاری کیا، جس میں کہا گیا تھا کہ ہم نے آج تک اس معاہدے کی پوری پوری پابندی کی ہے، جو 1809ء میں ہمارے اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہوا تھا۔ ہم نے ہمیشہ لاہور دربار کے ساتھ خیر سگالی کے تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کی اور جس میں ہم کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد جب لاہور دربار میں انتشار پھیل گیا تو بھی ہم نے اس صورتحال سے فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ ہماری یہی کوشش رہی کہ لاہور میں ایک مرتبہ پھر مضبوط حکومت قائم ہو۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے عہد میں خانہ جنگی کی وجہ سے ہم نے اپنی سرحد پر معمولی دفاعی اقدامات کیے تھے، لیکن پنجاب کی موجودہ قیادت نے ہماری اس پالیسی کی قدر نہ کرتے ہوئے کئی ایسے اقدامات کیے جس سے دوستی کی فضا متاثر ہوئی۔ لیکن ہم پھر بھی ان باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی صلح جویانہ حکمتِ عملی پر قائم رہے۔ اب لاہور دربار نے دوستی کے معاہدے پسِ پشت ڈالتے ہوئے برطانوی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور اس کی فوجیں ہماری سرحدوں میں داخل ہو چکی ہیں، لہٰذا ہم بھی خالصہ حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں۔ آج سے ستلج پار مہاراجہ دلیپ سنگھ کا علاقہ برطانوی سلطنت کا حصہ سمجھا جائے گا۔

جنگ مدکی:

لدھیانہ اور انبالہ کی چھاؤنیوں سے تمام فوج سکھوں کے روکنے کے لیے بڑھی۔ اس فوج کی تعداد تیرہ ہزار تھی اور اس کے ساتھ اڑتالیس توپیں تھیں۔ 18 دسمبر کو انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ مدکی کے مقام پر ہوئی جو فیروز پور سے بیس میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ سکھوں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ ان کے پاس چالیس توپیں تھیں۔ دن میں تو خاموشی

رہی لیکن سہ پہر کو سکھوں نے اچانک توپخانے سے حملہ کر دیا۔ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف بھی اسی جگہ تھے۔ سکھ فوجوں کی قیادت مسر لال سنگھ کر رہا تھا۔ انگریزوں نے فوراً جنگی ترکیب اختیار کر کے جوابی حملہ کر دیا۔ سکھ لشکر، انگریزی کیمپ سے تقریباً دو میل دور جنگل کے پیچھے ایک ایسی جگہ تھا، جہاں ہر طرف جھاڑیاں، ریت کے ٹیلے اور اسی قسم کی دوسری قدرتی رکاوٹیں تھیں، جونہی سکھوں نے دیکھا کہ انگریزی فوج بڑھی آ رہی ہے انہوں نے بے تحاشا گولہ باری شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے انگریزوں کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔ اس پر انگریز بائیں پہلو کی طرف سے بڑھے اور سکھوں کے عقبی حصے پر حملہ کر دیا۔ اس دوران میں برطانوی توپخانہ بھی آگ برساتا رہا اور انگریزوں کے پیدل ڈویژن بھی جنگ میں شریک ہو گئے۔ لیکن عین اس وقت جب لڑائی پورے عروج پر تھی مسر لال سنگھ میدان سے بھاگ گیا کیونکہ وہ جنگ سے پہلے ہی انگریزوں سے معاملات طے کر چکا تھا۔ اگرچہ اب سکھ فوج کا کوئی سردار نہ تھا لیکن پھر بھی سکھ سپاہیوں نے بڑی جرأت و ہمت سے مقابلہ جاری رکھا۔ مگر جب انگریزوں نے زوردار حملہ کیا تو سکھ میدان چھوڑ کر دریا کی طرف پسپا ہو گئے۔ اس وقت تک اندھیرا بھی ہو چکا تھا۔ لہٰذا انگریزوں نے تعاقب نہ کیا۔ سکھوں کی سترہ توپیں انگریزوں کے ہاتھ لگیں۔ بے شمار سکھ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ انگریزوں کے چھ سو ستاون آدمی زخمی اور دو سو پندرہ ہلاک ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں میجر جنرل سر رابرٹ سیل اور میجر جنرل سر جان ایم کاسکل بھی تھے۔

جنگ فیروز شہر:

مدکی میں شکست کے بعد سکھوں نے فیروز (پھیرو شہر) کے اردگرد مورچے بنا لیے۔ یہ جگہ فیروز پور سے دس میل دور ہے۔ سکھوں نے یہاں دفاعی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ سر جان لٹلر اس مورچہ بندی کو توڑنے پر متعین ہوا۔ اس نے فیروز پور کی فوج کو بھی باقی فوج کے ساتھ ملا کر متحدہ قوت سے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سر جان لٹلر کی قیادت میں تقریباً سترہ

ہزار توپوں کے ساتھ سکھوں پر یلغار کی۔ اب سکھوں کی تعداد تیس ہزار سے کم ہو چکی تھی۔ مسر تیج سنگھ فیروز پور کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ فیروز شہر کی فوج نے اسے کئی پیغامات بھیجے کہ یہاں آ جاؤ تا کہ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں، لیکن وہ بھی انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر چکا تھا اور لال سنگھ اور تیج سنگھ کا غدار گروہ انگریزوں کو یقین دلا چکا تھا کہ ہم حتی الوسیع سکھوں کی قوت کو متحد نہیں ہونے دیں گے۔ جب فیروز شہر کی فوج کا اصرار بہت بڑھا اور تیج سنگھ کی اپنی فوج نے بھی اسے مجبور کیا تو بادل ناخواستہ وہاں سے روانہ ہوا۔ یہ فوج 22 دسمبر 1845ء کو فیروز شہر پہنچی۔ جبکہ وہاں 21 دسمبر سے ہی لڑائی کا آغاز ہو چکا تھا۔

21 دسمبر کو انگریز فوج نے بعد دوپہر سکھوں پر حملہ کیا۔ سکھوں نے خوب مزاحمت کی۔ سکھ توپخانے نے اس قدر شدید گولہ باری کی کہ انگریزوں کے لیے پیش قدمی ناممکن ہو گئی۔ دونوں فوجیں پوری شدت سے مصروفِ پیکار ہوئیں۔ سکھ فوجوں کا سردار، مسر لال سنگھ خندقوں ہی میں چھپ کر بیٹھا رہا اور ایک بار بھی فوج کی ہمت بڑھانے کے لیے سامنے نہ آیا۔ جونہی اندھیرا ہوا لال سنگھ ایک دفعہ پھر فوج کو تنہا چھوڑ کر امرتسر کی طرف بھاگ گیا، لیکن فوج نے اب بھی حوصلہ نہ ہارا اور مقابلہ جاری رکھا۔ رات گئے تک جنگ ہوتی رہی صبح کو دوبارہ جنگ کا آغاز ہوا۔ اس دوران مسر تیج سنگھ بھی فیروز شہر پہنچ گیا۔ لیکن اس نے اپنی فوج کو لڑائی میں شامل نہ ہونے دیا۔ جونہی انگریزوں نے بڑا حملہ کیا وہ میدان سے فرار ہو گیا۔ مسر لال سنگھ اور مسر تیج سنگھ کی غداری کی وجہ سے فیروز شہر کی جنگ میں بھی سکھ شکست سے دوچار ہوئے اور انگریزوں کو فتح ہوئی۔ یہ فتح انگریزوں کو اپنی شجاعت کی وجہ سے نہیں بلکہ عیاری اور مکاری کی بدولت حاصل ہوئی تھی۔ یہ حقیقت اس جنگ میں شامل انگریز جرنیلوں نے بھی تسلیم کی ہے کہ اگر سکھ فوج کے سردار غدار نہ ہوتے اور تمام سکھ طاقت کو متحد ہو کر لڑنے کا موقع ملتا تو انگریزوں کے لیے کامیاب ہونا تو درکنار وہ سکھوں کو دہلی تک روک بھی نہ سکتے۔ لیکن ننگ وطن عناصر کی حلیہ سامانیوں کے باعث سکھوں کو اپنی تاریخ کی بدترین شکست ہوئی۔ ان کے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے اور ان کی تہتر توپیں انگریزوں کے

قبضے میں چلی گئیں۔ اس قدر نامساعد اور ہمت شکن حالات میں بھی سکھوں نے اپنی جنگی روایات کے مطابق سردارِ لشکر کی عدم موجودگی میں قابلِ قدر مزاحمت کی۔ انہوں نے انگریزوں کو اتنا نقصان پہنچایا، جتنا انہیں آج تک ہندوستان کی کسی لڑائی میں نہیں پہنچا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ سو افسر اور جوان ہلاک ہوگئے۔ زخمیوں کی تعداد پونے دو ہزار تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی فوج کا تقریباً ساتواں حصہ کم ہوگیا تا، جس کی تلافی مستقبل قریب میں دشوار تھی۔

بدوال اور علی وال کے معرکے:

سکھ لشکر تو بھاگ کر دریا کے پار چلا گیا، لیکن انگریزوں نے ان کا تعاقب نہ کیا کیونکہ ایک تو ان کی افرادی قوت میں بہت کمی ہوگئی تھی اور دوسرے ان کا سامانِ رسد اور گولہ بارود ختم ہوگیا تھا۔ اس لیے وہ وہیں دہلی سے آنے والی کمک کا انتظار کرنے لگے۔ اسی اثناء میں سکھوں نے سردار رنجور سنگھ کی قیادت میں پھلور کے مقام پر دریا عبور کیا اور لدھیانے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ سردار رنجور سنگھ کے پاس توپیں بھی تھیں۔ ان دنوں لدھیانے کی ساری فوج فیروز پور کی طرف گئی ہوئی تھی۔ رنجور سنگھ نے چھاؤنی میں شبخون مارا۔ بہت سا مال واسباب لوٹ لیا اور شہر میں جگہ جگہ آگ لگا دی۔ برطانوی حکام نے سر ہیری سمتھ کو کچھ سپاہی اور اٹھارہ توپیں دے کر بھیجا تا کہ وہ لدھیانے کو سکھوں سے آزاد کرائیں۔ راستے میں بدوال کے نزدیک اس کی سکھ فوج کے ایک بھاری دستے سے مڈ بھیڑ ہوگئی، جس میں اسے بری طرح شکست ہوئی اور سکھوں نے اس سے بہت سا سامانِ جنگ چھین لیا۔ یہ معرکہ 21 جنوری 1846ء کو ہوا تھا۔ اس میں انگریزوں کو کافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

رنجور سنگھ کو عقب سے کمک مل گئی۔ اب وہ یہاں سے آگے بڑھا اور علی وال کے قریب مورچہ بند ہوگیا۔ اسی اثناء میں بریگیڈیئر وہلیر بھی ہیری سمتھ کے لیے کمک لے کر پہنچ گیا۔ اب انگریز فوج کی کل نفری گیارہ ہزار تھی۔ اس کے پاس بتیس توپیں تھیں۔ جبکہ

دفاعی حالت میں بیٹھے ہوئی سکھ لشکر کی تعداد پندرہ ہزار تھی اور ان کے پاس چھپن توپیں تھیں۔28 جنوری کو دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔سکھوں نے توپوں سے اتنی گولہ باری کی کہ انگریزوں کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہو گیا۔لیکن کچھ دیر بعد انگریز یکبارگی سکھوں پر ٹوٹ پڑے اور دست بدست معرکے میں سکھوں کا سخت نقصان کیا۔ بالآخر وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا سینکڑوں تو تلوار کے گھاٹ اترے جبکہ سینکڑوں ہی دریا عبور کرنے کی کوشش میں ڈوب گئے۔سکھ بھاگتے وقت اپنے سامان میں سے کچھ بھی ساتھ نہ لے جا سکے اور وہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔اس جنگ میں انگریزوں کے صرف ڈیڑھ صد آدمی ہلاک اور چار سو آدمی زخمی ہوئے۔

جنگ سبھراؤں:

ادھر لاہور دربار میں انتظامی تبدیلیاں بھی ہوئیں۔مسر لال سنگھ کو وزارتِ عظمیٰ سے الگ کر کے راجا گلاب سنگھ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔گلاب سنگھ نے انگریزوں سے امن کی بات چیت کرنا چاہی، لیکن گورنر جنرل نے مذاکرات سے انکار کر دیا۔راجا گلاب سنگھ بھی دل سے سکھوں کے ساتھ مخلص نہیں تھا۔اس لیے فوجی جنتا اور اس کے درمیان کوئی مشترکہ پالیسی وضع نہ کی جا سکی۔گلاب سنگھ صلح کے لیے کوشش کر رہا تھا اور فوج سبھراؤں کے مقام پر جنگ لڑنے کی تیاری میں مصروف تھی۔اگرچہ جنگ علی وال کی وجہ سے سکھوں کے عزائم پہلے جیسے بلند نہ تھے تاہم وہ لڑنا ہی چاہتے تھے۔انہوں نے اپنی فوج کے ایک ہسپانوی افسر کی رہنمائی میں دریا کے کنارے پر خندقیں کھود لیں۔ یہ خندقیں جدید نمونے کی تھیں۔سبھراؤں، فیروز پور سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔سکھوں نے توپخانے کے لیے بھی خاص دمدمے تیار کیے۔

دریائے ستلج کے اس طرف سکھوں کی کل لڑاکا قوت پینتیس ہزار لڑاکا سپاہیوں اور سرسٹھ توپوں پر مشتمل تھی۔ان کی کچھ فوج دریا کے اس طرف بھی موجود تھی۔ دریں اثناء

انگریزوں کو دہلی سے بھاری کمک مل گئی۔8 فروری 1846ء کو یہ کمک پہنچنے کے بعد انگریزوں نے پیش قدمی شروع کی۔اس وقت برطانوی فوج کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔اس کے علاوہ لدھیانے کی جانب جو فوج بھیجی گئی تھی وہ بھی واپس آ گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس جنگ سے قبل لاہور دربار اور سکھوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا جس میں طے پایا تھا کہ، چونکہ فوج امن و آشتی کے خلاف ہے اس لیے لاہور دربار ایسے حالات پیدا کرے گا، جس میں سکھوں کو عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑے اور ان کا زور ٹوٹ جائے تا کہ وہ آئندہ معاہدہ امن میں رکاوٹ نہ بن سکیں، اس جنگ کے بارے میں انگریز مؤرخ کننگھم کا یہ تبصرہ بالکل درست ہے کہ لاہور دربار کی عظمت کے تحفظ کے لیے فوج کے سپاہیوں اور نچلے درجے کے افسروں نے تو بہت کچھ کیا، لیکن فوج اور سول کے اعلیٰ افسران نے ان کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا، چنانچہ اپنے سرداروں کی اس سازش سے بے خبر سکھ فوج، انگریزوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کرتی رہی۔

اس جنگ میں بھی سکھوں کی کمان تیج سنگھ کے پاس تھی۔ جو پہلے بھی سکھوں کو زک پہنچا چکا تھا۔اس دفعہ بھی اس نے سکھ فوج کی تمام منصوبہ بندی سے انگریزوں کو آگاہ کر دیا۔ اسی طرح اس نے توپوں کی مختلف پوزیشنیں بھی انگریزوں کو بتا دیں۔ سکھ فوج کے متعلق یہ معلومات حاصل ہونے کے بعد انگریزوں نے گویا آدھی جنگ تو پہلے ہی جیت لی تھی۔

انگریزوں نے 10 فروری 1846ء کو علی الصبح حملہ کیا۔اس وقت گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔انگریزوں نے پہلے سے معلوم سکھوں کی پوزیشنوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ سکھوں نے بھی جواب دیا۔ دونوں توپخانے ایک دوسرے پر شدید حملے کر رہے تھے۔ توپخانے کی جنگ میں سکھوں کا نقصان بہت زیادہ ہوتا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جونہی جنگ شروع ہوئی مسر تیج سنگھ حسبِ سابق کشتی میں بیٹھ کر دریا کے پار بھاگ گیا۔ جاتے ہوئے اس نے کشتیوں کا پل بھی توڑ دیا تا کہ سکھ فوج کے لیے پسپائی کا بھی کوئی راستہ

نہ رہے اور وہ دریا کے ادھر ہی مکمل تباہی کا شکار ہو جائے۔ اس کے بھاگ جانے کے بعد سردار شام سنگھ اٹاری والا فوج کی قیادت کے لیے آگے بڑھا۔ اس بوڑھے وفادار سردار کی قیادت میں سکھوں نے مقابلہ جاری رکھا۔ سردار شام سنگھ نے اس جنگ میں جرأت و مردانگی کے بے مثال کارنامے سرانجام دیئے اور بالآخر بہادری کے جوہر دکھاتا ہوا کام آیا۔

آہن و آتش کی بارش کے بعد انگریزوں نے تقریباً نو بجے سکھ مورچوں پر طوفانی یلغار کی۔ اگرچہ اس وقت تک سکھ نیم جان ہو چکے تھے پھر بھی انہوں نے دست بدست لڑائی میں خوب دادِ شجاعت دی، لیکن وہ جم کر لڑ نہ سکے اور مزید دو گھنٹے کی لڑائی کے بعد پانسہ انگریزوں کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ اب سکھ فرار کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ کشتیوں کا پل ٹوٹ چکا تھا، لہٰذا انہوں نے تیر کر دریا عبور کرنے کی کوشش کی۔ سینکڑوں دریا کی لہروں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ دوپہر تک سوائے ہلاک شدگان اور زخمیوں کے تمام سکھ میدان سے بھاگ چکے تھے۔

انگریزوں کی یہ عظیم اور فیصلہ کن فتح تھی۔ اس جنگ میں سکھوں کے مقابل انگریزوں کا بہت کم نقصان ہوا۔ ان کے تین سو بیس آدمی مارے گئے۔ ان مرنے والوں میں میجر جنارل سررابرٹ ڈک بھی تھا۔ جو دست بدست جنگ کے وقت سکھ مورچوں کے بہت قریب چلا گیا تھا۔ یہ بڑا دلیر اور ہونہار افسر تھا۔ یورپ اور ہندوستان کے کئی معروں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ انگریز زخمیوں کی تعداد دو ہزار سے زائد تھی۔

اس جنگ میں سکھوں کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ اس شکست کے بعد سکھ فوج کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کی تنظیم تباہ ہو گئی۔ آٹھ ہزار سکھ قتل ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد بے شمار تھی۔ سکھوں کی تمام توپیں اور بے شمار گولہ بارود انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ سکھ بھاگتے وقت کچھ بھی ساتھ نہ لے جا سکے، جس کی وجہ سے ان کے غلے کے ذخیرے اور دوسرا سامان بھی انگریزوں کے ہاتھ لگا۔

سبھراؤں کی جنگ کے بعد انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جنگوں کا پہلا سلسلہ ختم

ہو گیا۔ بچی کھچی سکھ فوج لاہور سے شمال کی طرف واقع ایک گاؤں رائے ونڈ میں جمع ہو گئی۔ اس فوج کی تعداد پچیس ہزار تھی، لیکن ان کے پاس توپیں نہیں تھیں کیونکہ وہ سب کی سب ستلج پار رہ گئی تھیں اور توپوں پر اب انگریزوں کا قبضہ تھا۔ اگر چہ لاہور دربار کے تمام سردار ملک و ملّت سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں سے مل چکے تھے اور اسی وجہ سے سکھ فوج کو پے در پے شکستیں ہوئی تھیں لیکن سکھ فوج اب بھی لڑنے پر آمادہ تھی۔ جب فوج کے پنچوں نے دربار سے درخواست کی کہ اسے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سامانِ رسد اور گولہ بارود مہیا کیا جائے تو دربار کی طرف سے صاف انکار کر دیا گیا۔ سبھراؤں کی جنگ سے قبل راجا گلاب کو رانی جنداں نے کشمیر سے بلایا۔ لاہور پہنچنے پر اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور اسے وزیر اعظم بنا کر انگریزوں سے مذاکرات شروع کرنے کی ہدایت کی گئی۔ برطانیہ کی طرف سے اس کوشش کا جواب مثبت نہ دیا گیا، بلکہ لارڈ ہارڈنگ نے کہا کہ جب تک میری فوجیں لاہور کی فصیل تک نہیں پہنچ جاتیں، میں صلح کی بات چیت نہیں کروں گا۔ پھر سبھراؤں کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سکھ فوج کو دانستہ طور پر ضروری سامانِ جنگ نہ بھیجا گیا۔ سکھ فوجی بھوک پیاس کے باوجود خوب لڑے لیکن شکست کھائی اور انگریز فیصلہ کن فتح سے ہمکنار ہوئے۔

سبھراؤں کی جنگ 10 فروری کو دوپہر تک ختم ہو چکی تھی۔ اس رات انگریزی فوج کے ہراول دستوں نے دریائے ستلج عبور کیا۔ 12 فروری کو دریا پر کشتیوں کا پل بنایا گیا اور 13 تاریخ تک سارا لشکر دریا کے پار اتر چکا تھا۔ اس سارے عمل کے دوران میں سکھوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ کی گئی۔ رائے ونڈ میں مقیم سکھ فوج کو دربار کی جانب سے سخت ہدایت کی گئی تھی کہ وہ خاموش رہے۔ 12 فروری کو انگریزوں نے نہایت اطمینان سے قصور کا قلعہ فتح کر لیا۔ 13 فروری کو کمانڈر انچیف لارڈ گف قصور پہنچا۔ 14 فروری کو گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ بھی آ گیا۔ اسی دن گورنر جنرل نے ایک فرمان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت نے ہمیشہ 1809ء کے معاہدے کا احترام کیا جبکہ پنجاب دربار کی طرف

سے اکثر اس کی خلاف ورزیاں سرزد ہوتی رہیں اور بالآخر سکھ فوجوں نے دریائے ستلج عبور کر کے برطانوی علاقے پر جنگ مسلط کر دی۔ انگریز فوجوں نے بڑی کامیابی سے ان کا مقابلہ کیا۔ اب انگریز فوج نے دریائے ستلج عبور کر لیا ہے اور وہ اس وقت تک واپس نہیں جائے گی جب تک لاہور دربار کی طرف سے اسے یہ یقین دہانی نہ کرائی جائے کہ مستقبل میں اس قسم کی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ چونکہ جنگ کی ابتداء سکھوں کی طرف سے ہوئی تھی اس لیے ان سے تاوانِ جنگ بھی وصول کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں دریائے ستلج اور بیاس کے درمیان واقع جالندھر دوآب کا علاقہ بھی لاہور دربار سے لے لیا جائے گا۔ ان جنگوں میں جتنی توپیں استعمال ہوئی ہیں، وہ بھی سکھوں سے چھین لی جائیں گی۔ سب سے ضروری بات یہ کہ سکھ فوج کی تعداد میں کمی کر دی جائے گی تا کہ لاہور دربار آئندہ جارحانہ خطوط پر نہ سوچ سکے۔ ان یکطرفہ شرائطِ صلح کا اعلان کرنے کے بعد جو سراسر توسیع پسندانہ ذہنیت کی غماز ہیں، گورنر جنرل نے لاہور دربار کے بارے میں نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی سلطنت میں ہرگز وسعت نہیں چاہتے بلکہ ہماری تو یہ تمنا ہے کہ پنجاب پھولے پھلے اور یہاں ایک مضبوط حکومت قائم ہو۔

دراصل لارڈ ہارڈنگ پنجاب کو دو مراحل میں فتح کرنا چاہتا تھا۔ اسے احساس تھا کہ سکھ یکا یک غلامی کی زندگی گزارنے پر رضا مند نہیں ہوں گے، اور عوام کے دوسرے طبقوں کو ساتھ ملا کر سخت مزاحمت کریں گے، جس کا نتیجہ ممکن ہے کہ ہمارے حق میں نہ نکلے۔ اس لیے فی الحال پنجاب کے مکمل الحاق کو ملتوی رکھنا چاہیے تا کہ کسی مناسب وقت پر بغیر کسی پریشانی کے اسے ممالکِ محروسہ کر لیا جائے۔ چنانچہ اس جنگ میں فتح کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ پنجاب کو فوجی اور اقتصادی لحاظ سے اتنا کمزور کر دیا جائے کہ وہاں کی حکومت مستحکم ہو ہی نہ سکے، تا کہ مستقبل میں بآسانی اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ اسی غور وفکر کے بعد گورنر جنرل نے مندرجہ بالا اعلان جاری کیا تھا۔

لاہور دربار کی طرف سے راجا گلاب سنگھ ڈوگرا کو انگریزوں سے مذاکرات کرنے کے

لیے نامزد کیا گیا۔ دربار نے اسے اس ضمن میں مکمل اختیارات دیے تھے کہ وہ پنجاب کے حق میں جیسا مناسب سمجھے، معاہدہ کر لے اور دربار اس کی توثیق کرے گا۔ اس مقصد کے لیے راجا گلاب سنگھ 15 فروری کو لاہور سے روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ فقیرالدین اور دیوان دینا ناتھ کے علاوہ افغانستان کا بارکزئی حکمران سردار سلطان محمد بھی تھا۔

راجا گلاب سنگھ کی قیادت میں جب شاہی وفد قصور پہنچا تو اس کے ساتھ نہایت سردمہری کا مظاہرہ کیا گیا۔ انگریزی حکومت کے ترجمان نے کہا کہ چونکہ یہ وفد ایک ایسی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہے جو فی الحال ہمارے ساتھ آمادہ پیکار ہے لہٰذا اس کے لیے کسی قسم کی استقبالیہ تقریب کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا۔ گورنر جنرل نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اس وفد کو شرفِ ملاقات بخشا اور 1809ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کی آڑ میں ارکانِ وفد کو خوب سخت سست کہا۔ اس نے صرف راجا گلاب سنگھ کے کردار کی تعریف کی کیونکہ اس نے اس جنگ میں نہ صرف یہ کہ کوئی حصہ نہیں لیا تھا بلکہ ایسے حالات پیدا کیے تھے کہ سکھوں کی شکست یقینی ہو جائے۔ اس ملاقات میں بھی گورنر جنرل نے اپنی شرائط کو دہرایا اور کہا کہ ان شرائط پر بحث و تمحیص میرے چیف سیکرٹری مسٹر کیوری اور پنجاب کے معاملات کے خصوصی ماہر میجر لارنس سے کر لی جائے۔ چنانچہ طے ہوا کہ پنجاب کا کمسن حکمران 18 فروری کو للیانی میں گورنر جنرل کے حضور باریاب ہو۔ اس موقع پر بھی مہاراجہ دلیپ سنگھ استقبال کے اعزاز سے محروم رکھا گیا کیونکہ وہ ابھی تک باقاعدہ انگریزوں کے حلقۂ احباب میں شریک نہیں ہوا تھا۔ غرض ملاقات ہوئی جس میں مہاراجہ نے بذاتِ خود اطاعت گزاری کا اعلان کیا۔ اس ملاقات میں گورنر جنرل نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انگریز حکومت سے دوستانہ رویے کی بہت تعریف کی تھی۔ اس کے بعد محفل برخاست ہوئی۔ جب مہاراجہ واپس اپنی خیمہ گاہ کو روانہ ہوا تو اس وقت اس کے ساتھ ایک سربراہِ مملکت جیسا سلوک کیا گیا، کیونکہ اب وہ انگریزوں سے اپنے گزشتہ افعال کی معافی مانگ چکا تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ وغیرہ نے انگریز حکام سے واپسی کی اجازت طلب کی، لیکن انہوں نے انہیں حکم دیا کہ وہ

ابھی یہیں ٹھہریں تا کہ جب گورنر جنرل لاہور جائے تو مہاراجہ اور لاہور دربار تمام سربرآوردہ افراد اس کے ہمرکاب ہوں۔

اسی دوران لاہور اور امرتسر کے علاوہ پنجاب کے دیگر شہروں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انگریزوں کی فوج یہاں لوٹ مار کرے گی۔ اس پر گورنر جنرل نے 18 فروری کو ایک اعلان جاری کیا، جس میں اس نے کہا کہ پنجاب کے تمام باشندوں کے لیے مکمل امان کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ انہیں کچھ نہ کہا جائے گا۔ قتل و غارتگری کی افواہیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ اگر پنجابی عوام لاہور دربار اور خالصہ افواج نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو ہم ان کے جان و مال کے تحفظ کے ضامن ہیں۔ اس سے دونوں حکومتوں کے دوستانہ تعلقات بہت جلد معمول پر آ جائیں گے۔ اس اعلان پر پنجاب کے باشندوں کو اطمینان ہو گیا اور وہ روزمرہ کے کاروبارِ زندگی میں مصروف ہو گئے۔

اب واپس لاہور جانے کی تیاری ہونے لگی۔ اس موقع پر کسی ناخوشگوار واقعے کے امکانات کے پیشِ نظر راجا گلاب سنگھ نے دارالحکومت لاہور میں حفاظتی اقدامات کا حکم دیا۔ وہ رائے ونڈ میں مقیم سکھ فوج کو پہلے ہی حکم دے چکا تھا کہ وہ جہاں ہیں تا حکم ثانی وہیں رہیں۔ ویسے بھی اس فوج کی طرف سے کسی ردِ عمل کا خدشہ نہیں تھا کیونکہ لال سنگھ اور تیج سنگھ جیسے غدار ابھی تک اس پر مسلط تھے۔ دوسرے راجا گلاب سنگھ نے لاہور میں موجود مسلمان اور نیم فوجی دستوں کو حکم دیا کہ وہ قلعے کا اچھی طرح سے محاصرہ جاری رکھیں اور شہر کے دروازوں پر مستعدی سے پہرہ دیں تا کہ کوئی مسلح سکھ شہر میں داخل ہو کر فساد کا مؤجب نہ بنے۔

گورنر جنرل، مہاراجہ دلیپ سنگھ، سکھ سرداران اور انگریز افواج کی معیت میں 20 فروری 1846ء کو لاہور کے نواح میں وارد ہوا۔ میاں میر میں انگریزوں نے اپنا فوجی مستقر قائم کیا۔ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف تو وہیں ٹھہرے، لیکن مہاراجہ دلیپ سنگھ کو ایک دستہ فوج کے ساتھ قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ مہاراجہ کو بحفاظت قلعہ میں پہنچانے کی ذمہ داری

بریگیڈیئر کرٹن کے سپرد تھی۔ اس کے ساتھ چیف سیکرٹری مسٹر کیوری گورنر جنرل کا پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر سیسی ہارڈنگ اور گورنر جنرل کا مشیر خاص میجر لارنس بھی تھے۔ انگریزی فوج نے مہاراجہ کو سمن برج میں اس کی ماں رانی جنداں کے پاس پہنچا دیا۔ اس مہم کو بخوبی انجام دینے کے بعد مسٹر کیوری نے اعلان کیا کہ ہم اس فرض سے سبکدوش ہو گئے ہیں جو گورنر جنرل نے ہمارے ذمے کیا تھا۔ اس کے بعد انگریزی فوج نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو اکیس گولوں کی سلامی دی اور شہر میں گشت کرتی ہوئی واپس اپنے مستقر میں چلی گئی۔ 22 فروری کو کمانڈر انچیف لارڈ گف کچھ فوج لے کر شہر میں گیا اور اس فوج کو بادشاہی مسجد اور حضوری باغ میں متعین کر دیا، لیکن انگریز فوج قلعے کے اندر داخل نہ ہوئی۔

8 مارچ 1846ء کو انگریزوں اور سکھوں کے درمیان پہلا معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ انگریزی کیمپ میں ہوا۔ اس موقع پر خالصہ دربار کی نمائندگی راجا لال سنگھ، سردار تیجا سنگھ، دیوان دینا ناتھ سنگھ اور فقیر نور الدین نے کی، جبکہ کمپنی کی طرف سے مسٹر کیوری اور میجر لارنس موجود تھے۔ اس تقریب میں سکھ سرداروں نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کی طرف سے باقاعدہ درخواست پیش کی کہ پنجابی فوج انتہائی بدنظمی کا شکار ہے جس کی وجہ سے انتظامِ حکومت تباہ ہو کر رہ گیا ہے لہٰذا اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزی فوج کا ایک دستہ اس وقت تک لاہور میں متعین کیا جائے جب تک سکھ فوج دوبارہ اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نہ ہو جائے۔ اس درخواست کے جواب میں گورنر جنرل نے اپنی نام نہاد جمہوریت نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم کسی کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے، یہ ہماری حکمتِ عملی کے سراسر خلاف ہے۔ اگر لاہور دربار کو انگریزی فوج کی واقعی ضرورت ہے تو اس کے لیے باقاعدہ معاہدہ ہونا چاہیئے جس میں واضح طور پر لکھا جائے کہ یہ فوج کتنی مدت تک پنجاب میں مقیم رہے گی۔ اس کے بعد لاہور دربار کی جانب سے کہا گیا کہ انگریزی فوج اس سال کے اختتام تک پنجاب میں رہے، جسے گورنر جنرل نے منظور کر لیا۔

8 مارچ 1846ء کو انگریزوں اور سکھوں کے درمیان معاہدہ طے پایا۔ اسے ''معاہدہ لاہور'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ 9 مارچ کو گورنر جنرل کے خیمے میں ایک عظیم دربار منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر مہاراجہ دلیپ سنگھ کمانڈر انچیف لارڈ گف اور سندھ کے انگریز گورنر سر چارلس نیپئر کے علاوہ تمام سکھ سردار اور انگریزی فوج کے اعلیٰ افسران حاضر تھے۔ گورنر جنرل ایک بڑے تخت پر جلوہ افرز تھا۔ اس کی دائیں جانب کے تخت پر مہاراجہ دلیپ سنگھ بیٹھا تھا اور اس تقریب کا مہمانِ خصوصی پرنس والڈیمر گورنر جنرل کے بائیں طرف کے تخت پر بیٹھا تھا۔ گورنر لارڈ ہارڈنگ نے معاہدے پر توثیقی دستخط ثبت کئے۔ دلیپ سنگھ کے دستخط بھی لیے گئے۔ اس کے بعد اس نے ایک تقریر کی، جس میں اس نے سکھ سرداروں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ اپنی ساری توجہ حکومت کا انتظام بہتر بنانے پر صرف کریں اور اس معاہدے کا پورا پورا احترام کریں۔ اگر انہوں نے پھر پہلے کی طرح غفلت کی تو اس سلطنت کی بقاء معرضِ خطر میں پڑ جائے گی۔ لاہور دربار کو چاہیے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکمتِ عملی کو اپنائے۔ وہ برطانیہ کا بہت اچھا دوست تھا۔ فوج کو سیاسی عنصر کے ماتحت رہنا چاہیے، جیسا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تھا۔ اگر ان نصیحتوں پر عمل کیا گیا تو لاہور دربار کے حق میں اس کے نتائج بہتر برآمد ہوں گے اور صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو پھر لاہور دربار ہرگز زوال سے نہیں بچ سکے گا۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم ہر طرح تعاون کے لیے تیار ہیں۔ اسی لیے ہم اپنی فوج کا ایک دستہ یہاں چھوڑنے پر راضی ہوئے ورنہ ہم تو کسی کے داخلی مسائل سے سروکار نہیں رکھا کرتے۔ اب لاہور دربار کا فرض ہے کہ وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھائے اور اپنی فوج کو جدید خطوط پر جلد از جلد منظم کرے۔ اس کے بعد لاہور دربار کے منافق امراء نے یہ مفید نصیحتیں کرنے پر گورنر جنرل کا بڑے زور و شور سے شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے پنجاب کے ساتھ گورنر جنرل کے ہمدردانہ اور فیاضانہ رویے کا بڑی شدّ ومد سے ذکر کیا۔

معاہدہ لاہور:

9 مارچ 1846ء کو انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کی شرائط حسب ذیل ہیں:

1- ایسٹ انڈیا کمپنی، مہاراجہ دلیپ سنگھ کو پنجاب کا خودمختار حکمران تسلیم کرتی ہے۔ چونکہ ابھی اس کی عمر کم ہے اس لیے اس کی ماں رانی جنداں ایجنٹ ہوگی اور مسر لال سنگھ وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہوگا۔

2- خالصہ دربار اپنی مسلح افواج کی تعداد میں کمی کرے۔ پیدل فوج بیس ہزار اور سوار بارہ ہزار سے زائد نہیں ہونی چاہیے تاکہ آئندہ اس قسم کی ناخوشگوار صورتحال پیدا نہ ہو۔

3- وہ تمام توپیں جو انگریزوں کے خلاف استعمال کی گئی ہیں، کمپنی کے حوالے کر دی جائیں۔ (ان توپوں میں زیادہ تر انگریزوں نے جنگ کے دوران ہی سکھوں سے چھین لی تھیں۔ کچھ تباہ ہوگئیں اور جواب تک سکھوں کے پاس موجود تھیں ان کی تعداد تریسٹھ تھی)

4- اگر برطانوی فوج کو کبھی پنجاب سے گزرنا پڑے تو سکھ حکومت ان کے لیے اس ضمن میں تمام سہولتیں مہیا کریگی۔

5- لاہور دربار کسی یورپی یا امریکی باشندے کو کمپنی سے اجازت لیے بغیر اپنے ہاں ملازم نہیں رکھے گی۔

6- انگریزی فوج کا ایک دستہ امنِ عامہ کی بحالی میں مدد دینے کے لیے اس سال کے آخر تک لاہور میں رہے گا۔ جس کے اخراجات لاہور دربار کے ذمے ہوں گے۔

7- لاہور دربار میں ایک برطانوی افسر ریذیڈنٹ کی حیثیت سے مقیم رہے گا۔

8- لاہور دربار ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوانِ جنگ ادا کرے گا۔

سکھوں نے باقی شرائط تو تسلیم کر لیں، لیکن تاوانِ جنگ کے بارے میں متذبذب

ہوئے۔ کیونکہ خزانہ بالکل خالی تھا اور کہیں سے اتنی بڑی رقم کی فراہمی کی امید بھی نہ تھی۔ انگریزوں نے اس مسئلے کا حل بھی پہلے یہ سوچ رکھا تھا۔ وہ یہ کہ دوآبہ بست جالندھر یعنی دریائے ستلج اور بیاس کے مابین علاقہ انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس علاقے کی مالیت کا اندازہ ایک کروڑ روپیہ لگایا گیا۔ باقی پچاس لاکھ کے عوض لاہور دربار، کشمیر اور ہزارہ کے صوبوں سے دستبردار ہو گیا اور انگریزوں نے کشمیر اور ہزارہ راجا گلاب کو دے دیا کیونکہ اس نے انگریزوں کے لیے مفید خدمات انجام دیں تھیں۔ سکھوں سے کہہ دیا گیا کہ اب راجا گلاب سنگھ ایک خودمختار حکمران ہے۔ وہ اس علاقے کے معاملات کے بارے میں صرف کمپنی کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس سلسلے میں بعدازاں 16 مارچ 1846ء کو کمپنی اور راجا گلاب سنگھ کے درمیان امرتسر میں ایک معاہدہ بھی ہوا۔

نتائج:

چونکہ جنگ میں شکست کے نتیجے کے طور پر متذکرہ بالا معاہدہ وجود میں آیا، یہ ایک انتہائی ذلت آمیز معاہدہ تھا۔ یہ یکطرفہ شرائط کا حامل عہدنامہ انگریزوں کی ہوس ملک گیری اور ان کے سامراجی عزائم کا عکاس ہے۔ یہ سب شرائط ایک فاتح قوم نے ایک مفتوح قوم پر مسلط کی تھیں۔

اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد انگریزوں کا ایک دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔ بنگال سے لے کر دہلی تک انگریزوں نے جتنی ہندوستانی خودمختار اور نیم خودمختار ریاستیں فتح کر لی تھیں، ان کے مقابلے میں پنجاب ہر لحاظ سے مضبوط اور مستحکم تھا۔ پنجاب کی فوج تقریباً انگریزوں کی فوج جیسی صلاحیتوں کی مالک تھی بلکہ مذہبی جذبے میں سکھ انگریزوں سے کہیں بڑھ کر تھے۔ یہ جذبہ سکھوں کا سب سے مؤثر ہتھیار تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر انگریزوں کا اندازہ تھا کہ ابھی کافی عرصہ تک وہ پنجاب کو فتح نہیں کر سکتے، لیکن لاہور دربار کے بعض غداروں کی ننگ وطن کارستانیوں کی وجہ سے انگریزوں کی اپنی توقعات

کے برعکس پنجاب بہت جلد سرنگوں ہو گیا۔ طاقتور سکھ فوج تباہ ہو گئی۔ سکھ قوم فرنگیوں کی محکوم ہو گئی۔ یاد رہے کہ یہ وہی قوم ہے جس کے پیشوا اور پیشرو مذہبی اور سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لیے مغلوں کی عظیم فوجی طاقت سے اس وقت ٹکرائے تھے جب ان کی حالت کا عنوان 'بے کسی' تھا۔ انہوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی مقابلہ جاری رکھا اور آخر کار اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں پنجاب میں مغل اقتدار ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں سکھوں کے پاس دور بین قیادت نہیں تھی۔ پھر بھی اس قیادت کا قومی کردار ہر لحاظ سے اطمینان بخش تھا۔ اگر چہ یہ لوگ آپس میں دست و گریبان ہی رہتے تھے، لیکن مشترکہ مقصد کے لیے انہیں متحد ہوتے بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ مسلوں کے اسی نظام سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت ابھری، جس نے بہت کم عرصہ میں خالصہ کی قوت کو ایک مرکز پر مجتمع کر کے پنجاب میں پہلی بار خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے اپنا طویل عہد اس نوزائیدہ مملکت کے استحکام میں صرف کیا، لیکن اس کے جانشین اس قدر نااہل ثابت ہوئے کہ انہوں نے صرف چھ سات برس میں رنجیت سنگھ کی چالیس سالہ محنتوں پر پانی پھیر دیا اور پنجاب محض انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا۔ جنہوں نے بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے فی الحال اپنے زیر نگیں علاقوں میں شامل نہ کیا، لیکن معاہدہ لاہور کے ذریعے اسے اتنا کمزور کر دیا کہ جب ان کا جی چاہے اسے براہِ راست اپنے ماتحت کر لیں۔ انہوں نے ڈیڑھ کروڑ تاوانِ جنگ طلب کیا، جبکہ انہیں معلوم تھا کہ لاہور کے خزانے میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ اس کے بدلے میں انہوں نے پنجاب کے زرخیز ترین علاقے ان سے چھین لیے۔ یعنی دوآبہ جالندھر، کیرا اور ہزارہ دوآبہ کے چھن جانے سے پنجاب کے دفاع کو زبردست ضعف پہنچا۔ امرتسر اور لاہور سرحد قریب ہو جانے کی وجہ سے غیر محفوظ ہو گئے۔ انہی عزائم کے پیشِ نظر سکھ فوج کی تعداد کم کر دی گئی اور دربار پر وہی غدار ٹولا مسلط رہنے دیا گیا تا کہ محبِ وطن عناصر اپنا کردار ادا نہ کر سکیں۔ لاہور دربار میں اپنا ایک آدمی ریزیڈنٹ کی حیثیت سے متعین کر دیا۔ جو درباری معاملات پر کڑی نظر رکھتا اور برطانوی مفادات کی حفاظت کرتا۔ علاوہ ازیں اس کا یہاں

کے سازشی افراد سے مسلسل رابطہ رہتا۔ اس نے لاہور میں اپنا ایک حلقۂ اثر قائم کر رکھا تھا، جس کی مدد سے وہ ہر اس کوشش کو سبوتاژ کرتا جو پنجاب میں خالصہ حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے کی جاتی۔ پہلا ریذیڈنٹ سر ہنری لارنس تھا جو اپنے وقت کا بہت بڑا سیاسی مدبر مانا جاتا تھا۔ اس نے پنجاب میں برطانیہ کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔

پنجاب۔۔۔جنگ کے بعد:

1846ء کی جنگ پنجاب کی شکست پر منتج ہوئی۔ فوج منتشر ہو گئی، معیشت تباہ ہو گئی اور پنجابی عوام مایوسی اور نا امیدی کا شکار ہو گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس نازک مرحلے میں ان کی رہنمائی کے لیے مخلص اور باصلاحیت قیادت بھی موجود نہ تھی۔

ادھر گلاب سنگھ ڈوگر کے ساتھ انگریزوں نے الگ سے ایک معاہدہ کیا گیا، جس میں اسے "مہاراجہ" کا خطاب دے کر کشمیر اور ہزارہ کا خودمختار حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ یہ سب کچھ اسے ان خدمات کے بدلے میں ملا تھا، جو اس نے پسِ پردہ دورانِ جنگ انگریزوں کے لیے انجام دی تھیں۔ اس پر مسر لال سنگھ، گلاب سنگھ اور کمپنی کے خلاف ہو گیا۔ کیونکہ اسے اپنی غداریوں کا حسبِ دل خواہ صلہ نہیں ملا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اتنے انعام کا مستحق میں ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے انگریزوں کے اس رویے کے خلاف احتجاج بھی کیا ہو، لیکن جب اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی تو وہ انگریزوں اور گلاب سنگھ کے خلاف ہو گیا اور انہیں نیچا دکھانے کی ترکیبیں سوچنے لگے اور اسے یہ موقع بہت جلد مل گیا۔ جب راجا گلاب سنگھ اپنے اختیارات سنبھالنے کے لیے کشمیر گیا تو مسر لال سنگھ نے وہاں کے حاکم شیخ امام الدین کو لکھا کہ تم اپنے عہدے پر ڈٹے رہو اور گلاب سنگھ کو ریاست کی حدود میں داخل نہ ہونے دو۔ چنانچہ شیخ امام الدین نے ایسا ہی کیا، جس کے نتیجے میں گلاب سنگھ اور امام الدین کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئیں اور گلاب سنگھ ریاست پر قبضہ نہ کر سکا۔ اس پر گلاب سنگھ نے لاہور میں سرلارنس سے

کمک کی درخواست کی۔ لارنس خود فوج لے کر گیا اور شیخ امام الدین کو شکست دے کر گلاب سنگھ کے حوالے کیا۔ شیخ امام الدین کو پکڑ لیا گیا جس نے اپنی بربریت کے لیے سارا الزام مسر لال سنگھ کے سر تھوپ دیا کہ اس نے ہی مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنے بیان کے ثبوت میں اس نے وہ تمام سرکاری خط بھی پیش کیے جو درباری پروانہ نویس پر ان چند نے لکھے تھے اور ان پر لال سنگھ کے دستخط تھے۔ جب لال سنگھ کے خلاف الزام ثابت ہو گیا تو انگریزوں نے اس پر باقاعدہ مقدمہ چلایا۔ لال سنگھ نے اپنے دفاع میں تو کچھ نہ کہا لیکن دیوان ناتھ سنگھ نے اس کی صفائی میں اپنا پورا زور و بیان صرف کیا جو اس کے کسی کام نہ آیا اور انگریزوں نے اسے سزا دی۔ پہلے اسے گھر میں نظر بند رکھا اور پھر بنارس جلاوطن کر دیا۔

معاہدہ بھیروال:

مارچ 1846ء کے معاہدے کی رو سے انگریز فوجوں کو سال کے اختتام تک لاہور سے واپس چلا جانا تھا، لیکن سکھ سردار اس عرصے میں دربار کے حالات بہتر نہ بنا سکے لہٰذا انہوں نے لارڈ ہارڈنگ سے درخواست کی کہ انگریز فوجوں کے قیام کی مدت میں توسیع کر دی جائے۔ لارڈ ہارڈنگ نے جواب دیا کہ اس کے لیے ایک نیا معاہدہ کرو۔ اس مقصد کے لیے گورنر جنرل خود لاہور آیا۔ 16 دسمبر کو انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسرا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے پر باون سرکردہ سکھ سرداروں نے دستخط کیے۔ اس معاہدے کی رو سے لاہور دربار اپنی خود مختار حیثیت سے دستبردار ہو گیا۔ رانی جنداں کو ایجنٹ کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ ایک نئی ہیئت مقتدرہ تشکیل دی گئی، جس میں لاہور دربار کے یہ آٹھ ارکان تھے۔ سردار تیج سنگھ، دیوان دینا ناتھ، سردار شیر سنگھ اٹاری والا، فقیر نور الدین، سردار نجودھ سنگھ، بھائی ندھان سنگھ، سردار عطر سنگھ کلیانوالہ اور سردار شیر سنگھ سندھانوالیہ۔ برطانوی ریزیڈنٹ سر ہنری لارنس اس کونسل کا سربراہ تھا۔ اس کونسل کی معیاد 4 ستمبر 1854ء تک تھی کیونکہ اس

تاریخ کو مہاراجہ دلیپ سنگھ قانونی طور پر بالغ ہو رہا تھا۔ یعنی اس کی عمر اس تاریخ کو سولہ سال ہوئی تھی۔

کونسل کے قیام کا مقصد گورنر جنرل نے یہ بتایا کہ انتظامی معاملات میں کم عمر حکمران کی مدد کرے گی تاکہ ملک میں کوئی بحران پیدا نہ ہو۔ حقیقت میں یہ کونسل محض دکھاوا ہی تھی۔ ہنری لارنس کسی مسئلے پر ارکان کی رائے نہ لیتا بلکہ وہی کچھ کرتا جس کا اسے گورنر جنرل کی طرف سے حکم ملتا۔ اس معاہدے کے بعد پنجاب کی آزادی اور خودمختاری ختم ہوگئی۔ سول اور فوج کے معاملات کلیۃً کمپنی کی مرضی پر منحصر تھے۔

اس معاہدے کی ایک دوسری شرط یہ تھی کہ گورنر جنرل پنجاب میں واقع قلعے کو اگر مناسب سمجھیں سکھ فوج سے خالی کروالیں اور وہاں برطانوی فوج تعینات کر دیں۔ دس ہزار سپاہی پہلے ہی مہاراجہ دلیپ سنگھ اور پنجابی عوام کے تحفظِ جان و مال کے نام پر لاہور میں مقیم تھے جب کہ ان کا اصل مقصد پنجاب میں برطانوی مفادات کی حفاظت کرنا تھا۔

رانی جنداں چونکہ انگریزوں کے عزائم کی راہ میں حائل تھی اور وقتاً فوقتاً ان کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرتی رہتی تھی اس لیے انگریزوں نے پہلے تو اسے اقتدار سے الگ کر کے اس کی ڈیڑھ لاکھ پنشن مقرر کر دی، لیکن جب رانی جنداں نے لاہور میں اپنے حامیوں سے ملنا شروع کر دیا تو انگریزوں کو بے حد تشویش لاحق ہوئی۔ لہٰذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ رانی کو دارالحکومت سے کہیں اور منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ اگست 1846ء میں رانی جنداں کو شیخوپورہ کے قلعے میں محبوس کر دیا گیا، اور اس کی پنشن کی رقم بھی دو تہائی کم کر دی گئی۔ یعنی اڑتالیس ہزار روپے سالانہ گھٹا دی۔

انگریزوں اور سکھوں کی دوسری جنگ:

اسباب: انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری جنگ 49-1848ء میں ہوئی۔ اس جنگ کے اسباب بہت سے تھے۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ پنجاب کے عوام

عموماً اور سکھ خصوصاً 1846ء کی شکست کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ اس شکست کے بعد انگریزوں نے پنجاب پر ایک ایسا سمجھوتہ مسلط کیا، جس کی ہر شرط انگریزوں کے استعماری عزائم کی آئینہ دار تھی۔ شکست خوردہ پنجابی عوام کی تالیفِ قلب کے لیے کچھ نہ کیا گیا، بلکہ سکھ یہ باور کرنے پر مجبور ہو گئے کہ مفتوح قومیں ایسے ہی سلوک کی سزا وار ہوتی ہیں۔ انگریزوں نے تمام سول اور فوجی معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ پنجابیوں کو اپنے ملک کے معاملات میں حصہ لینے کے حق سے محروم کر دیا۔ راجا لال سنگھ اگرچہ غدار تھا لیکن انگریزوں نے جب اسے سزا دی تو سکھوں نے اسے اپنے قومی وقار پر حملہ قرار دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے رانی جنداں سے توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ مادرِ ملکہ ہونے کی وجہ سے سکھ اسے ''خالصہ پنتھ کی ماں'' سمجھتے تھے۔ اسے اپنا سیاسی اور مذہبی قائد جانتے تھے۔ انگریزوں نے پہلے رانی کو اختیارات سے الگ کیا۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ رانی کا دارالحکومت میں رہنا خطرے کا باعث ہو سکتا ہے تو انہوں نے اسے شیخوپورہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ یہاں سے رانی جنداں نے گورنر جنرل کے نام خط لکھے جس میں اس رویہ پر احتجاج کیا اور کہا کہ تم مکار اور عیار لوگوں نے بظاہر ہمارا تخت و تاج برقرار رکھا ہوا ہے، لیکن درحقیقت تم نے ہمارے اپنے ملک میں ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ تمہیں ان باتوں سے باز آ جانا چاہیے۔ لیکن انگریزوں نے رانی جنداں کی ان درخواستوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ جب سکھوں کو ان حالات کا علم ہوا تو ان میں انتقام کا احساس تیز تر ہو گیا۔ انگریزوں نے اس پر بس نہ کی بلکہ مئی 1848ء میں برطانوی مفادات کے خلاف سازش میں شریک ہونے کے الزام میں رانی جنداں کو پنجاب سے جلاوطن کر دیا گیا اور اسکی پنشن ایک بار پھر کم کر دی گئی۔ اب اس کی پنشن بارہ ہزار روپے سالانہ مقرر ہوئی، جو اس کے اخراجات کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ اس واقع پر سکھ اور زیادہ برانگیختہ ہوئے اور انہوں نے انگریزوں سے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس وقت ان کا کوئی رہنما نہیں تھا جو ان کی طاقت اور جذبے کو کسی منصوبہ بندی کے تحت استعمال کرتا لیکن اس جنگ کی فوری وجہ ملتانی عوام کی بغاوت ہے، جس کی

تفصیل یوں ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں دیوان مل ملتان کا حاکم تھا۔ 1844ء میں اس کے مرنے پر اس کا لڑکا دیوان مولراج جانشین ہوا۔ لاہور دربار نے اس سے تیس لاکھ روپیہ نذرانہ طلب کیا، جو اس نے ادا کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ بالآخر اٹھارہ ہزار پر فیصلہ ہوا۔ اس نے ادائیگی کا وعدہ کیا لیکن اس دوران جنگ چھڑ گئی اور ادائیگی کی نوبت نہ آئی۔ جنگ کے ختم ہونے پر بھی بدستور ادائیگی ملتوی ہوتی رہی۔ سر ہنری لارنس کو ریزیڈنٹ بنے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ وہ بیمار پڑ گیا اور علاج کے لیے واپس انگلستان چلا گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی جان لارنس ریزیڈنٹ مقرر ہوا۔ اسے بھی جلد ہی واپس جانا پڑا۔ اس کے بعد سر فیڈرک کوری ریزیڈنٹ بنا یہ شخص جو برطانوی حکومت کا سابق چیف سیکرٹری تھا، پنجاب کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔ اس نے اپریل 1848ء کو اپنا منصب سنبھالا۔ اس نے آتے ہی گورنر ملتان سے بقایا جات کی وصولی کی کوشش کی۔ مولراج لاہور آ گیا اور اس نے کہا کہ میں ادائیگی کر دوں گا، لیکن مسٹر کیوری نے اس سے پچھلے دس سالوں کا خراج نئی شرح کے مطابق طلب کیا، اس نے جواب دیا کہ مجھے تو گورنر بنے ابھی چار سال ہی ہوئے ہیں لہٰذا اس سے پہلے کے چھ سالوں کی رقم میرے ذمے ہے ہی نہیں۔ دوسرے مجھ سے کئی ضلعے دوسرے صوبوں کو منتقل کر دیے گئے ہیں، جس کی وجہ سے میری آمدنی کم ہو گئی، اندریں حالات میں اتنی بڑی رقم ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ جب مسٹر کیوری نے اس کے مؤقف کو اہمیت نہ دی تو مولراج نے دسمبر 1847ء میں مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا اور مسٹر کیوری سے کہا کہ آپ لوگ اپنا آدمی بھیج کر ملتان کے قلعے کو اپنی تحویل میں لے لیں۔ میرے ذمے آپ کی جتنی رقم ہے وہ میں مارچ 1848ء تک ادا کر دوں گا کیونکہ اس اثناء میں نئی فصل اتر چکی ہوگی۔ چنانچہ سردار کاہن سنگھ مان کو ملتان کا نیا گورنر نامزد کیا گیا۔ کیوری نے برطانوی فوج کا ایک گورکھا دستہ جس میں چھ سو پیدل سوار اور پانچ سو سوار تھے، مسٹر گینو اور لیفٹیننٹ اینڈرسن کی قیادت میں نئے گورنر کاہن سنگھ مان اور مولراج کے ساتھ ہی ملتان بھیجا۔ اس دستے کے ساتھ چھ توپیں بھی تھیں۔ مولراج تو شہر میں چلا گیا اور انگریز افسر اپنی

فوج کے ساتھ شہر کے باہر عید گاہ کے میدان میں خیمہ زن ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے دن قلعے کو رسمی طور پر اپنے تصرف میں لے لیا جائے۔

دوسرے دن یعنی 19 اپریل کو برطانوی افسر فوج کے ساتھ قلعے میں گئے۔ مولراج انہیں قلعے کی چابیاں پیش کر کے خود وہاں سے دستبردار ہو گیا۔ انگریز افسروں نے قلعے کا معائنہ کیا۔ ملتان کی مقامی فوج کو برخواست کر کے قلعے کے دروازوں پر اپنے سپاہی متعین کر دیے۔ اس دوران یہ کارروائی دیکھنے کے لیے ملتانی عوام کا ایک بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف غم و غصے کے جذبات کا اظہار کیا۔ جب انگریز افسر قلعے سے باہر آئے اس وقت دیوان مولراج بھی گھوڑے پر سواران کے ہمراہ تھا۔ انگریزوں کو دیکھتے ہی ہجوم بے قابو ہو گیا۔ مولراج نے عوام سے پرامن رہنے کی اپیل کی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انگریز افسر اس صورتحال سے بہت پریشان تھے، کیونکہ یہ سب کچھ ان کی توقعات کے برعکس تھا۔ انہیں مولراج کے خلوصِ نیت پر یقین تھا اور واقعتاً اس ہنگامے میں مولراج کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔ لاہور سے چلتے وقت ان کا خیال تھا کہ وہ بڑے اطمینان سے ملتان پر قبضہ کر لیں گے، اس لیے وہ اپنے ساتھ مختصری فوج لائے تھے۔

ہنگامہ آہستہ آہستہ زور پکڑتا گیا۔ اچانک چند آدمیوں نے بڑھ کر انگریز افسروں پر حملہ کر دیا۔ ان کی قیادت ایک شخص امر چند نامی کر رہا تھا۔ وہ ایک سابق فوجی تھا، اور اس کے ساتھ وہ لوگ تھے جنہیں اسی دن مسٹر اگینو نے ملازمت سے الگ کیا تھا۔ امر چند نے مسٹر اگینو پر نیزے سے وار کیا۔ مولراج اور اس کا برادر نسبتی رام رنگ، اگینو کو بچانے کے لیے لپکے، اگینو زخمی ہوا، لیکن زخم مہلک نہیں تھا۔ اسی اثناء میں کسی نے لیفٹیننٹ اینڈرسن پر بھی حملہ کیا اور وہ شدید زخمی ہوا۔ اتنے میں سرکاری حفاظتی دستہ پہنچ گیا۔ وہ لوگ اپنے افسروں کو مظاہرین سے بچا کر واپس عید گاہ میں لے گئے۔ وہاں سے مسٹر اگینو نے لاہور سارا واقعہ لکھ کر کمک کے لیے درخواست کی۔ اس کے علاوہ اس نے ڈیرہ فتح خاں میں

لیفٹیننٹ ایڈورڈز اور ڈیرہ اسماعیل خان میں جنرل وال کورٹ لینڈ کو بھی فوری امداد کے لیے بلایا۔ مولراج نے اس واقعے سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرنے کے لیے ان انگریز افسروں سے ملنا چاہا، لیکن انہوں نے اسے ملنے کی اجازت نہ دی، بلکہ کہا کہ وہ مقررین کو گرفتار کر کے انگریزی کیمپ میں بھیج دے۔ اس نے جواب بھیجا کہ تمام فوج بغاوت کر چکی ہے۔ عوام ان کے ساتھ ہیں اور میں بے بس ہوں آپ لوگ اپنی جانیں بچانے کا بندوبست کریں۔

باغیوں نے مولراج سے کہا کہ وہ ان کی قیادت کرے، لیکن اس نے حامی نہ بھری کیونکہ وہ فطری طور پر بزدل واقع ہوا تھا۔ اس کے برادرِ نسبتی رام رنگ نے باغیوں کو مزید کارروائی سے باز رکھنے کی کوشش کی، جب وہ نہ مانے تو اس نے انہیں برا بھلا کہا۔ اس پر ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر رام رنگ پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں وہ ہلاک ہو گیا۔ اس ہنگامے میں مولراج کا گھوڑا بدک گیا اور وہ گھوڑے سے گر کر زخمی ہوا۔ اس کے بعد باغیوں نے ایک انقلابی مجلس تشکیل کی اور فرنگیوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنے کے لیے مسلمانوں نے قرآن شریف پر، سکھوں نے گرنتھ پر اور ہندوؤں نے شاستروں پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا۔ باغی سپاہیوں نے ایک بار پھر مولراج کو اپنا قائد بننے پر مجبور کیا۔ اب کے اس نے اپنی والدہ سے مشورہ چاہا، جس نے اسے کہا مردانہ کردار کا مظاہرہ کرو، ہمت نہ ہارو اور باغیوں کے ساتھ مل جاؤ۔ اس کے بعد اس نے اپنے افسروں کا دربار بلایا اور باغیوں کی قیادت سنبھال کر انگریزوں کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ اسی دوران لاہور سے آئی ہوئی سرکاری فوج کے دیسی سپاہی بھی باغیوں سے مل گئے۔ صرف گورنر کا امیدوار کاہن سنگھ مان اور چند سپاہی انگریز افسروں کی حفاظت کے لیے عیدگاہ میں باقی رہ گئے۔

20 اپریل 1848ء کو ملتانی فوج اور عوام نے عیدگاہ کا محاصرہ کر لیا اور سردار کاہن سنگھ مان کو گرفتار کر کے دونوں انگریز افسروں کو ہلاک کر دیا، اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی۔ جب دیوان مولراج کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے فوراً دونوں لاشوں کو دفن کرا دیا۔ لیکن سکھوں نے انتقامی جذبے کے تحت ان کی قبروں کو کھود کر لاشیں پھر نکال لیں۔ اس پر

مولراج نے لاشوں کو دوبارہ دفن کرایا اور قبروں پر پہرہ بٹھا دیا۔

مسٹر اگنیو کا پیغام سب سے پہلے لیفٹیننٹ ایڈورڈز کو ملا۔ جو ان دنوں بنّوں میں تھا۔ وہ فوراً اپنی مختصر نفری کے ساتھ ملتان کی طرف روانہ ہوا، لیکن راستے میں اس کے دیسی سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ جس کے باعث وہ ملتان نہ پہنچ سکا۔ چند دن بعد جنرل کورٹ لینڈ چار ہزار فوج کے ساتھ اس سے آ ملا۔ ملتانی باغیوں کے ساتھ ان کا پہلا تصادم 21 مئی 1848ء کو ڈیرہ غازی خان میں ہوا۔ سرکاری فوج کو کچھ مقامی سرداروں نے تقویت پہنچائی۔ مولراج کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر واقع اپنے مقبوضات سے محروم ہو گیا۔

کمک طلب کرنے کے ابتدائی پیغامات کے بعد لاہور اور ڈیرہ غازی خان میں دونوں انگریز افسروں کی موت کی خبر بھی پہنچ گئی، لیکن لاہور سے ریزیڈنٹ مسٹر کیوری نے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ جب اسے پہلی بار ملتان کے ہنگامے کی اطلاع ملی تو اس نے انتظامی کونسل کا اجلاس طلب کیا، جس میں اس نے سکھ سرداروں سے کہا کہ وہ ملتان کی بغاوت فرو کریں۔ سکھ سرداروں نے اس کے جواب میں اپنی نااہلیت کا اعتراف کیا۔ اس کی رپورٹ ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو بھیج دی کہ سکھ اس بحران پر جان بوجھ کر قابو پانا نہیں چاہتے۔ اگر پنجاب میں امن قائم کرنا کمپنی ہی کی ذمہ داری ہے تو پھر مہاراجہ دلیپ سنگھ کو گدی پر فائز رکھنے میں کیا فائدہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب کا انتظام براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیں اور دلیپ سنگھ کی مہاراجگی برقرار رکھنے کے لیے ہمیں انگریزی مال و جان کا مزید ضیاع نہیں کرنا چاہیے۔

ملتان کی بغاوت کے بارے میں برطانوی طرزِ عمل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس شہر کی شورش کو تمام پنجاب میں پھیلانے میں انگریزوں کی اپنی مرضی شامل تھی ورنہ اس بغاوت کو ابتداء ہی میں دبا دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب بغاوت کی اطلاع لاہور پہنچی تو ریزیڈنٹ نے انتظامی کونسل کے مقامی ارکان کو اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے

کے لیے کہا۔ حالانکہ اگر وہ کسی قابل ہوتے تو انگریز فوج کو اپنی امداد کے لیے کیوں بلاتے۔ یعنی پنجاب کی داخلی سلامتی کا تحفظ لاہور میں مقیم برطانوی فوج کی ذمہ داری تھی، جس کے لیے انہیں لاہور دربار سے تنخواہ ملتی تھی، لیکن انگریز حکام نے کیوری اور ڈلہوزی کی پنجاب کے بارے میں ترمیم شدہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے سے دانستہ اغماض برتا۔ ڈلہوزی چند روز قبل ہارڈنگ کی جگہ گورنر جنرل بنا تھا۔ اسے پنجاب کے متعلق ہارڈنگ کی پالیسی سے بنیادی اختلاف تھا۔ وہ یہ مقصد لے کر ہندوستان آیا تھا کہ برطانوی حکومت کی سرحد جلد دریائے سندھ تک پہنچادی جائے، اس کے لیے اسے موقع کی تلاش تھی، جو اسے جلد ہی ملتان میں گڑبڑ کی وجہ سے مل گیا۔

مسٹر کیوری کو جب ملتان کی بغاوت کی اطلاع ملی اور سکھ سرداروں نے اس ضمن میں اپنی بے بسی ظاہر کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ برطانوی فوجوں ہی کو استعمال میں لایا جائے، تو کیوری نے جواب دیا کہ وہ گورنر جنرل سے اس بارے میں استفسار کرے گا تو گورنر جنرل نے اسے مناسب کارروائی کی اجازت دے دی، لیکن کیوری نے پھر بھی کچھ نہ کیا۔ اس کے لیے اس نے یہ بہانہ بنایا کہ موسم گرما میں انگریز فوج کے لیے جنگ کرنا ممکن نہیں۔ حالانکہ برطانوی فوج میں انگریز مقامی لوگوں کی نسبت بہت کم تعداد میں تھے، اس لیے اس کا یہ بہانہ بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں تھا۔ ایک انگریز افسر لیفٹیننٹ ایڈورڈز نے مسٹر کیوری کو اس کا مثبت جواب دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم نے ہندوستان کے تمام اہم معرکے موسم گرما ہی میں لڑے ہیں۔ بذاتِ خود ایڈورڈز ملتان کی مہم سر کرنے کے لیے بنوں سے پہنچ چکا تھا۔

لارڈ ہارڈنگ کو اپنے وعدے کا پاس تھا کہ لاہور دربار کی خودمختاری کا تحفظ کمپنی کی ذمہ داری ہے۔ اسے معلوم تھا کہ مستقبل قریب میں پنجاب بغاوت کرے گا۔ اس متوقع صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اس نے خاطر خواہ انتظامات کر لیے تھے۔ اس نے لاہور، فیروز پور اور جالندھر میں تین موبائل بریگیڈ محض اس مقصد کے لیے تعینات کیے تھے۔

یہ تینوں ہر وقت حرکت میں آنے کے لیے تیار رہتے۔ اس موقع پر اس قوت کو فوراً میدان میں لایا جا سکتا تھا، لیکن اپنی اصل اغراض پوری کرنے کے لیے کیوری نے ایسا نہ کیا اور اس وقت کا انتظار کیا کہ جب بغاوت کے شعلے سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ چنانچہ وہی ہوا جو انگریز چاہتے تھے۔

اس دوران میں محض یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ملتان کی بغاوت کچلنے کی کوشش کی گئی تھی، مسٹر کیوری نے جنرل وہش کو دیسی اور گورا فوج کے ساتھ اور سردار شیر سنگھ اٹاری والا کو لاہور دربار کی فوج دے کر بھیجا۔ لیفٹیننٹ ایڈورڈز کو شمال مغربی جانب سے ملتان پہنچنے کا حکم ہوا۔ اس کے پاس دو ہزار اپنی اور دو ہزار جنرل کورٹ لینڈ کی فوج کے علاوہ چار توپیں بھی تھیں۔ بہاولپور کے حکمران نواب بہاول خان کو حکم دیا گیا کہ وہ ملتان پر مشرق سے یلغار کرے جو اپنی ساڑھے آٹھ ہزار سپاہ گیارہ بڑی اور تین سو دو چھوٹی توپیں لے کر جلد ہی لیفٹیننٹ ایڈورڈز کے پاس پہنچ گیا۔ اس فوج کی قیادت ایک انگریز لیفٹیننٹ لیک کر رہا تھا۔ اس وقت دیوان مولراج کے پاس صرف دو ہزار تربیت یافتہ سپاہی تھے۔ آہستہ آہستہ گرد و نواح کے عوام آ کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اسی دوران اس نے قلعے کو مستحکم کرنے پر خاص توجہ دی۔ قلعے کے چاروں طرف خندق کھدوائی۔ برجوں کو مضبوط کیا۔ سرکاری فوج کا اہم معرکہ کنیری میں 18 جون 1848ء کو ہوا۔ یہ جنگ لیفٹیننٹ ایڈورڈز کی قیادت میں لڑی گئی کیونکہ جنرل وہش ابھی تک ملتان نہیں پہنچ پایا تھا۔ نو گھنٹے کے اس خونچکاں معرکے میں انگریز فتح یاب ہوئے۔ مولراج کے ایک ہزار آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اس کی آٹھ توپیں انگریزوں نے چھین لیں، اس شکست کے بعد دریائے سندھ اور دریائے چناب کے درمیان تمام علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ مزید برآں چناب اور ستلج کے درمیانی علاقے پر سے بھی مولراج کی گرفت کمزور ہو گئی۔ اس جنگ میں انگریزوں کے دو سو سینتالیس سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ اس فتح کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو دن بعد 20 جون کو شجاع آباد کے قلعدار نے بھی انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی۔ آہستہ آہستہ انگریز فوج

نے تمام علاقے پر قبضہ کرلیا اور مولراج ملتان میں محصور ہوکر رہ گیا۔

اس کے بعد بھی معمولی نوعیت کے کئی معرکے ہوئے۔ اسی دوران میں سکھوں کا سب سے بڑا روحانی پیشوا بھائی مہاراج سنگھ بھی اپنے پیروؤں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ملتان پہنچ گیا، جس سے مولراج کی قوت میں کافی سارا اضافہ ہوا۔ یہ شخص بھائی ویر سنگھ کا جانشین تھا، جس کا سکھ بہت احترام کرتے تھے۔ جب بھائی مہاراج سنگھ واضح طور پر پنجاب کے عوام کی اس بغاوت میں شامل ہوگیا تو پھر یہ جنگ سکھوں کے نزدیک مذہبی تقدس کی حامل ہوگئی اور وہ جوق در جوق مولراج کے پرچم تلے جمع ہونے لگے۔ اس سے قبل سکھ سمجھتے تھے کہ ملتانیوں نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے خلاف بغاوت کی ہے لیکن بھائی مہاراج سنگھ نے پنجاب کے تمام علاقوں کا دورہ کرکے اس تاثر کو غلط قرار دیا اور کہا کہ یہ تو 'دھرم یدھ' ہے، جس میں شامل ہونا ہر سکھ کا مذہبی فریضہ ہے۔ اس کے بعد اس تحریک نے بہت زور پکڑا۔

جنرل وہش اپنی فوج کے ساتھ چار ستمبر 1848ء کو ملتان پہنچا۔ اس وقت لیفٹیننٹ ایڈورڈز ملتان کے پاس ہی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے پاس آٹھ ہزار پیدل اور چار ہزار سوار سپاہی تھے۔ لیفٹیننٹ لیک ساڑھے پانچ ہزار پیدل اور دو ہزار سوار فوج کی کمان کر رہا تھا۔ لاہور کے ایک سردار راجا شیر سنگھ اٹاری والا کے پاس نو سو پیدل اور چار ہزار سواروں کا دستہ تھا۔ جنرل وہش کے آٹھ ہزار سپاہی شامل کرکے اس فوج کی کل تعداد بتیس ہزار ہوگئی۔ ان کے پاس پینتیس بڑی توپوں کے علاوہ چار مارٹر بھی تھے۔ اس کے مقابلے میں مولراج کے پاس بارہ ہزار فوج چون بھاری توپیں اور چار مارٹر تھے۔ اس نے دفاعی اعتبار سے قلعے کو ناقابلِ تسخیر بنا رکھا تھا۔

اسی دوران میں کچھ ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف سارے پنجاب میں ایک عام نفرت پھیل گئی۔ پہلا واقعہ سردار چتر سنگھ اٹاری والا کے متعلق ہے، جو ان دنوں ہزارہ کا گورنر تھا۔ ایک انگریز میجر جیمز ایبٹ اس کا نائب تھا۔ پہلے تو ایبٹ سکھ سردار کے ساتھ مکمل تعاون کرتا رہا، لیکن اچانک اس کا رویہ بدل گیا۔ یہاں تک کہ اس کا

طرزِ عمل گستاخانہ ہو گیا۔ سردار چتر سنگھ نے جب اسے اس بات پر سرزنش کی تو اس نے سرحد کے قبائلی لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکا دیا۔ جب سردار چتر سنگھ نے اپنے ایک دوسرے نائب کرنل کونزا کو، جو امریکی تھا اور لاہور دربار کا ملازم تھا، یہ بغاوت فرو کرنے کا حکم دیا تو اس نے تعمیل سے انکار کر دیا۔ سردار نے امریکی کرنل کو حکم عدولی پر موت کی سزا دی اور خود قبائلی حملے سے بچنے کے لیے ہزارہ کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ ایبٹ نے قتل کے اس واقعہ کو بڑھا چڑھا کر اپنے اعلیٰ حکام تک پہنچایا اور کہا کہ چتر سنگھ صریحاً بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس کے خلاف فوراً کارروائی کی جائے۔ چنانچہ مسٹر کیوری نے ایک انگریز مسٹر نکلسن کو کچھ فوج کے ساتھ سردار چتر سنگھ کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا۔

دوسرا واقعہ رانی جنداں کی جلاوطنی کا ہے۔ انگریزوں نے اس کی بہت توہین کی اور اسے بنارس لے جا کر قید کر دیا۔ سکھ لوگ رانی سے جذباتی عقیدت رکھتے تھے۔ اس کی توہین پر وہ انگریزوں کی خود غرض حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ پنجاب میں عام بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی اور یہی انگریزوں کا منصوبہ تھا۔

اس بغاوت کے دو مرکز تھے ایک ملتان اور دوسرا سرحدی صوبہ۔ سرحد میں باغیوں کا قائد سردار چتر سنگھ اٹاری والا بھی مقیم تھا۔ جب کہ چتر سنگھ کا لڑکا راجا شیر سنگھ ملتان میں انگریزوں کے ساتھ ملتانیوں کے محاصرے میں شریک تھا۔ چتر سنگھ نے خط کے ذریعے اسے سارے واقعے کی اطلاع دی۔ اس سے قبل بھی وہ ہزارہ کی تشویشناک صورتِ حال کے بارے میں افواہ سن چکا تھا۔ باپ کا خط ملنے پر وہ مشکل میں پڑ گیا، لیکن انگریزوں کا ساتھ نہ چھوڑا۔ 6 ستمبر کو محاصرہ شروع ہوا۔ 9 ستمبر کو شیر سنگھ نے ملتانیوں کے ساتھ ایک زبردست معرکہ مارا، جس پر ایک انگریز افسر نے اسے سرکاری طور پر خراجِ تحسین پیش کیا۔ اسی اثناء میں کسی نے اسے بتایا کہ اس کا باپ ہلاک کر دیا گیا ہے۔ اس پر بھی اس نے انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری کو نہ توڑا اور بدستور ان کا اتحادی رہا۔ لیکن 13 ستمبر کو ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے باعث راجا شیر سنگھ اپنے لیے ایک نئی راہ اختیار کرنے پر

مجبور ہو گیا۔ ہوا یوں کہ اس رات شیر سنگھ افسروں سے تبادلہ خیال کے لیے ان کی طعام گاہ میں گیا تو وہاں اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی۔ شیر سنگھ کو جب اس سازش کا علم ہوا تو وہ فوراً اپنی فوج میں واپس چلا گیا اور فوج کے ساتھ انگریزی کیمپ چھوڑ دیا اور اس نے مولراج سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب انگریزوں نے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ شیر سنگھ ایک خطرناک منصوبے کے تحت انگریزوں کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بظاہر انگریزوں سے ناراض ہو کر مولراج سے ملنے کی کوشش کرے۔ جب اسے اور اس کی فوج کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے گی، تو وہ اچانک شہر کے دروازوں پر قبضہ کر کے انہیں برطانوی فوج کے لیے کھول دے گا۔ اس طرح انگریز شیر سنگھ کی حقیقی ناراضگی کو بہروپ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اس کے بعد شیر سنگھ نے مولراج کو ہزار بار اپنے خلوص کا یقین دلایا، لیکن اس نے نہ ماننا تھا، نہ مانا اور بالآخر شیر سنگھ شکستہ دل ہو کر 9 اکتوبر کو شمال کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اپنے باپ کے ساتھ شامل ہو سکے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرا سکھ اور دوسرے پنجابی عوام اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ الغرض وہ بغاوت، جو ملتان کے چند فوجیوں نے بغیر سوچے سمجھے شروع کی تھی، اب پنجابیوں کے لیے ایک قومی جنگ کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔

لاہور، امرتسر، جالندھر دوآب، ڈیرہ جات اور پورا سرحدی علاقہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام مقامات سے لڑاکا جھتے ملتان اور سرحد میں پہنچنے لگے۔ ان دنوں سردار چتر سنگھ کوہاٹ میں مقیم تھا۔ اس نے کابل کے حکمران امیر دوست محمد سے مدد چاہی۔ اس نے افغانوں کو پیشکش کی کہ پشاور تک کا علاقہ وہ لے لیں۔ اس کے بدلے میں وہ انگریزوں کو پنجاب سے نکالنے میں ہماری مدد کریں۔ امیر دوست محمد نے یہ بات مان لی اور اپنے دربار میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ جارج لارنس کو واپس چلے جانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد اس نے پہلے پشاور پر قبضہ کیا اور پھر اٹک کے قلعے سے نکلسن کو مار بھگایا۔

جب ہر طرف شورش برپا ہوگئی تو گورنر جنرل ڈلہوزی اور کمانڈر انچیف لارڈ گف نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے سردار چتر سنگھ کی سرکوبی کرنی چاہیے اور بعدازاں جب بمبئی سے مزید مدد آ جائے تو پھر ملتان پر توجہ دی جائے۔ چنانچہ 9 اکتوبر 1848ء کو لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

ملتان کا پہلا محاصرہ:

ملتان کا پہلا محاصرہ 7 ستمبر 1848ء شروع ہوا۔ فریقین کی فوجی طاقت کے بارے میں اعداد و شمار پہلے دیئے جا چکے ہیں۔ مولراج نے تیز رفتار دستے تیار کیے۔ وہ اچانک شہر کے کسی دروازے سے نکلتے، انگریزوں پر حملے کرتے اور بھاگ کر شہر میں واپس چلے جاتے۔ انگریز کچھ عرصہ تو اس صورتِ حال کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن جب دیسی سپاہی بھی قابلِ اعتماد نہ رہے اور فوری کمک کی توقع بھی پوری نہ ہوئی، انگریزوں کی ہائی کمان نے محاصرہ اٹھا لینے کا فیصلہ کیا۔

ملتان کا دوسرا محاصرہ اور فتح:

بمبئی سے بریگیڈیئر ڈنڈاس ایک ڈویژن فوج لے کر 21 دسمبر 1848ء کو ملتان پہنچا۔ 27 دسمبر سے محاصرہ شروع ہوا۔ اسی دوران مولراج نے قلعے اور شہر کو مزید مضبوط اور محفوظ بنا لیا تھا، لیکن جب اس نے انگریزوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھا تو اس نے ملتان سے نکل جانا چاہا۔ اس کا ارادہ تھا کہ شمالی علاقے میں چلا جائے اور وہاں سردار چتر سنگھ کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑے، لیکن انگریزوں نے سارے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ اس سے قبل وہ ایک بار انگریزوں سے صلح کی درخواست کر چکا تھا، جو مسترد کر دی گئی تھی۔ اب اس کے پاس سامانِ رسد کی بھی قلت پیدا ہو چکی تھی۔ گولہ بارود کے ذخیرے بھی ضرورت سے بہت کم تھے۔ محاصرے کے وقت مولراج کے پاس بارہ ہزار

لڑاکا سپاہی تھے اور انگریزوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔ ان کے پاس سو توپیں بھی تھیں۔

انگریزوں نے سب سے پہلے ملتان کے مضافات پر قبضہ کیا۔ اس دوران میں مولراج کے چھوٹے چھوٹے دستے انگریزوں پر اچانک حملے کرتے رہے۔ وہ تھوڑا بہت نقصان کرنے کے بعد واپس شہر میں چلے جاتے۔ اب انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ شہر فتح کیا جائے اور پھر وہاں سے قلعے پر یلغار کی جائے۔ برطانوی توپخانہ شہر پر مسلسل گولہ باری کرتا رہا۔ 30 دسمبر کو گولے قلعے میں گولہ بارود کے ذخیرے پر گرے۔ وہاں اس وقت پانچ ہزار من بارود تھا، جو ایک زبردست دھماکے کے ساتھ تباہ ہو گیا۔ اس دھماکے سے پانچ سو آدمی موقعے پر ہی ہلاک ہو گئے۔ اس ناقابلِ تلافی نقصان کی وجہ سے محصور فوج اور عوام کے حوصلوں پر بہت برا اثر پڑا۔ ان کی قوتِ مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ 2 جنوری کو برطانوی توپوں نے شہر کی فصیل میں دو بڑے شگاف ڈال دیئے۔ 3 جنوری کو انگریزوں نے ان شگافوں کے ذریعے شہر میں داخل ہونا شروع کیا اور ہولناک دست بدست لڑائی کے بعد شہر پر قابض ہو گئے۔

شہر کھو دینے کے بعد مولراج کی فوج نے قلعے میں مقابلہ شروع کیا۔ مولراج نے ایک بار پھر انگریز فوج کے کمانڈر جنرل وہش کو پیغام بھیجا کہ اگر میری اور میری بیوی کی زندگی کی ضمانت دی جائے تو میں قلعہ خالی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جنرل وہش نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ انگریزوں نے قلعے کا محاصرہ اس قدر سختی سے کر رکھا تا کہ کسی جانب سے بھی مولراج کو رسد وغیرہ نہ مل سکی۔ جب ان کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو گئی تو 22 جنوری کو مولراج نے قلعے کے دروازے کھول دیئے اور اپنے تین چار ہزار باقی ماندہ سپاہیوں کے ساتھ انگریزی کیمپ میں ہتھیار ڈال دیئے۔ انگریزوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا اور اس طرح ملتان کا دوسرا محاصرہ نتیجہ خیز ثابت ہوا اور پنجابی عوام کی بغاوت کا ایک مرکز سرنگوں ہو گیا۔

اس مہم میں برطانوی فوج کے دو سو دس آدمی ہلاک اور نو سو بیاسی زخمی ہوئے۔

مولراج پر بعد میں مقدمہ چلایا گیا، جس میں اسے موت کی سزا دی گئی، لیکن پھر اس

سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا، کیونکہ انگریزوں کے نزدیک مولراج دل سے اس بغاوت میں شریک نہیں ہوا تھا بلکہ اسے مجبوراً یہ باغیانہ کردار ادا کرنا پڑا تھا۔

شمالی محاذ:

جنگی کونسل اور گورنر جنرل سے مشورے کے بعد کمانڈر انچیف لارڈ گف نے شمالی محاذ کو اوّلیت دی اور خود بھی ذاتی نگرانی کی غرض سے اس محاذ پر آ گیا۔ 21 نومبر 1848ء کو وہ سہارن (Saharan) میں مقیم اپنی فوج سے آ کر ملا۔

رام نگر:

ان دنوں راجا شیر سنگھ دریائے چناب کے دائیں کنارے پر واقع ایک قصبے رام نگر میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس کے پاس پندرہ ہزار نفری تھی اور اس نے توپخانے سے قلعہ بندی کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی بیشتر قوت دوسرے کنارے پر بھی موجود تھی۔ بریگیڈیئر کیمبل (Brig: Campbell) اور بریگیڈیئر کرٹن (Brig: Cureton) نے یکم دسمبر کو حملے کا آغاز کیا، لیکن سکھوں نے یہ حملہ پسپا کیا۔ پھر عام حملہ شروع ہو گیا۔ لیکن رام نگر کی لڑائی کسی فریق کی فتح و شکست کے فیصلے کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔ اس جنگ میں سکھوں کا پلہ بھاری رہا۔ اس معرکے میں کئی معروف انگریز افسر ہلاک ہوئے۔

سعد اللہ پور:

2 دسمبر 1848ء کو میجر جنرل سر جوزف تھیک ویل نے وزیر آباد سے دریائے چناب عبور کیا۔ اس کے بعد باقی فوج بھی دریا پار کر گئی۔ اس کا مقصد دریا کے دوسری جانب مقیم سکھ فوج پر حملہ کرنا تھا۔ اسی دوران میں شیر سنگھ رام نگر ہی میں رہا، جہاں اس نے زبردست مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ 5 دسمبر کو کمانڈر انچیف لارڈ گف بھی تھیک ویل کی فوج سے آ ملا۔ اس نے آتے ہی سکھوں پر شدید گولہ باری شروع کر دی۔ سکھوں نے بھی جواباً گولے

برسائے۔ شیر سنگھ نے اپنی مورچہ بندی سے باہر نکل کر برطانوی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ لیکن وہ جم کر نہ لڑ سکا بلکہ اپنی تمام فوج اور توپخانے کے ساتھ جہلم کی طرف پسپا ہو گیا۔

اب شیر سنگھ دریائے جہلم کے کنارے 'رسول' نامی مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ اس وقت اس کے پاس تقریباً پچاس ہزار فوج اور باسٹھ توپیں تھیں۔ لیکن اس کے پاس سامانِ رسد کی سخت قلت تھی۔ اس وقت انگریز فوج اس کے تعاقب میں رسول سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں ڈنگی تک پہنچ چکی تھی۔ 13 دسمبر کو شیر سنگھ نے انگریزوں سے سامانِ رسد چھیننے کے لیے اچانک ان پر حملہ کیا لیکن یہ حملہ کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ اسی دوران میں خبر آئی کہ سردار چتر سنگھ بھی اپنی فوج کے ساتھ اٹک سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شیر سنگھ کے ساتھ مل کر پوری طاقت سے انگریزوں کا مقابلہ کیا جائے۔ لارڈ گف نے سوچا کہ اگر دونوں لشکر متحد ہو گئے تو انگریزوں کے لیے پنجاب سے جان بچا کر نکلنا مشکل ہو جائے گا، لہٰذا انہیں علیحدہ علیحدہ شکست دی جائے۔ جنرل تھیک ویل آگے بڑھا لیکن شیر سنگھ پہلو بچا کر جہلم کی طرف بھاگ گیا۔

چیلیانوالہ:

اب شیر سنگھ نے چیلیانوالہ کے آس پاس خندقیں کھود لیں۔ یہ جگہ قدرتی رکاوٹوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے ایک طرف کا راستہ دریائے جہلم اور ندی نالوں کی وجہ سے دشوار گزار تھا۔ دوسری جانب جنگل تھے۔ الغرض یہ علاقہ دفاعی اعتبار سے ناقابلِ تسخیر تھا۔ شیر سنگھ نے یہاں جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی لشکر 13 جنوری کو یہاں پہنچا۔ سکھوں نے اپنے آپ کو قدرتی ماحول میں چھپا رکھا تھا۔ ان کی یہ کوشش اس قدر کامیاب تھی کہ انگریز فوج کے ہراول دستوں کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ سکھوں کے مورچے کس طرف ہیں اور انہیں کہاں اپنا مستقر قائم کرنا چاہیے۔ لارڈ گف نے ادھر ادھر دیکھ بھال کر ایک ٹیکری پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے اس نے سکھ پوزیشنوں کا پتہ لگایا۔ سکھوں نے اپنی توپوں کو بھی

جھاڑیوں میں چھپا رکھا تھا۔

سکھوں کے ایک دستے نے اچانک بڑھ کر حملہ کر دیا۔ سکھ توپوں کا فائر اس مقام پر آ رہا تھا جہاں کمانڈر انچیف لارڈ گف دوسرے اعلیٰ انگریز افسروں کے ہمراہ موجود تھا۔ سکھ چونکہ بہتر دفاعی پوزیشن میں تھے، اس لیے انگریزوں کی نسبت ان کا نقصان کم ہوا۔ سکھوں نے اس جنگ میں ثابت کر دیا کہ وہ کسی لحاظ سے بھی انگریزوں سے کمتر نہیں ہیں۔ سکھوں نے اس شدت کی گولہ باری کی کہ انگریز توپچیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور انہیں میدان سے ہٹنا پڑا۔ سکھوں نے ان کی چھ توپیں بھی چھین لیں۔ اب انگریزوں نے برصغیر میں جتنی جنگیں لڑی تھیں، ان میں سے یہ سب سے زیادہ ہولناک اور خونیں معرکہ تھا۔ اس میں انگریزوں کے تیئیس افسروں سمیت چھ سو دو جوان ہلاک اور ایک ہزار چھ سو اکیاون زخمی ہوئے۔ ہلاک اور زخمی ہونے والوں میں کئی جنگوں کے آزمودہ کار افسر بھی تھے۔

رات کی تاریکی کی وجہ سے جنگ رک گئی۔ سکھ اپنی خندقوں میں واپس چلے گئے۔ انہوں نے اپنی فتح کا اعلان اکیس توپوں کی سلامی سے کیا۔ اس فتح کی خوشی میں اٹک کے قلعے میں بھی اکیس توپیں سر کی گئیں۔ اپنی کھوئی ہوئی آزادی اور اعتماد دوبارہ حاصل کرنے کے لیے سکھوں کی یہ آخری کوشش تھی۔ ان کی یہ کوشش کامیابی کے بہت قریب تھی، لیکن وہ انگریزوں کا مکمل قلع قمع نہ کر سکے، کیونکہ ان کی خوراک کا ذخیرہ خطرناک حد تک کم ہو گیا تھا۔ توپیں تھیں لیکن گولہ بارود نہیں تھا۔ اس جنگ کے بعد جن واقعات نے سکھوں کے حوصلوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں سے ایک یہ ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد تین دن تک موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ جس کی وجہ سے انگریزوں پر دوبارہ حملہ یا تعاقب نہ کر سکے۔ دوسرے یہ کہ اس جنگ کے بعد سکھوں کے مایہ ناز افسر جنرل الٰہی بخش نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ جنرل الٰہی بخش توپخانے کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد سکھ توپخانے کی آدھی اہلیت ختم ہو گئی۔ ان واقعات کی بناء پر سکھ اس فتح کے ثمرات سے کما حقہ بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔

برطانوی عوام اور وہاں کی حزبِ اختلاف کے سیاستدانوں نے ہندوستان کی فوجوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ انہوں نے لارڈ گف پر بھی سخت تنقید کی اور اسے نااہل قرار دیا، جس کی وجہ سے ملکہ وکٹوریہ نے لارڈ گف کو معزول کر کے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ سندھ اور بلوچستان کے فاتح سر چارلس جے نپیئر کو ہند میں برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔ پارلیمنٹ نے اس تقرر کا خیر مقدم کیا۔ لیکن سر چارلس نپیئر کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی لارڈ گف گجرات کی جنگ فتح کر چکا تھا۔ جس سے اس کے خلاف اٹھا ہوا نفرت کا طوفان رک گیا۔

گجرات:

راجا شیر سنگھ تقریباً ایک ماہ تک چیلیانوالہ میں قلعہ بند رہا۔ اسی اثناء میں جنرل وہش بھی ملتان کا معرکہ سر کر کے لارڈ گف کی فوج میں آ کر شامل ہو چکا تھا۔ اس کے آ جانے کے بعد راجا شیر سنگھ نے دریائے چناب عبور کر کے لاہور پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا، لیکن انگریز اس کے اس منصوبے کو بھانپ گئے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دستہ بھیج کر راستہ روک لیا۔ اب شیر سنگھ گجرات شہر اور دریائے چناب کے درمیان خیمہ زن ہو گیا۔ اس کا باپ سردار چتر سنگھ بھی اپنی ساری فوجی طاقت کے ساتھ آ گیا۔ اس وقت سکھ فوج کی تعداد باسٹھ ہزار تھی۔ اس کے پاس ساٹھ توپیں تھیں۔ لارڈ گف کی قیادت میں انگریز فوج کی تعداد پچیس ہزار تھی، جبکہ ان کے پاس ایک سو سے زائد توپیں تھیں۔ اس مہم میں انگریز اپنا بھاری توپخانہ بھی لے آئے۔ یہ توپیں اتنی بڑی تھیں کہ ان کو کئی ہاتھی کھینچتے تھے اور یہ پہلی بار استعمال ہو رہی تھیں۔

جنرل وہش نے حملہ شروع کیا۔ پہلے تو کچھ دن چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ پھر 21 فروری 1849ء کو علی الصبح لارڈ گف نے پوری طاقت سے گولہ باری شروع کی۔ سکھوں نے بھی بھرپور جواب دیا۔ اڑھائی گھنٹے تک طرفین کے توپخانے آگ اگلتے رہے۔ توپوں

کی اس جنگ میں انگریز کامیاب رہے۔ انہوں نے سکھوں کی متعدد توپوں کو تباہ کر دیا۔ جب سکھ توپخانے کی قوتِ مزاحمت ختم ہوگئی تو پیدل اور سوار دستے آگے بڑھے۔ بڑا خونریز معرکہ ہوا۔ دوپہر تک سکھوں کی بڑی تعداد میدان سے منہ موڑ چکی تھی۔ انگریزوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ سکھوں نے پنجاب میں دوبارہ اپنی خودمختار حکومت قائم کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ پریشان ہو کر رہ گیا۔ سکھ نہایت بدحواسی کے عالم میں بھاگے۔ ان کا بیشتر توپخانہ اور دوسرا ساز و سامان انگریزوں کے ہاتھ لگا۔ سکھ فوج مکمل طور پر منتشر ہوگئی۔ انگریزوں کا اس جنگ میں بہت کم نقصان ہوا۔

زوالِ پنجاب:

راجا شیر سنگھ کچھ دن اِدھر اُدھر پاؤں جمانے کی کوشش کرتا رہا، لیکن انگریز فوج کے مسلسل تعاقب کے باعث وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر 14 مارچ 1849ء کو ضلع راولپنڈی میں واقع ایک مقام مانکیالہ میں انگریز جنرل گلبرٹ کے سامنے حاضر ہوا اور وہاں پنجابی فوج کے ساتھ ہتھیار ڈال دیئے۔ سب سے پہلے راجا شیر سنگھ نے اپنی تلوار گلبرٹ کے حوالے کی۔ اس کے بعد دوسرے سردار آئے اور انہوں نے اپنی شکست کے اعتراف کے طور پر اپنے ہتھیار انگریزوں کے سپرد کر دیئے۔ ان سرداروں میں سے ایک بوڑھے سردار نے، جو کسی زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہمراہ مختلف مہمات میں دادِ شجاعت دے چکا تھا، انگریز جنرل کے سامنے اپنی تلوار سے دستبردار ہونے کے بعد کہا کہ "رنجیت سنگھ اج مویا اے"۔

پنجاب کا الحاق:

خالصہ افواج پر فتح پانے کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے فیصلہ کیا کہ اب مہاراجہ دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب کو ممالکِ محروسہ میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ 29 مارچ کو لاہور میں

ایک دربار منعقد ہوا۔ اس دربار میں کمسن مہاراجہ دلیپ سنگھ اور لارڈ ڈلہوزی برابر برابر تخت پر بیٹھے۔ مہاراجہ نے پنجاب کے تخت و تاج سے اپنی دستبرداری کی علامت کے طور پر مشہورِ عالم کوہِ نور ہیرا لارڈ ڈلہوزی کو پیش کیا، جو اس وقت ملکہ معظمہ کی نمائندگی کر رہا تھا۔ یہ رسم ادا کرنے کے بعد مہاراجہ کو تخت سے اتارا گیا۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ایک اعلان کیا جس میں پنجاب کو برطانوی سلطنت میں ضم کرنے کے عمل کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہم تو چاہتے تھے کہ پنجاب میں ایک مضبوط سکھ حکومت قائم ہو۔ اس سلسلے میں ہم نے مقدور بھر اپنا تعاون بھی پیش کیا، لیکن سکھوں نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، اور انہی کے رویے سے مجبور ہو کر ہم یہ اقدام کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

برطانوی حکام پنجاب کے زوال کی سازش میں شریک تھے۔ اپنے اس غیر آئینی اور غیر اخلاقی عمل پر خواہ کتنا ہی الفاظ کا ملمع چڑھائیں لیکن حقیقت چھپائے نہیں چھپتی۔ اصل صورت یہ ہے کہ 1846ء کے معاہدہ بھیروال کے تحت خود انگریز لاہور دربار اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حاکمیتِ اعلیٰ قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ لیکن جب ملتان میں بغاوت ہوئی تو انہیں نے اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں تساہل برتا۔ اس نکتے پر پہلے تفصیلی بحث کی جا چکی ہے کہ انگریز خود ایسے حالات پیدا کرنے میں مصروف رہے جن کی بدولت وہ پنجاب پر مکمل قبضہ جما سکیں۔ اس بغاوت میں مہاراجہ دلیپ سنگھ اور لاہور دربار کا کوئی دخل نہ تھا۔ ریجنسی کونسل کے تمام ارکان سوائے شیر سنگھ اٹاری والا کے، انگریزوں کے وفادار تھے۔ جب مہاراجہ ریجنسی کونسل اور دربار کا اس بغاوت میں کوئی دخل نہ تھا تو پھر کونسل توڑ کر مہاراجہ کو معزول کرنے کی کوئی آئینی اور اخلاقی وجہ نہیں تھی۔ ڈلہوزی نے جو کچھ کیا وہ معاہدہ بھیروال کی کھلی خلاف ورزی تھی، جس کی انگریز مدبر کوئی تاویل پیش نہیں کر سکتے۔

ڈلہوزی کے اس عمل پر اس زمانے کے بعض نامور انگریز افسروں نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ اسے ناجائز اور بلا جواز کارروائی سمجھتے تھے۔ ان لوگوں میں میجر ایڈورڈز قابلِ ذکر ہیں، جس نے ڈلہوزی اور اس کے ہمنوا دوسرے انگریزوں کے طرزِ عمل کا نہایت

محققانہ تجزیہ کیا ہے۔ یہ انگریز افسر میجر ایڈورز ملتان اور دوسرے متعدد معرکوں میں بذاتِ خود شریک رہا تھا، اور تمام حالات کا عینی شاہد تھا۔ اس نے دلیپ سنگھ کے ساتھ ڈلہوزی کی اس کارروائی کی مذمت کی ہے۔

دلیپ سنگھ اور سکھ امراء کا انجام:

انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جنگوں کے دوسرے سلسلے میں انگریز فیصلہ کن فتح سے ہمکنار ہوئے۔ انہوں نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب کو ممالکِ محروسہ میں شامل کر لیا۔

دلیپ سنگھ کی عمر الحاقِ پنجاب کے وقت صرف دس سال تھی۔ انگریزوں نے اسے وظیفہ دے کر پنجاب سے باہر بھیج دیا۔ اسے فتح گڑھ (یو۔ پی) میں ٹھہرایا۔ لارڈ ڈلہوزی نے اپنے ایک خاص آدمی ڈاکٹر لوگن کو اس کا اتالیق مقرر کیا، جو اسے انگریزی زبان و معاشرت اور عیسائی مذہب کی تعلیم دیتا تھا۔ دلیپ سنگھ کی اپنے مذہب کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، لہٰذا صرف چند مہینے کی تعلیم و تربیت کے بعد اس نے عیسائیت اختیار کر لی۔ جب یہ خبر لارڈ ڈلہوزی تک پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا۔ دلیپ سنگھ کا اپنا آبائی مسلک ترک کرنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ واقعہ زبردست سیاسی مضمرات کا حامل ہے۔ لارڈ ڈلہوزی کے لیے یہ ایک بہت بڑی خوشخبری تھی، کیونکہ دلیپ سنگھ نے اپنی حیثیت تبدیل کر کے اس متوقع تحریک کے امکانات ہی کو ختم کر دیا، جو مستقبل میں سکھ پنجاب کی آزادی اور دلیپ سنگھ کے تخت کی بحالی کے لیے شروع کر سکتے تھے۔ گویا سکھوں کے رہنما کی حیثیت سے دلیپ سنگھ کا کردار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ یعنی اب سکھ قوم کس کے لیے جدوجہد کرتی؟ دلیپ سنگھ نے پنجابی تہذیب و ثقافت بھی چھوڑ دی۔ اس نے دیسی لباس کی بجائے انگریزی لباس پہننا شروع کر دیا۔ اس کی ان تمام حرکتوں سے انگریزوں کو بے پناہ فائدہ ہوا اور سکھوں کو بہت زیادہ نقصان ہوا۔

اس وقت تک دلیپ سنگھ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاندان میں مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ تمام سکھ اسی کو رنجیت سنگھ کا جانشین سمجھتے ہوئے اس کا احترام کرتے تھے، لیکن دلیپ سنگھ کے عیسائی ہو جانے کے بعد سکھوں کی نظروں میں اس کا وقار ختم ہو گیا۔ چنانچہ اب سکھوں نے ایک ایسی شخصیت کی تلاش شروع کی جسے اپنا قائد بنا کر وہ انگریزوں کے خلاف اپنی تحریکِ آزادی جاری رکھ سکیں، مگر رنجیت سنگھ کے خاندان کے تمام افراد خانہ جنگیوں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ صرف ایک بچہ زندہ تھا، جس کا رنجیت سنگھ سے مسلمہ طور پر براہِ راست تعلق تھا۔ یہ بچہ مہاراجہ شیر سنگھ کا لڑکا شیو دیو سنگھ تھا۔ اس کی ماں کی شدید خواہش تھی کہ میرا لڑکا بادشاہ بنے۔ انگریز بھی اس صورتِ حال سے بے خبر تھے۔ جب دلیپ سنگھ نے نیا طرزِ حیات اپنایا تو انگریزوں کو اپنا مطلب نکالنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے یہ بہانہ کرتے ہوئے کہ دلیپ سنگھ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے، جو اس کے خاندان ہی سے تعلق رکھتا ہو، تا کہ دلیپ سنگھ تنہائی محسوس نہ کرے۔ یہ کہہ کے انہوں نے شیو دیو سنگھ کو بھی دلیپ سنگھ کے ساتھ ایک طرح سے نظر بند کر دیا۔ اس سے انگریزوں کو دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو یہ کو شیو دیو سنگھ کے عوام میں رہنے سے جو خطرات پیدا ہو سکتے تھے ان کا سدِ باب ہو گیا اور دوسرا یہ کہ اسے دلیپ سنگھ کے ہمراہ رکھا گیا جو پہلے ہی عیسائی ہو چکا تھا۔ ہر وقت اس کے پاس رہنے سے شیو دیو سنگھ اوّل تو عیسائی ہو جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو کم از کم اس میں سے سکھوں کے خصائل ختم ہو جائیں گے۔ یعنی اگر وہ عیسائی نہیں بنے گا تو سکھ بھی نہیں رہے گا۔ اس طرح انگریزوں نے پنجاب میں اپنے مستقبل کی تعمیر طے شدہ منصوبے کے مطابق مستحکم بنیادوں پر شروع کی اور اس میں وہ سو فیصدی کامیاب بھی رہے اور پنجاب جلد ہی اپنے ساتھ انگریزوں کے برے سلوک کو فراموش کر کے سلطنتِ عظمیٰ برطانیہ کا بازوئے شمشیر زن بن گیا۔

دلیپ سنگھ کچھ عرصہ تو ہندوستان میں رہا پھر وہ انگلستان چلا گیا۔ حکومت نے اس کے لیے چار لاکھ پونڈ پنشن مقرر کی۔ علاوہ ازیں اسے سفالک میں ایک بڑی جاگیر بھی دی گئی۔

جہاں وہ بڑے آرام وآسائش سے زندگی گزارنے لگا۔ ملکہ وکٹوریہ اس سے بہت شفقت سے پیش آتی تھی۔ دلیپ سنگھ کو اکثر بکنگھم پیلس میں مدعو کیا جاتا تھا۔ اس دوران میں اس نے حکومت سے درخواست کی کہ ''میری ماں رانی جنداں کو بھی میرے ساتھ برطانیہ میں رہنے کی اجازت دی جائے۔'' حکومت نے یہ درخواست منظور کر لی۔ چنانچہ دلیپ سنگھ 1861ء میں ہندوستان آیا اور رانی جنداں کو اپنے ہمراہ لے گیا، لیکن رانی کو برطانیہ میں زیادہ عرصہ رہنا نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ وہاں جانے کے دو سال بعد فوت ہوگئی۔ دلیپ سنگھ اپنی ماں کی راکھ کو دریائے گنگا میں بہانے کے لیے پھر ہندوستان آیا اور فوراً واپس چلا گیا۔

اس دوسرے سفر میں جب وہ مصر پہنچا تو اس کی ملاقات ایک لڑکی بمبا ملر سے ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے اسکندریہ میں شادی کر لی۔ جب وہ واپس انگلستان گئے، تو انہوں نے شاہانہ روش اختیار کرتے ہوئے اپنی آمدنی کے مقابلے میں اخراجات کو بہت بڑھا لیا، جس کی وجہ سے ان کی مالی حالت خراب ہونے لگی۔

عمر کے آخری حصے میں دلیپ سنگھ کا یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ انگریزوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس خیال کے تحت اس نے ہندوستان میں بعض سکھ اکابرین سے خط وکتابت بھی کی وہ عوام میں اس کے لیے فضا ہموار کریں۔ تاکہ پنجاب میں دوبارہ سکھ ریاست قائم کی جائے، لیکن یہاں سے اسے کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ اس پر بھی اس نے اپنا خیال ترک نہ کیا اور برطانیہ سے ہندوستان کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ہندوستان کی حکومت نے اسے ملک میں داخل نہ ہونے دیا، کیونکہ اس نے دھمکی دی تھی کہ میں ہندوستان پہنچ کر اپنا تخت وتاج حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اسے واپس عدن بھیج دیا گیا۔ وہاں سے دلیپ سنگھ ترکی کے علاوہ یورپ کے کئی ملکوں میں گیا۔ اس نے ان حکومتوں کو اپنی بپتا سنائی اور ان سے مدد کی درخواست کی، لیکن اسے کہیں سے بھی مثبت جواب نہ ملا۔ یہ اس کے لیے ایک انتہائی تلخ تجربہ تھا، لیکن اپنی بات رکھنے کے لیے اس نے پنجاب کی جلاوطن حکومت قائم کی۔ وہ خود اس حکومت کا سربراہ تھا۔ اس نے ایک سندھیانوالہ سردار کو

اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ محض انگریزوں کو پریشان کرنے کے لیے اس نے اس عزم کا اظہار کیا کہ میں پنجاب کو آزاد کرانے کے لیے ہندوستان پر شمال مغربی سرحد سے حملہ کروں گا۔ لیکن پنجاب کے عوام اور انگریز حکومت نے اس کی بات کو مذاق میں ٹال دیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کو دلیپ سنگھ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی سکت نہیں رکھتا۔ جب دلیپ سنگھ حالات سے بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے برطانوی حکومت سے معافی مانگ لی، جو اسے مل گئی اور وہ پھر انگلستان میں رہنے لگا۔ بالآخر ایک نہایت مایوس کن اور پر الم زندگی گزارنے کے بعد مہاراجہ دلیپ سنگھ 23 اکتوبر 1893ء کو پیرس کے ایک ہوٹل میں مر گیا۔

مہاراجہ دلیپ سنگھ کے حالات بتانے کے بعد ہم ان سرکردہ افراد کا مختصراً ذکر کریں گے جنہوں نے انگریزوں اور سکھوں کی دوسری جنگ میں مختلف کردار ادا کیے۔

رانی جنداں کو انگریزوں نے جولائی 1848ء میں شیخوپورہ سے بنارس لے جا کر قید کر دیا۔ انگریزوں نے اس کے تمام زیورات جن میں بیش قیمت ہیرے بھی تھے، اس سے چھین لیے قبل ازیں اسے جو پنشن ملتی تھی اس میں بھی کافی کمی کر دی، جس کے باعث اس کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ ان حالات سے تنگ آ کر اس نے فرار کا منصوبہ بنایا۔ وہ 8 اپریل کو قید خانے سے نکل بھاگی اور حفاظتی پولیس کی نظروں سے بچتی بچاتی کھٹمنڈو (نیپال) جا پہنچی۔ اس نے وہاں کے گورکھوں کو یہ لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی کہ پنجاب فتح کرنے کے بعد تم جو چاہے وہاں سے لوٹ لینا، لیکن اسے بھی اس سلسلے میں شدید مایوسی و ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہاں سے اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تو اس نے انگریز حکومت سے اپنے رویے پر اظہارِ ندامت و معذرت کیا۔ انگریزوں نے اسے پھر سے ملک میں آنے کی اجازت دے دی اور اس کا وظیفہ بحال کر دیا۔ 1861ء میں وہ دلیپ سنگھ کے ساتھ برطانیہ چلی گئی اور وہیں دو سال بعد اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئی۔

دیوان مولراج پر مقدمہ چلایا گیا جس کی تفصیل پہلے آ چکی ہے، اور سردار کاہن سنگھ

جسے انگریزوں نے ملتان کا گورنر نامزد کر کے بھیجا تھا، کو ہنگامے کے وقت مولراج کے آدمیوں نے گرفتار کر کے ملتان کے قلعے میں قید کر دیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک لڑکا بھی تھا۔ 30 دسمبر کو جب انگریزوں کی گولہ باری کی وجہ سے قلعے کا مین گیٹ تباہ ہو گیا تو بہت سے آدمی ہلاک ہوئے ان میں سردار کاہن سنگھ اور اس کا لڑکا بھی شامل تھے۔

سردار چتر سنگھ اور اس کے لڑکے راجا شیر سنگھ کو لاہور کے قریب ان کے گاؤں اٹاری میں نظر بند کر دیا گیا۔

باقی لوگ تو پکڑے گئے، لیکن بھائی مہاراج سنگھ، کرنل رچپال سنگھ اور سردار نرائن سنگھ وغیرہ ادھر ادھر روپوش ہو گئے اور انہوں نے پنجاب کی آزادی کے لیے پھر سے جدوجہد شروع کر دی۔ بالآخر بھائی مہاراج سنگھ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے اسے جالندھر جیل میں رکھا گیا، لیکن پھر اس خیال کے پیشِ نظر کہ پنجاب میں اس کی موجودگی سکھوں کے جذبات میں اشتعال کا باعث ہو گی، اسے سنگاپور منتقل کر دیا گیا۔ جہاں اس پر مقدمہ چلا اور وہیں وہ 5 جولائی 1856ء کو قیدِ تنہائی میں مر گیا۔

یوں انگریزوں نے پنجاب میں اپنے مخالف عناصر کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔
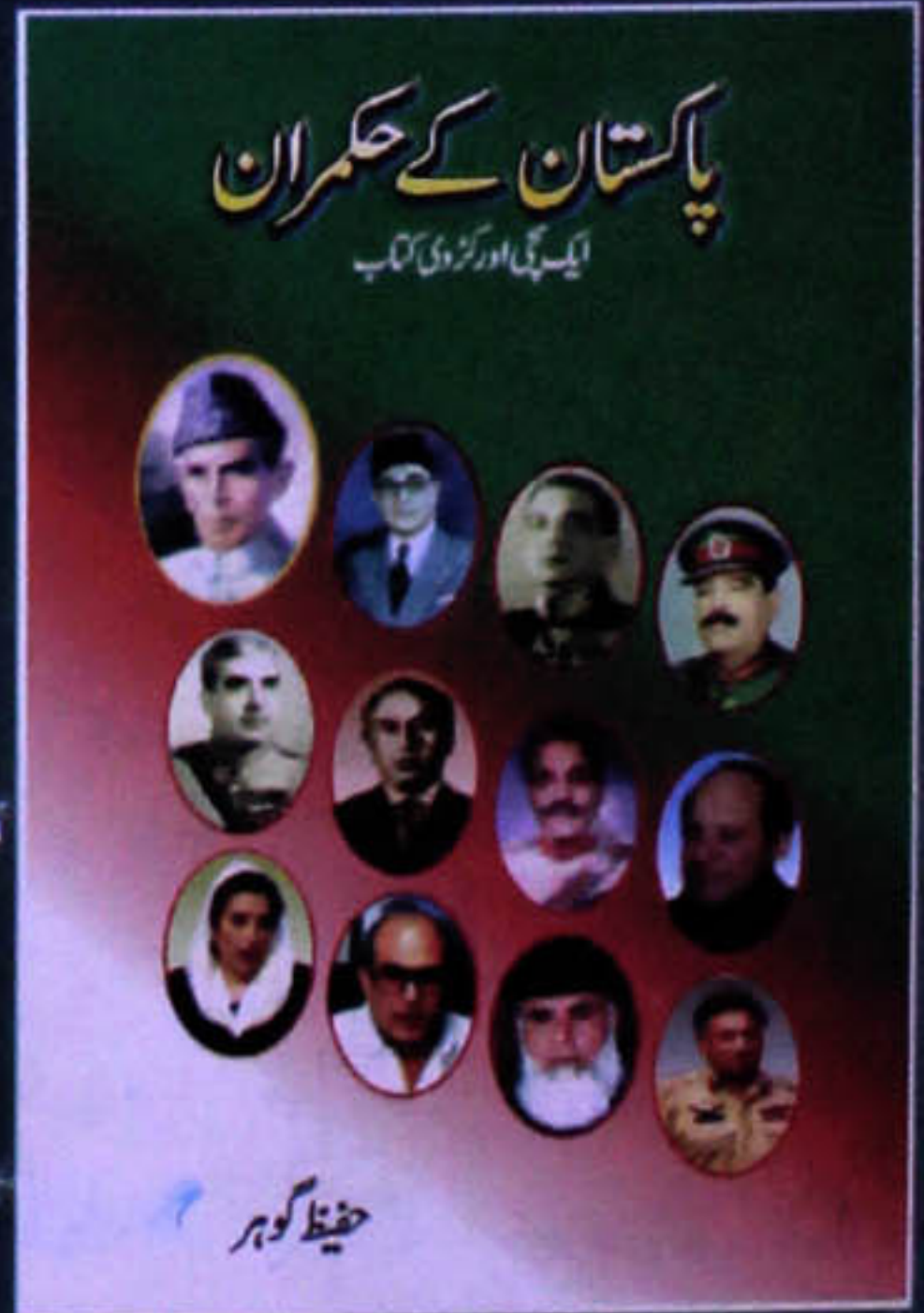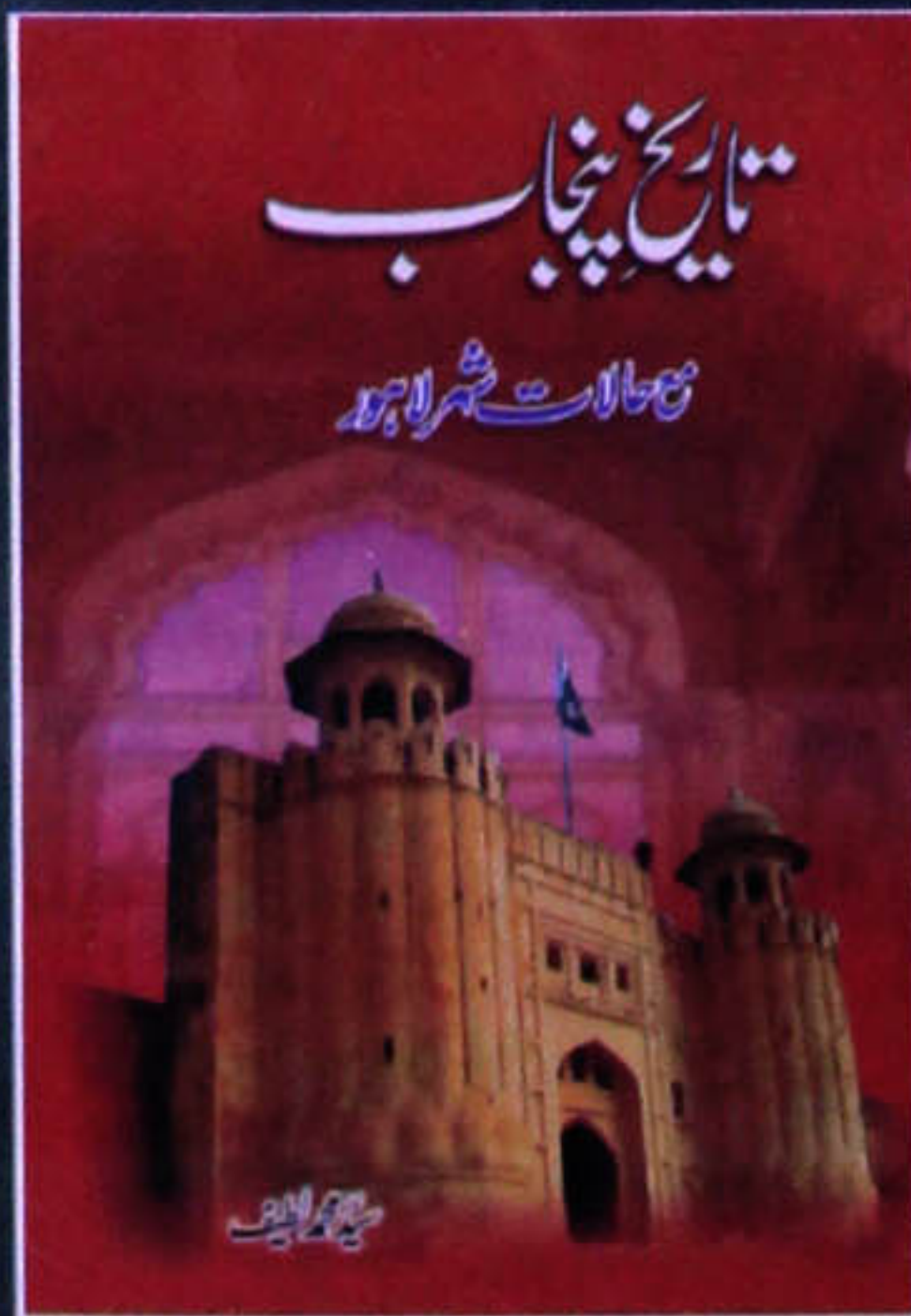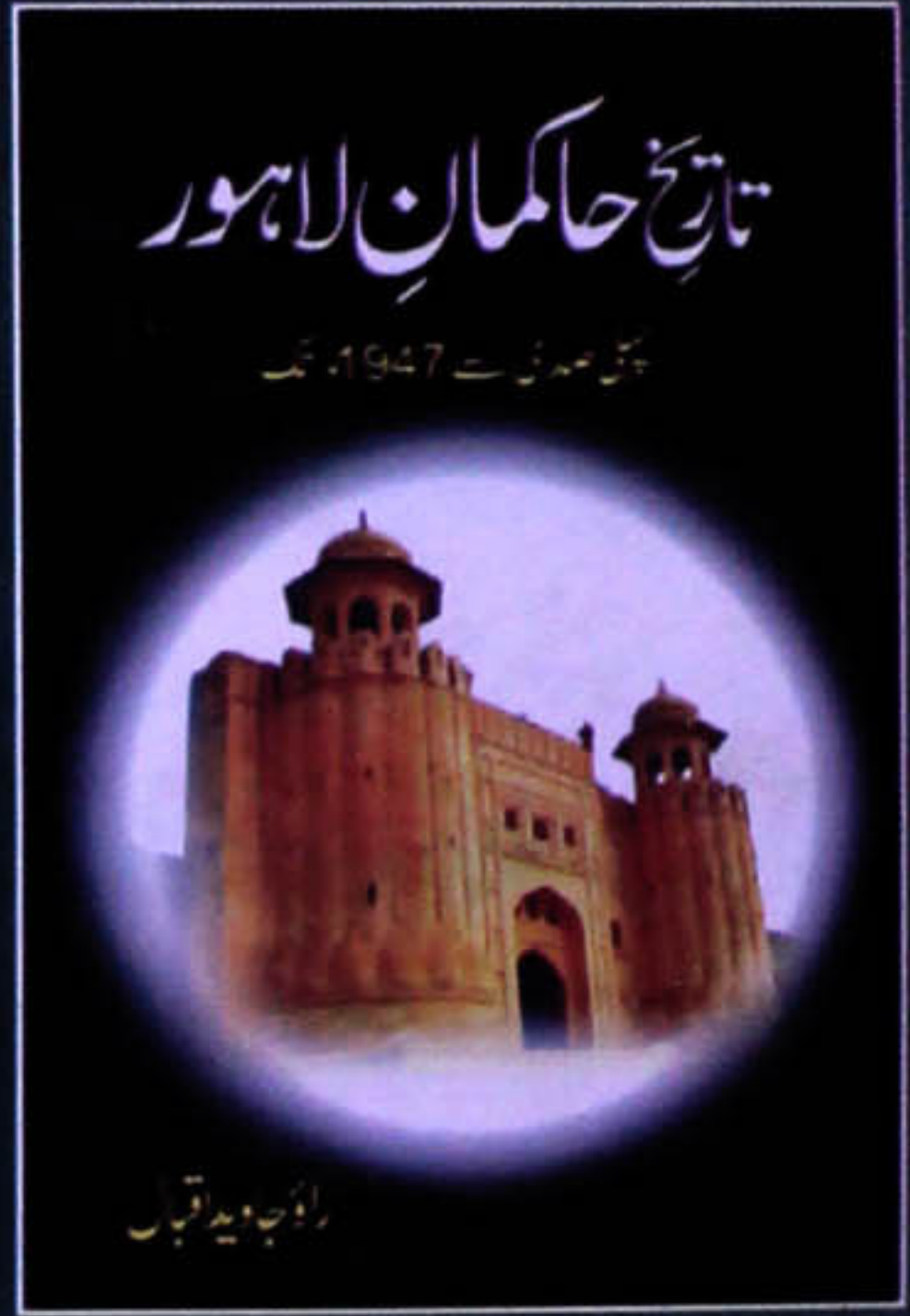
OOO

سید پلازہ فسٹ فلور A-3، چیٹر جی روڈ، اردو بازار لاہور

فون: 042-37350675 موبائل: 0345-4327063